ماہ و روز

روزنامچۂ سفرِ روس

حکیم محمد سعید

ماہ و روز

روزنامچۂ سفرِ روس

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

حکیم محمد سعید

ہمدرد اکیڈمی، پاکستان

مولف : حکیم محمد سعید

ناشر : ہمدرد اکیڈمی
ہمدرد فاؤنڈیشن، پاکستان
کراچی - ۱۸

طابع : ٹیکنیکل پرنٹرز۔ کراچی - ۱

سن اشاعت : اپریل ۱۹۸۰ء

پہلا ایڈیشن : دو ہزار

قیمت : مبلغ پینتیس روپے

نوجوانان اسلام کے نام

کبھی اے نوجوان مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد ہے کہ حکمت مومن کی متاع گم شدہ ہے، وہ جہاں بھی ملے اس کو لے لینا چاہئے۔ ہمارے عظیم اسلاف کا شعار بھی یہی رہا ہے کہ وہ ہر اچھی بات کو اخذ و قبول کر لیتے تھے اور ہر اس بات کو چھوڑ دیتے تھے، جو ہمارے اصولوں سے ٹکراتی ہو۔

"خذ ما صفا و دع ما کدر" ان کا اصول تھا۔

ہمارے نوجوانوں کو بھی پوری وسعت قلب اور کشادگی ذہن مگر احتیاط کے ساتھ اپنے دور کا اور اس میں کارفرما مختلف و متضاد قوتوں کا مطالعہ و تجزیہ کرنا چاہئے اور اپنے ملک کے لیئے متوازن راہ نکالنی چاہئے۔

عالم اسلام کا مستقبل نوجوانان اسلام ہی سے وابستہ ہے۔

حکیم محمد سعید

عنوانات

—:o:—

غلط نامہ

صفحہ نمبر	سطر	غلط	صحیح
۲۶۳	۲۰	''روس نامہ''	''ماہ و روز''
۲۷۲	۲	مسعود	مسرور
۲۹۶	۲۰	''روس نامہ''	''ماہ و روز''
۳۲۰	۸	زندکی	زندگی
۳۲۲	۵	طے	تہ
۳۲۳	۱۷	تک	بھی

تاریخ و جغرافیۂ روس

روس کا سفر میں نے دو بار کیا ہے۔ پہلا ۱۹۷۰ء میں کہ جب وہاں حضرت امیر خسرو دہلوی اور فارابی پر ماسکو اور الماعطا میں عالمی اجتماعات تھے۔ اس کا اجمالی ذکر اس سفر نامے میں آگیا ہے۔ دوسرا سفر روس بہ سلسلۂ ''کنگرس عالمی صدرالدین عینی'' ۱۴ اپریل ۱۹۷۸ء تا ۲۳ اپریل ۱۹۷۸ء جاری رہا۔ درحقیقت ''ماہ و روز'' اسی سفر سے متعلق تاثرات پر مشتمل ہے، گو درمیان میں ضرورتاً اور اضطراراً ۱۹۷۰ء کے سفر کے تاثرات بھی آگئے ہیں۔

''ماہ و روز'' پر جب میں نے طباعت کے بعد ایک نظر ڈالی تو ایک ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ جس ملک کے سفر کے یہ تاثرات ہیں مختصراً اس کے تاریخی اور جغرافیائی حالات بھی شریک صفحات کردیئے جائیں تو مناسب ہے۔

روس کا نام لیتے ہی ایک ایسی سرزمین کا نقشہ ذہن میں آتا ہے جو انیسویں صدی عیسوی سے یونین آف سوویت سوشلسٹ ری پبلک (مختصراً یو ایس ایس آر) اور پھر محض سوویت یونین کہلانے لگی ہے۔ اس کی قدیم تاریخ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز بھی ہے کیونکہ یہ ایک مملکت نہیں، کئی مملکتوں کا مجموعہ ہے۔ زمانۂ تاریخ سے پہلے کی بات ہے کہ ہند یورپی اور کوہ یورال الطائی کی قومیں نقل سکونت کرکے یہاں آئیں اور کچھ عرصے خانہ بدوش رہ کر مستقل طور پر آباد ہوگئیں۔ یہ دو ہزار سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ ان کی نسلی حیثیت کا کوئی علم نہیں اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا شغل یا آبائی پیشہ کیا تھا۔ پھر ذرا بعد کے زمانے میں یونانی، رومی اور ایرانی نسل کے کچھ باشندے اس علاقے میں آکر آباد ہوئے جو اب یوکرین کہلاتا ہے۔ اس وقت تجارت کرنے والی بعض سلطنتوں

نے اس علاقے کے شمالی جنگلات کا استحصال کیا ، خاص طور سے ان علاقوں کا جو دریائے وولگا سے ملحق تھے لیکن یہ تعلقات زیادہ عرصے تک اثر انداز نہ ہوسکے ۔

چوتھی اور نویں صدی عیسوی کے درمیان ھن ، آوار ، گوتھی اور میگیار نامی قومیں ان علاقوں سے گزریں لیکن ان کا تسلط بھی عارضی رہا ۔ مشرقی سلافی علاقے کے باشندے بھی کوئی دیرینہ اثر نہ ڈال سکے کیونکہ وہ بھی جم کر کسی ایک جگہ رہنا نہیں چاہتے تھے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ھے کہ ترک وطن کر کے آنے والوں میں سے سو فیصد افراد گزرتے چلے گئے ۔ ان میں سے کچھ نے وھیں ڈیرے ڈال دئے اور اس سرزمین کو اپنا ھی وطن سمجھنے لگے ۔ یہ بھی حقیقت ھے کہ ان سب کی آمد سے قبل کچھ لوگ یہاں آچکے تھے اور زیادہ تر مغربی علاقے میں آباد تھے ۔ انہوں نے نئے آبادکاروں کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ آپس میں شیر و شکر ہوگئے ۔ باھمی میل جول نے جو نئی نسل پیدا کی ، اسی کو روسی کہا جانے لگا ۔ ماھرین لسانیات اس منزل میں خاموش ھیں کہ اس سرزمین کو روس اور یہاں کے باشندہ کو روسی کیوں کہا جاتا ھے ۔ محض روایتی طور پر قیاس آرائی کی گئی ھے کہ آنے والوں میں سے ایک گروہ کا سردار " رورک "، کہلاتا تھا ۔ وہ ۸۶۲ء میں اس جگہ آباد ہوا جو اب " نووگورود "، کہلاتا ھے ۔ شاید اسی کے نام کی رعایت سے اس سرزمین کا نام روس ہوا ھے ۔ لیکن یہ رائے بعید از قیاس کہی جاسکتی ھے ۔

ھر آبادی کا ایک سربراہ ھوتا تھا جسے سردار کہا جاسکتا ھے ۔ تاھم ساتویں صدی عیسوی میں ترکی سے آئے ھوئے خازار قبیلے کے افراد نے جنوبی حصۂ ملک میں ایک طاقتور سلطنت قائم کی اور پھر اگلی صدی میں مشرقی بلغاریہ سے آئے ھوئے لوگ اپنی الگ حکومت قائم کرکے رھنے لگے ۔ نویں صدی میں مشرقی حصے کے سلافی ، جنہیں بعض مورخین کے نزدیک روسیوں کے اجداد میں شمار کیا جاسکتا ھے ، یوکرین (چھوٹے روس) کے شمالی حصے میں اور بائیلورشیا (سفید روس) والے علاقوں میں قدم

جمانے کے ساتھ ساتھ سلطنت کی داغ بیل ڈال دی رہنے لگے۔ تاہم عظیم سلطنت روس کا تصور اس وقت پیدا ہوا کہ جب اسی صدی کے دوران میں اسکنڈے نیویا کے تاجر اور سورما یہاں آئے اور منظم ہوکر حکومت کرنے لگے۔

دسویں صدی عیسوی میں نصرانی مذہب کو فروغ حاصل ہوا۔ فرمانروا آئیگور کی شریک حیات سنٹ اولگا اس تحریک کی روح رواں تھی۔ پھر ۹۸۰ء سے ۱۰۱۵ء تک حکومت کرنے والے شاہ ولادیمر اول نے اسے سرکاری مذہب کی حیثیت سے اختیار کرلیا۔ اس طرح بازنطینی ثقافت اپنا رنگ جمانے لگی۔ اس کے بعد یاروسلاف عاقل کی حکومت ۱۰۱۸ء سے ۱۰۵۴ء تک قائم رہی جس نے خیوا کو اپنا صدر مقام بنایا۔ تاہم اس علاقے کی خوشحالی دلادیمر دوم (۱۱۱۳ء تا ۱۱۲۵ء) اور مستی سلاف (۱۱۲۵ء تا ۱۱۳۲ء) کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ بیشتر لوگ زراعت اور باغبانی میں مصروف رہے تاہم سمور، چرم، شہد اور موم کو بھی تجارتی اشیا میں شامل کرنا پڑا اور پھر یہ لوگ غلاموں کی تجارت بھی کرنے لگے۔ وہ بہت ہی نفع بخش پیشہ بن گیا۔

طویل جدوجہد کے بعد شہزادہ یوری ڈولگوروکی خیوا کا نواب بن گیا۔ اس کا بیٹا آندرے گولیسکی ریاست کا وارث بنا جس نے ولادیمر نامی شہر کو اپنی ریاست کا صدر مقام بنا لیا۔ بڑا حملہ ۱۲۳۷ء میں ہوا کہ جب منگولوں نے جن کو عام طور پر تاتاری کہا جاتا تھا، اپنے سردار باتو خاں کے زیر کمان یلغار کی اور ملک کے تمام شہروں کو برباد کر کے صرف نووگورود کو تباہ نہیں کیا۔ جنوبی اور مشرقی روس میں انہوں نے اپنی سلطنت قائم کرلی جو ۱۴۸۰ء تک برقرار رہی۔ مغربی حصۂ روس میں لتھوآنیا کے فرمانروا نے اپنا رنگ جمایا۔ اس نے تمام بائیلورشیا اور یوکرین کا بڑا حصہ ھتھیا لیا۔ آئیور اول کے عہد میں ماسکو کا علاقہ عروج پر آیا۔ اگرچہ یہ فرمانروا تاتار کے تاجداروں کو خراج ادا کرتا تھا لیکن اپنے آپ کو خود مختار فرمانروا سمجھتا تھا۔

بہت عرصے بعد ۱۵۳۳ء میں آئیوان چہارم سریر آرائے سلطنت

ہوا ۔ اس نے سب سے پہلے اپنے آپ کو زار روس کہلوایا ۔ اس نے کازان اور استرا خان کی ریاستیں فتح کرلیں اور اپنی سلطنت کو پھیلا دیا ۔ ۱۵۸۲ء میں قازق یرماک نے سبر کی ریاست روسی علاقے میں ملا لی اور پھر قازق بڑھ کر سائبیریا تک پہنچ گئے ۔ اٹھارھویں صدی کے شروع میں قازق افواج بحرالکاہل کے ساحل تک پہنچ گئیں ۔ اس طرح کریمیا کے تاتاریوں سے اپنی سرحدوں کو محفوظ کرلیا ۔ اندرون ملک بعض سرداروں نے ہنگامہ آرائی کی تو ان کو کچل کر رکھ دیا ۔ ۱۶۰۵ء میں اس کا انتقال ہوگیا ۔ اس وقت پولینڈ کے سگسمند سوم نے یہ علاقے فتح کرلینے کی کوشش کی بلکہ ماسکو پر قبضہ بھی کرلیا ۔ تاہم ۱۶۱۲ء میں شہزادہ پوژارسکی کے زیر کمان عوامی فوج نے بیرونی حملہ آوروں کو مار بھگایا ۔ اس نے مقبول عام اسمبلی کی بنیاد رکھی جس نے میکائیل رومانوف کو زار روس کے منصب پر فائز کردیا ۔ اس طرح خانوادہ رومانوف کی داغ بیل پڑی ۔ اس کی حکومت ۱۹۱۷ء تک قائم رہی ۔

روس میں ۱۶۴۵ء سے ۱۶۷۶ء تک زار الیکسی نامی فرمانروا کا عہد بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اس زمانے میں جدید وضع کی روسی حکومت قائم ہوئی ۔ اس نے پولینڈ سے مشرقی یوکرین کا علاقہ واپس لے لیا ۔ اگرچہ ثقافتی اور نظریاتی اعتبار سے لوگ عہد وسطیٰ کے علمبردار تھے تاہم یورپ کی جمعیت اقوام میں اسے ایک نمایاں مقام حاصل ہوگیا ۔ اقتصادی حالت تو مغربی یورپ سے صدیوں پیچھے رہی لیکن سیاسی سطح پر اس کا درجہ بلند ہوگیا ۔ پیٹر اول نے جسے پیٹر اعظم بھی کہا جاتا ہے ، سیاسی اعتبار سے روس میں ایک انقلاب رونما کردیا ۔ بہت سی اصلاحات کے ذریعے اسے یورپ کی ترقی یافتہ اقوام کے برابر کردیا ۔ اس نے بحری افواج کی داغ بیل ڈالی اور بری فوج کو جدید سامان حرب سے لیس کردیا ۔ لیکن اس کے ساتھ ھی مذہبی تصورات کو مٹانے کے لیے اس نے کلیسا کے نظام کو شہنشاہ کے زیرنگیں کردیا ۔ اس نے انتظامی اور مالیاتی قاعدے بھی تبدیل کئے اور ملک میں مختلف صنعتوں کو اتنی ترقی دی کہ عوام کی مالی حالت سدھر گئی ۔ تعلیمی

معیار بھی بلند ہوگیا ۔ اس نے ایک نئے علاقے کو اپنا صدر مقام بنایا جس کا نام پیٹرز برگ رکھا جو اب لینن گراد کہلاتا ہے ۔ اس نے بحیرۂ اسود تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اپنی فوج دھکیلنی شروع کی اور آزوف ھتھیا لیا ۔ دوسری طرف اس نے آبنائے بیرنگ کے ذریعے ایلاسکا تک رسائی حاصل کی اور جلدی ھی اپنی نوآبادی وھاں قائم کردی ۔

دو صدیوں تک روسی اور ترکی فوجوں میں معرکہ آرائی رھی ۔ زیادہ نقصان سلطنت عثمانیہ کو پہنچا ۔ اس طرح روس کو یورپ کے معاملات کو سمجھنے اور ان میں دخل دینے کا موقع ملا اور وہ ایک عظیم طاقت بن گیا ۔ پھر ھفت سالہ جنگ میں ملکہ الزبتھ نے بڑی کامیابی کے ساتھ پروشیا کے خلاف روس کی حمایت کی لیکن پیٹر سوم تخت نشین ھوا تو اس نے اپنا دامن لڑائی سے چھڑا لیا ۔ ۱۷۶۳ء میں اچانک اس کی وفات ھوگئی ۔ اس کی ملکہ نے کیتھرین دوم کے نام سے سلطنت کے اختیارات سنبھال لیے ۔ اس ملکہ کی انتظامی اصلاحات بھی بڑی معرکہ آرا رھیں ۔ روس کو ترقی ھوتی گئی ۔ تاھم ملک کی خود سری اور مطلق العنانی نے ادیبوں ، شاعروں اور سائنسدانوں کو ناراض کردیا ۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں لوگوں نے باغیانہ سرکشی کے مظاھرے کئے جن کے باعث معاشرتی اصلاحات جن کا سلسلہ ھنوز جاری تھا ، خاک میں مل گئیں اور جب فرانسیسی انقلاب کے سلسلے میں لڑائی شروع ھوئی تو روس بھی اس میں ملوث ھوگیا جو غیردانش مندانہ قدم تھا ۔ فرانس سے صلح تو ھوگئی مگر زبردست نقصان پہنچا ۔ اس کے برعکس ترکی اور ایران سے لڑائی چھڑنے پر روس کو فائدہ ھوا ۔ معاھدۂ بخارسٹ کے ذریعہ اس نے بیس اربیا اور معاھدۂ گلستان کے ذریعہ کا کیشیا (قاف) کے علاقے حاصل کرلئے ۔

۱۸۱۲ء میں نپولین نے روس کے خلاف معرکہ آرائی کی اور ماسکو تک اس کی فوجیں بڑھ گئیں ۔ اس سال موسم سرما کی بے پناہ شدت نے اس کی فوج کا برا حال کردیا اور اسے سخت ھزیمت کے ساتھ پسپا ھونا پڑا ۔ نپولین کے زوال نے روس اور آسٹریا کو نئے

سرے سے ابھرنے کا موقع دیا ۔ ایک بار پھر براعظم کی بڑی طاقتوں میں ان کا شمار ہونے لگا ۔ اب روس میں نکولس اول کی حکومت تھی ۔ اس نے یورپ کے لیے سراغرسانی کے فرائض انجام دینے شروع کئے ۔ یہ حکمت عملی مناسب نہیں تھی ۔ سلطنت عثمانیہ کے ضمن میں روس اور مغربی طاقتوں کے مفادات پر نزاع ہوگیا جس کے نتیجے میں جنگ کریمیا چھڑی ۔ اس وقت روس کی اندرونی طاقت کا بھرم جاتا رہا ، کیونکہ اس میں کھوکھلا پن شروع ہوگیا تھا ۔

۱۸۵۵ء میں فراخدل فرمانروا الیکزنڈر دوم برسراقتدار آیا ۔ اس نے مزدور طبقے کے افراد کو مراعات دینی چاھیں لیکن حزب اختلاف نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ الیکزنڈر سوم نے صلح جوئی کی حکمت عملی مناسب سمجھی لیکن اسے جلد معزول کردیا گیا ۔ اس کے بعد روس کا آخری شہنشاہ نکولس دوم تخت نشین ہوا ۔ بعض ھنگامہ آرا جماعتوں نے اس پر غلبہ حاصل کرلیا ۔ نتیجہ ظاھر ھے ۔ بہت جلد ۱۹۰۵ء میں روسی انقلاب رونما ھوا جس نے ملک میں شہنشاھیت کو ھمیشہ کے لئے دفن کردیا ۔ اس انقلاب کے روح رواں لینن تھے جن کو ملک کے بیشتر افراد خدائے روس کے نام سے یاد کرتے ھیں ۔

روس پر ایک قابل اعتماد تصنیف جان گنتھر کی ھے جنھوں نے ۱۹۵۶ء میں روس کا سفر کیا تھا ۔ بہت سی پابندیوں کے باوجود انھوں نے دلچسپ حقائق اور اعداد و شمار جمع کئے ۔ ان کے بیان کے مطابق ۱۹۳۹ء کے بعد یکم اپریل ۱۹۵۶ء کو مردم شماری ھوئی تو ملک کی کل آبادی ۲۰ کروڑ ۲ لاکھ تھی۔ اس میں ۱۱ کروڑ ۷۰ لاکھ مزدور اور ۸ کروڑ ۳۰ لاکھ کاشتکار تھے۔ عقائد کے لحاظ سے مسلمانوں کی تعداد ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ تھی اور یہودی بھی اتنے ھی تھے ۔ ان کی رائے میں مسلمانوں کی طاقت وھاں دنیا بھر کے اسلامی ملکوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ استوار تھی ۔ وھاں کے مسلمان مصر ، دنیائے عرب اور مشرقی وسطیٰ سے شائع ھونے والی تمام ادبی اور مذھبی کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ کرلیتے تھے ۔ قرآن پاک کے متعدد ترجمے مل سکتے تھے۔

مسلمان شراب نوشی سے احتراز کرتے تھے - عام مسلمان دنیا بھر کے مسلمانوں سے ثقافتی رشتے قائم کرنے کے لیے بے چین نظر آتے تھے - مسلمان خواتین برقع پوش ہوکر باہر نکلتی تھیں - اس وقت تاشقند میں دس مسجدیں تھیں - ایک مسجد میں ، جسے جان گنتھر نے طرز تعمیر اور آرائش کے اعتبار سے بہت دلچسپی کے ساتھ دیکھا ، بڑی تعداد میں نمازی موجود تھے - ضعیف امام کی عمر ۹۶ سال کے لگ بھگ تھی - روس سے الحاق رکھنے والی ریاستوں میں بھی اکثریت مسلمانوں کی تھی - اس وقت سوویت یونین دنیا کی چوتھی بڑی اسلامی طاقت تھا - گنتھر نے ایک روسی افسر اعلا سے گفتگو کی تو انہوں نے کہا : " ہم اس حیثیت کو کم کرنا نہیں چاہتے - اگر ہم کسی کو مذہبی آزادی نہ دیں تو یہ ہماری حماقت ہوگی " -

سوویت یونین کا محل وقوع بڑا عجیب ہے - کچھ حصہ یورپ میں اور بڑا حصہ ایشیا میں ہے - اس کے جانب غرب فن لینڈ ، بحیرۂ بالٹک ، پولینڈ اور رومانیہ ، جانب جنوب بحیرۂ اسود ، ترکی ، ایران ، بحیرۂ کیسپیں ، افغانستان ، چین ، منگولیا ، مانچوریا ، جانب شرق بحیرۂ جاپان ، بحیرۂ اوخوتسک ، بحیرۂ بیرنگ اور جانب شمال بحر منجمد شمالی واقع ہے - شمال میں سمندر کے قریب ٹنڈرا یعنی ارض اسود کا علاقہ نہایت زرخیز ہے اور شدید سردی کے باوجود اپنی پیداوار سے ملک کو فائدہ پہنچاتا ہے - بڑا علاقہ چٹیل میدان ہے لیکن ایک سلسلۂ کوہ بھی اس کا نگہبان ہے - اس میں کوہ قاف اور کوہ لوران قابل ذکر ہیں - کئی دریا میدانوں کو سیراب کرتے ہیں جن میں سے وولگا ، دنیسپر ، اونیگا اور ڈون یورپی علاقے میں اور دریائے اوب ، لینا ، وینی سی ، سلینا ، آمور اور ارتائش ایشیائی علاقے میں بہتے ہیں - معدنیات کے لحاظ سے بھی یہ علاقہ مالا مال ہے - مٹی کا تیل دنیا کی کل پیداوار کا ۳۸ فی صد ہے - لوہا ، مگنیشیا ، تانبہ ، سیسہ ، جست ، سونا ، پلاٹینم ، قیمتی پتھر ، سنگ مرمر اور نمک کی کافی مقدار برآمد ہوتی ہے - کھیتوں سے مکئی ، گیہوں ، باجرہ ، میٹھا چقندر ، ناریل ، افراط سے حاصل ہوتا ہے - موسم گرما

قلیل مدت کے لیے لیکن خاصا گرم ہوتا ہے۔ موسم سرما میں سردی خوب پڑتی ہے۔ گھڑوں کا پانی تک جم جاتا ہے۔

انتظامی اعتبار سے ملک کے کئی حصے ہیں۔ وفاقی جمہوریہ کے علاوہ بہت سی ریاستوں کا اس سے الحاق ہے۔ وفاق اور ریاستوں کی تفصیل حسب ذیل ہے جو جنوری ۱۹۷۷ء کے تخمینے کے مطابق ہے:

علاقہ	صدرمقام	رقبہ مربع کلو میٹر میں	آبادی
وفاقی جمہوریہ	ماسکو	۱,۷۰,۰۰,۰۰۰	۷۸,۰۰,۰۰۰
یوکرین	خیوا	۴,۴۵,۰۰۰	۴,۹۳,۰۰۰
بائیلو روس	منسک	۲,۰۷,۶۰۰	۹۴,۰۰,۰۰۰
ازبکستان	تاشقند	۴,۴۷,۴۰۰	۱,۴۴,۷۴,۰۰۰
کزاخستان	الماعطا	۲۷,۱۷,۳۰۰	۱,۴۵,۰۰۰
جارجیا	تبلیسی	۶۹,۷۰۰	۵۰,۰۰,۰۰۰
آذر بائجان	باکو	۸۶,۶۰۰	۵۷,۷۶,۰۰۰
لتھوآنیا	ولنا	۶۵,۲۰۰	۳۳,۰۰,۰۰۰
مولداویا	کشی نیف	۳۳,۷۰۰	۳۸,۸۰,۰۰۰
لت ویا	ریگا	۶۳,۷۰۰	۲۵,۰۰,۰۰۰
کرغزیہ	فرنزے	۱,۹۸,۵۰۰	۳۴,۰۰,۰۰۰
تاجکستان	دشنبہ	۱,۴۳,۱۰۰	۳۶,۰۰,۰۰۰
آرمینیا	یرے وان	۲۹,۸۰۰	۲۸,۹۳,۰۰۰
ترکمانیہ	اشک آباد	۴,۸۸,۱۰۰	۲۶,۵۰,۰۰۰
استونیا	تالن	۴۵,۱۰۰	۱۴,۳۷,۰۰۰

ابتدائیہ

اب سے تقریباً چودہ سال پہلے یعنی جولائی سنہ ۱۹۵۴ء کے تیسرے ہفتے میں جب ریڈیائی لہروں کے ذریعہ سے نشر ہونے والی یہ خبر سننے میں آئی کہ تاجکستان کے نامور انقلابی شاعر، دانشور اور سیاسی رہنما صدرالدین عینی کا انتقال ہوگیا ہے تو دل و دماغ کو شدید صدمہ پہنچا۔ مجھے ان سے ملنے کا کبھی شرف حاصل نہیں ہوا تھا لیکن ان کی چند سیاسی تحریریں میرے مطالعے میں آئی تھیں اور بعض انقلاب انگیز اشعار سے، جو فارسی زبان میں تھے، میں نے گہرا اثر لیا تھا اور اس اعتبار سے ان کے بارے میں ایک عمدہ رائے قائم کی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ انہیں دیکھنے اور ان سے تبادل خیال کرنے کی تمنا پوری نہ ہوسکی تھی کہ اچانک سانحۂ ارتحال کی خبر سنی۔ تاجکستان میں اور ان کے وطن مالوف دوشنبہ سے پانچ دس ہزار میل پرے پاکستان اور دوسرے ملکوں میں بھی یہ خبر افسوسناک ثابت ہوئی کیونکہ یہ مثل مشہور ہے کہ ایک عالم کی موت ایک عالم کی موت ہوتی ہے۔

میرے جیسے تمام پاکستانیوں کے لئے یہ خبر اس لحاظ سے بھی افسوسناک تھی کہ اس وقت سے چھ سال پہلے ہم اپنے وطن کے اس مجاهد آزادی کے وجود ظاهری سے محروم ہو گئے تھے جس کی مساعئی جمیل نے پاکستان کو دنیا کے نقشے پر ایک نمایاں جگہ دی تھی۔ ان سے جدا ہونے کا غم چھ سال گزرنے کے باوجود ابھی تازہ زخم کی طرح تکلیف دہ تھا۔ تاہم عینی کی وفات پر دل

ھی دل میں تعزیتی الفاظ ادا کرتے وقت یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ چوبیس سال بعد ایک روسی ریاست کے اس بطل عظیم کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات میں حصہ لینے کے لئے مجھے مدعو کیا جائیگا ' اور مجھے اپنی مصروفیات کے باوجود اس دعوت نامے کو قبول کرلینا پڑیگا ۔

تقریبات میں شرکت کا دعوت نامہ

اس سال ۱۶ مارچ کو کراچی میں متعین روس کے قونصل جناب آر ' اے ' بکالو کا مراسلہ ملا جسے وہ خود لے کر میرے دفتر میں تشریف لائے ۔ مراسلے کے ساتھ تاجک اکیڈمی آف سائنسز کے صدر جناب محمد عاصموف کی طرف سے بھیجا ہوا دعوت نامہ منسلک تھا ۔ دعوت نامے میں مختصراً یہ بتاتے ہوئے کہ تاجک سوویت ادب کے بانی صدر الدین عینی تاجک اکیڈمی آف سائنسز کے سب سے پہلے صدر بھی تھے، اس میں ان کی قلمی کاوشوں کو سراہا گیا تھا جن کو تاجک فارسی ادب میں ایک قیمتی ورثہ سمجھا جاتا ہے ۔

یہ بھی پتہ چلا کہ اقوام متحدہ کے تعلیمی ، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے اپنی انیسویں جنرل کانفرنس میں جو نومبر سنہ ۱۹۷۶ء کو منعقد ہوئی تھی، ۱۹۷۸ء کے کیلنڈر میں عینی کی صد سالہ جوبلی کو ایک اہم تاریخی واقعہ کی حیثیت دینے کا فیصلہ کیا تھا ۔ دعوت نامے میں دی ہوئی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ عینی کی نگارشات کو مختلف ذرائع سے جمع کرکے ان کے اصل روپ میں اور متعدد زبانوں میں ان کے ترجمے کرنے کا اہتمام صد سالہ

جوبلی کی مجلس انتظامیہ نے مناسب صورت میں کیا ھے۔ نیز یہ کہ ھفت روزہ تقریبات ماسکو اور دوشنبہ میں منعقد ھونے والی تھیں۔

دعوت نامے کے ساتھ دانشور بزرگ جناب محمد عاصموف کا ایک ذاتی دستخط شدہ خط بھی میرے نام موصول ھوا تھا جس میں یہ یقین ظاھر کیا گیا تھا کہ میں اس دعوت نامے کو قبول کر کے جوبلی میں ضرور شریک ھونگا اور مقالہ بھی پڑھونگا۔ گویا اس طرح کئی سال پہلے دیکھے ھوئے ایک سہانے خواب کی تعبیر بہ انداز دگر برآمد ھو رھی تھی۔ یعنی عینی سے ملاقات کا شرف نصیب نہ ھوا تو انھیں خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت مل رھی تھی۔ بھلا میں اس زرین موقع کو کس طرح ھاتھ سے جانے دیتا۔ میں نے غیر رسمی طور پر دعوت نامہ شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور رسمی طور پر حکومت کے ارباب اقتدار سے سلسلہ جنبانی شروع کی تا کہ وھاں جانے، تقریبات میں شریک ھونے اور مقالہ پڑھنے کی باقاعدہ اجازت مل جائے۔ جن لوگوں کو ایسے اجازت نامے لینے کی ضرورت پڑتی ھے، وہ بخوبی جانتے ھیں کہ یہ بظاھر آسان کام حقیقتاً کس درجہ مشکل اور صبرآزما ھوتا ھے۔ لیکن انسان خلوص نیت اور جذبۂ صادق کے ساتھ کوئی قدم اٹھائے تو ھر مشکل آسان ھوجاتی ھے۔ اس مشکل کو آسان کرنے میں میری مستعد سکریٹری مسز ایل، اے، ڈی، سلوا کا بڑا ھاتھ تھا۔ انھوں نے کئی بار وزارت تعلیمات کے سکریٹری سے ٹرنک کال کے ذریعہ سے بات کی اور زبانی اجازت نامہ حاصل کرلیا۔ یہ غنیمت تھا۔ تحریری اجازت نامہ میری روانگی کے چند دن بعد وصول ھوا۔ اس کے ساتھ ساتھ باقی سوئیاں بھی نکال دی گئیں۔ چنانچہ ۹ اپریل کو میں نے خط میں

دئے ہوئے ماسکو کے پتے پر عینی کانفرنس کے منتظمین کو حتمی طور پر مطلع کردیا کہ میں ۱۱ اپریل کو وہاں پہنچ رہا ہوں۔

ایک تلخ تجربہ

حکومت سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے سلسلے میں یہ میرا پہلا تلخ تجربہ نہیں تھا۔ اس ضمن میں اس سے پہلے بھی بارہا پریشانیاں اٹھا چکا ہوں۔ مثلاً حضرت امیر خسرو کے جشن ہزار سالہ میں شرکت کرنے کے لئے جب اگست ۱۹۷۵ء میں اجازت مانگی گئی تو سرکاری دفاتر کے سرخ فیتوں نے اتنے چکر دئے کہ میرا سر برابر چکراتا رہا۔ غیر معمولی تاخیر کے باعث میرے ذہن نے یہ تاثر قبول کیا کہ میرے سفر روس میں اب کوئی رخنہ پڑنا لازمی ہوگیا ہے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ مجھے اس سفر سے روکنا تو کسی کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔ البتہ پروگرام کو زیرو زبر کردینے کے امکانات تو موجود تھے۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ کوتا ھی بلکہ بد نظمی صرف میرے لئے ہی نہیں، سب کے لئے تکلیف دہ ہوسکتی ہے۔ اس سے دوسرے ملکوں میں اپنے قومی وقار کو صدمہ پہنچتا ہے جسے کسی عنوان کوئی بھی گوارا نہیں کرتا بلکہ برداشت نہیں کیا جاسکتا۔

۱۳ ستمبر کو دن کے دس بجے ٹیلی فون پر میری بیٹی سعدیہ کو یہ پیغام ملا:

''حکیم صاحب سے کہ دیجئے کہ کل صبح ان کو روس جانا ہے۔ تمام انتظامات کردئے گئے ھیں۔ بنک کو تار بھجوا دیا ہے تاکہ آپ کا ٹکٹ وغیرہ بن جائے''۔

مگر دوسرے روز شام کے چار بجے تک اسٹیٹ بنک میں کوئی ہدایت نہیں آئی - اگر عزیز من جمیل الدین عالی صاحب اپنے اثرات سے کام نہ لیتے تو ٹکٹ بن ہی نہیں سکتا تھا اور ہم دوسرے روز صبح کو روس کے لئے روانہ ہو ہی نہیں سکتے تھے - اس جشن میں شرکت کے لئے عالی صاحب ہی میرے ہم سفر تھے - لہٰذا ان کی وجہ سے ٹکٹ خریدنے کی اجازت ملی اور تیس ڈالر ساتھ لے جانے کی منظوری بھی عطا ہوگئی -

روس سے موصولہ دعوت نامے کی بنیاد پر سفیر روس نے مجھے داخلۂ روس کا اجازت نامہ دیدیا تھا - اگر میں ایسا نہ کرتا تو ویزے کا مسئلہ بھی کھڑا ہوتا اور معاملہ قابو سے باہر ہوجاتا - میری پریشانی کا اندازہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ جب سرکاری طور پر اجازت ملنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی تو ۱۲ ستمبر کو میں نے قطعاً فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اب سفر روس نہیں کرونگا اور سامان کھول کر بھی رکھ دیا تھا - کیونکہ جشن امیر خسرو کے پروگرام کے مطابق کئی اہم تاریخیں نکل چکی تھیں اور اندیشہ تھا کہ اب وہاں جانا بے سود نہ ہوجائے - ادھر تین دن سے بڑا تیز بخار بھی تھا جس سے سخت کمزوری لاحق ہوگئی تھی - درجۂ حرارت مسلسل ۱۰۳ تھا مگر میں اس سفر سے دو وجہ سے بچ نہیں سکتا تھا :

۱— وزیر اعظم پاکستان نے بطور خاص میرے سفر کی منظوری دی تھی اور اس طرح میری حیثیت سفر روس میں ذاتی نہیں، سرکاری ہوگئی تھی -

۲— حکومت روس کا دعوت نامہ میرے نام شخصی تھا

اور دعوت نامہ جاری کرنے سے قبل روس نے ۵ جون ہی کو اطلاع کردی تھی کہ مجھے تیار رہنا چاہئے۔ لہذا یہ مناسب نہیں تھا کہ میں اس سفر سے کسی طرح بھی گریز کرتا۔

البتہ اس ذہنی پریشانی کا یہ اثر ضرور ہوا کہ پہلے سے خریدا ہوا ٹکٹ گھر پر ہی رہ گیا اور میں ہوائی میدان کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں اس بھول کا احساس ہوا۔ صرف چند منٹ کا راستہ باقی رہ گیا تھا۔ بہت ہی نازک مرحلہ تھا لیکن فوراً ہی فیصلہ کیا کہ گھر واپس چلوں۔ چنانچہ گاڑی کے پہیے موڑ دیئے گئے۔ اس کا رخ بدل گیا۔ ٹکٹ لے کر بڑی کشمکش کے بعد دو بجے ہوائی اڈے پر پہنچا۔ وہاں سوویت قونصلیت کے خلیلل صاحب موجود تھے جو مجھے رخصت کرنے اور خدا حافظ کہنے کے لئے آئے تھے۔ حال آں کہ میں نے شب گزشتہ ایک تقریب میں منع بھی کردیا تھا کہ وہ زحمت نہ فرمائیں۔ لیکن انہیں یہ ہدایت روس سے ملی تھی اور مجھ سے دیرینہ تعلقات بھی قائم تھے۔ اندر گیا تو دیکھا کہ جمیل الدین عالی صاحب ہوائی اڈے کے عملے سے الجھے ہوئے تھے۔ ان کا سامان ذرا زیادہ تھا اور روسی ہوا پیما ایئرو فلوٹ کے جنرل منیجر صاحب مصر تھے کہ زائد سامان کا کرایہ ادا کیا جائے۔ میں آیا تو میرا سامان بھی کچھ کم نہ تھا، قاعدے کے عین مطابق تھا۔ درحقیقت ہم دونوں کے پاس روس کے لئے کتابوں کے تحائف تھے۔ میرے پاس اپنی اس تقریر کے کتابچے کی پانچ سو کاپیاں بھی تھیں جو مجھے تقریر کے بعد وہاں تقسیم کرنی تھیں۔ ان کا وزن خاصہ زیادہ تھا۔ ان کے علاوہ بہت کم

سامان تھا - جہاز کی روانگی کے تنگ وقت نے منیجر صاحب کو تنگ کردیا - لہذا جناب خلیل صاحب کی مداخلت سے طے پایا کہ صرف پندرہ کلو کا کرایہ ادا کردیا جائے - باقی معاف - یہ میں نے ادا کردیا اور جمیل الدین عالی صاحب صاف بچ گئے -

روسی قونصلیت کی ہدایت کے مطابق مجھے جہاز والوں نے فرسٹ کلاس میں جگہ دیدی جہاں کراچی سے ماسکو تک چار ہزار کچھ سو کلو میٹر کا پانچ گھنٹے چالیس منٹ کا سفر بڑے آرام سے طے ہوگیا - زائد سامان کے کرائے کا بدل اس طرح مل گیا اور عالی صاحب مفت میں اس رعایت سے بھی مستفیض ہوئے -

سخت مایوسی کا سامنا

جب جہاز ماسکو کے ایئر پورٹ پر پہنچا تو وہ اندیشہ صحیح نکلا جس کی توقع تھی - یعنی کوئی بھی ہمیں لینے نہیں آیا تھا - حالانکہ روسی قونصلیت نے کراچی سے جہاز کی روانگی سے قبل ماسکو اطلاع کردی تھی مگر اس روز ہفتہ تھا اور وہاں پہنچنے والے دن اتوار - ماسکو میں یہ دونوں دن چھٹی کے ہوتے ہیں - میں نے ماسکو میں پاکستانی سفارت کو بھی کوئی اطلاع نہیں دی تھی - خیال تھا کہ یہ کام سرکاری طور پر ہوگا مگر ایسا نہیں ہوا - اس لئے ظاہر ہے کہ اب ہمیں لینے کوئی کیوں آتا - تاہم اس آڑے وقت میں جمیل الدین عالی صاحب کام آگئے - انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں سفارت خانے ہی چلنا چاہئے - میری رائے تھی کہ ہمیں ہوائی جہاز میں سوار ہوکر الماعطا روانہ ہوجانا چاہئے جو پروگرام میں شامل تھا - مگر مجھے پہلی بار معلوم ہوا

که روس میں :

(ا) ایک شہر سے دوسرے شہر بغیر اجازت کے نہیں جایا جاسکتا۔ یعنی ہمیں ہوائی جہاز کا ٹکٹ مل ہی نہیں سکتا تھا جب تک کہ ماسکو کے ایک خاص دفتر سے اجازت نامہ حاصل نہ کرلیا جاتا۔

(ب) ہم ماسکو کے کسی ہوٹل میں جا کر ٹھیر نہیں سکتے تھے جب تک کہ اس کی بھی خصوصی اجازت دفتر خاص سے حاصل نہ کرلی جاتی۔

یہ دونوں شدید پابندیاں تھیں اور ان کا کوئی حل اس وقت تک نہیں نکل سکتا تھا جب تک کہ ہم اپنے سفارت خانے نہ جاتے۔ میرے ذہن پر اس کا بڑا ہی بار تھا مگر اس وقت یہ ایک ایسی مشکل تھی کہ اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

ہوائی میدان میں جہاز اترنے کے کوئی ۸۰ منٹ بعد سامان آنا شروع ہوا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اپنا سامان ہم نے خود تلاش کر کے نکال لیا۔ ٹرالیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ قلی گنتی کے چند تھے۔ ٹرالیاں انھی کے قبضے میں تھیں۔ انہوں نے موقع نہیں دیا کہ ہم کوئی ایک ہی ٹرالی لے لیں۔ دنیا میں ہر جگہ ہوائی اڈے پر سامان کے لئے ٹرالی مفت مل جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسی سال ۳ مارچ کو جب میں فرینکفرٹ گیا تھا تو ٹرالی کا کرایہ ایک مارک ادا کرنا پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہاں بھی ٹرالی کا کرایہ اتنا ہی ہوگا۔ مگر ایسا نہ تھا۔ یہاں قلی مختار کل تھے۔ ہم دونوں نے ایک قلی کرلیا۔ میں نے باہر نکل کر فوراً اپنے تیس ڈالر بھنائے جو زرمبادلہ کے طور پر ہمیں اس

سفر کے لئے ملے تھے۔ تیس امریکی ڈالر کے مجھے ۲۱٫۹۸ روبل ملے۔ یعنی پورے بائیس بھی نہیں۔ اتنے زیادہ ڈالر دے کر جو روبل ہاتھ میں آئے، وہ ذرا بھی نہ جچے۔ روبل کی قیمت روسیوں نے ضرورت سے زیادہ بڑھا رکھی تھی۔ اس لئے کالے بازار میں امریکی ڈالر کے عوض زیادہ روبل مل جاتے تھے مگر میں کالے بازار کا سودا کرنے کا عادی نہیں تھا۔ میں ہر کام ضابطے میں کرتا ہوں۔ اب ایک روبل تقریباً سواتیرہ روپے کے برابر ہوا۔ آدھا روبل قلی کے لئے دل خوش کن ثابت ہوا۔

ماسکو کے ہوائی میدان پر ایک طالب علم سے بھی ملاقات ہوگئی۔ وہ اسی جہاز سے اترے اور لاڑکانہ سے آئے تھے۔ ماسکو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ تھا۔ وہی مزاج تھا جو اکثر طالب علموں کا ہوا کرتا ہے۔ ان کے ایک دوسرے سندھی دوست لینے آئے تھے۔ ہم نے ان دونوں کو اپنی ٹیکسی میں بٹھالیا تاکہ ان کو فائدہ پہنچ جائے۔ راستہ ہم سب کا ایک ہی تھا۔ راستے بھر وہ دونوں آپس ہی میں باتیں کرتے رہے۔ ہماری طرف بہت کم رخ دیا۔ وہ دونوں طالب علم پاکستان کے باشندے حکیم محمد سعید اور جمیل الدین عالی سے ناواقف تھے۔ انہوں نے حکیم سعید کا نام کبھی نہیں سنا تھا اور عالی صاحب کی غزلیں، نظمیں اور دوہے بھی نہیں پڑھے تھے۔ پاکستانی سفارت خانے پر آکر میں نے میٹر کے مطابق تین روبل ادا کردئے۔ وہ دونوں طلبہ اسی ٹیکسی میں روانہ ہوگئے۔ اخلاقاً انہوں نے ہمارا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ ان کے نزدیک یہ ہمارا فرض ہی تھا کہ ہم ان کو لفٹ دیتے۔

سفیر پاکستان سے ملاقات

اتوار کی وجہ سے سفارت خانۂ پاکستان بھی بند تھا ۔ یہ غنیمت تھا کہ جناب سفیر اسی عمارت میں رہتے تھے اور اس وقت موجود بھی تھے ۔ ان دنوں ماسکو میں ہمارے سفیر جناب سجاد حیدر صاحب متعین تھے ۔ ان سے غائبانہ تعارف تو حاصل تھا مگر ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ بے تکلفی کا تو سوال ھی نہیں تھا ۔ زبردستی ان کا مہمان بنا جو محض مجبوری پر محمول کیا جاسکتا تھا ۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ بھی نہیں تھی ۔ چنانچہ وھاں پہنچ کر عالی صاحب نے سفارت خانے کے سیکوریٹی افسر صاحب کو دعوت نامہ دکھایا ۔ اس کے بعد دروازے کھلنے شروع ہوئے اور ہم عمارت کے اندر پہنچ گئے ۔ ڈرائنگ روم میں بٹھا دئے گئے ۔ ذراھی دیر میں جناب محترم سجاد حیدر صاحب تشریف لے آئے ۔ ایک دم ان کی زبان سے نکلا :

"ارے حکیم صاحب ، ھم تو آپ کے پرانے دوست ھیں ۔
میری اہلیہ سعید الزماں صاحب کی ہمشیرہ ھیں" ۔

اب مجھے بھی یاد آگیا کہ جب سجاد حیدر صاحب دھلی میں تھے تو سعید الزماں صاحب مرحوم کے ارشاد پر میں نے اپنے بھائی جان محترم کو لکھا تھا کہ ان کے معاملے میں خاص توجہ فرمائیں ۔ اس تعارف اور حوالے کے بعد دل کو ڈھارس ملی اور پھر بے تکلفی کی باتیں شروع ھوگئیں ۔ ان کو ھمارے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی ۔ یعنی پاکستانی وفد ماسکو پہنچ گیا مگر حکومت نے اپنے سفیر تک کو کوئی اطلاع نہیں کی تھی ۔ اس غفلت شعاری

کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا۔ دوران گفتگو جناب سجاد حیدر صاحب نے بتایا کہ روسی اکیڈمی آف سائنسز نے ان سے رابطہ قائم کر کے درخواست کی تھی کہ چونکہ پاکستان سے کسی مندوب کے آنے کی اطلاع نہیں ملی ہے، اسلئے سفارت خانے سے کسی کو بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اہلیہ سفیر صاحب جانے کے لئے تیار ہوگئیں۔ وہ اچھا علمی ذوق رکھتی ہیں۔ چنانچہ بابا جان غفوروف صاحب کی جانب سے ان کو دعوت نامہ بھی مل گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود جناب سفیر کی اہلیہ صاحبہ کو دوشنبہ جانے کی اجازت نہیں ملی تھی اور اس وقت تک وہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی نہیں خرید سکتی تھیں۔ حیرت ہوئی کہ جہاں یہ جکڑ بندیاں ہوں کہ خود ہمارا سفیر ماسکو کی مقررہ حدود سے باہر سرکاری اجازت کے بغیر قدم نہ اٹھا سکتا ہو، ہمارا کیا مقام تھا۔ جناب سفیر صاحب نے فون کر کے اپنے سیکنڈ سکریٹری کو بلایا اور ان سے کہا کہ ہمارے ٹھیرنے کا مناسب انتظام کردیا جائے۔ وہاں دو بڑے ہوٹل پیکنگ اور روسیہ ہیں لیکن وہ اجازت کے بغیر کمرہ نہیں دیتے۔ اسلئے انٹورسٹ سے ایک رات کے لئے ہوٹل نیشنل میں اہتمام ہوگیا جو عموماً ایسے سیاحوں کے لئے ہے جنہیں آگے جانا ہوتا ہے۔ ہمیں تشویش یہ تھی کہ ہوٹل نیشنل میں ایک رات کے اٹھاون امریکی ڈالر ہوتے تھے یعنی تقریباً چھ سو روپے۔ میرے اور عالی صاحب کے پاس مشترکہ طور پر صرف ساڑھے چھپن ڈالر کے برابر روبل باقی تھے کیونکہ ساڑھے تین ڈالر خرچ ہوچکے تھے۔ ہم نے سوچا کہ کل کیا ہوگا اور ہم کھانا کیسے کھائیں گے۔ جناب سفیر صاحب نے اکیڈمی آف سائنسز کو فوراً تار روانہ کیا کہ پاکستانی وفد ماسکو

پہنچ گیا ہے اور ہوٹل میں ٹھہرا دیا گیا ہے۔ انہوں نے از راہ کرم ہم سے تار کا خرچ نہیں لیا۔ ہم جس کنگرس میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے، وہ ۸ ستمبر سے شروع ہوچکی تھی۔ ماسکو، الما عطا اور دوشنبہ میں اس کے اجلاس ہوچکے تھے۔ اب اختتامی جلسہ باقی تھا۔ اس تمام تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ اگر سرکاری طور پر ہم کو بر وقت اجازت مل جاتی تو کسی قسم کی پریشانی نہ ہوتی اور ہم اجلاس میں ابتدا ھی سے شریک ہوتے۔ خیر چھوڑیۓ اس قصہٴ ماضی کو!

میرے مقالے کا موضوع

عینی کنگرس میں شرکت کے لئے روانہ ہونے سے قبل ھی میں نے مقالے کی تیاری شروع کردی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ''صدر الدین عینی کی شخصیت، ان کے عہد اور ان کے پیغام'' کو موضوع بنا کر اپنے خیالات کا اظہار کرونگا۔ میرے ذاتی کتب خانے میں اس عظیم انسان پر کافی مواد موجود تھا۔ اس کے علاوہ کراچی میں قائم ''فرینڈ شپ ھاؤس'' کے ڈائرکٹر جناب تلا گانوف نے اس ضمن میں میری اعانت کی جو قابل قدر تھی۔ ان کے بھیجے ہوئے اشاریے بڑے کام آئے۔ مقالہ تیار کر کے ایک کتابچے کی صورت میں طبع کرالیا تاکہ ماسکو اور دوشنبہ کے شرکائے اجلاس میں تقسیم کیا جاسکے۔ اس پمفلٹ مں دو تصویریں بھی تھیں۔ ایک عینی کی شبیہ اور دوسری استالن آباد کی اس شاہراہ کی جو عینی کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔

کانفرنس کے منتظمین نے شریک ہونے والوں کے لئے جو

پروگرام مرتب کیا تھا، میں نے اپنے ذوق اور مشاغل کے اعتبار سے اس میں کچھ اضافہ اپنے لئے کرلیا ۔ میرے لئے ممکن نہیں ہے کہ میں کسی دوسرے ملک میں جاؤں اور وہاں کے طبی ادارے، طبی درسگاہیں اور شفاخانے نہ دیکھوں ۔ میں نے چند ماہ پہلے اپنے ملک میں سرطان سے متعلق ایک مطالعی، تحقیقاتی اور انسدادی مہم شروع کی تھی، جس کے سلسلے میں اجلاس طلب کئے تھے اور ان کارناموں پر حکومت نے مہر توثیق ثبت کردی تھی ۔ لہذا بطور خاص اپنے پروگرام میں ماسکو کے ادارۂ سرطان میں جاکر معالعے کے لئے کچھ گنجائش رکھ لی گئی اور اپنے اس ارادے سے کانفرنس کے منتظمین کو مطلع کردیا گیا تاکہ وہ اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میرے لئے مناسب وقت کا اہتمام کردیں ۔

علاوہ ازیں میں نے روس اور تاجکستان کے بیشتر سرکاری اور چند غیر سرکاری کرم فرماؤں کو، جن سے ذاتی طور پر مجھے شرف نیاز حاصل تھا یا میں ان سے خط وکتابت کرچکا تھا، مجموعی طور پر ۲۳ خطوط انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں میں حسب ضرورت لکھہ دئے تاکہ ان کو میری روانگی اور وہاں پہنچنے کی اطلاع پہلے سے ہوجائے اور قند مکرر کے طور پر ان سے ایک بار پھر ملنے کا موقع مل جائے ۔ ان میں پاکستانی سفیر متعینہ ماسکو، عزت مآب سجاد حیدر بھی شامل تھے جو میرے دیرینہ کرم فرما ہیں ۔ سجاد حیدر صاحب نے ماسکو میں رہتے ہوئے اپنے ملک کے عظیم راہنماؤں کو یاد رکھنے اور حسب ضرورت غیر ملکیوں سے ان کو مناسب صورت میں متعارف کرانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے ۔ مثال کے طور پر انہوں نے دسمبر ۱۹۷۶ء میں اپنے محبوب

قائد اعظم کے صد سالہ جشن پیدائش کی تقریب ماسکو میں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ منانے کا انتظام کیا تھا جس میں نہ صرف روسی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے پاکستانی طلبہ اور سفارت خانے کے عملے نے شرکت کی بلکہ خود روسی نژاد مفکروں نے مسلمان قوم کے اس مجاہد اعظم کو اپنے پندار کے مطابق خراج عقیدت پیش کیا۔

قائد اعظمؒ کا جشن پیدائش

اس موقع پر میرے دوست پروفیسر ی۔ و۔ گانکو فسکی نے اپنے پاکستان کے اس دورے کے تاثرات بیان کئے جو انہوں نے قائد اعظم کے سو سالہ جشن پیدائش کے سلسلے میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کنگرس میں شرکت کے لئے کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک بڑا نمائندہ اجتماع تھا۔ اس کا نظم و نسق بہت عمدہ تھا اور اس میں جو تقریریں ہوئیں یا مقالات پیش کئے گئے، ان کا معیار انتہائی بلند تھا۔ انہوں نے اس بات کی حمایت کی کہ قائد اعظم محمد علی جناح کی زندگی اور سرگرمیوں کا مطالعہ کرنے والے سوویت اور پاکستانی اسکالروں کے مابین روابط کو مزید توسیع دی جائے۔

سوویت یونین کی اکیڈمی آف سائنسز کے شعبۂ علوم شرقیہ کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ج۔ ک۔ شیروکوف نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

" قائد اعظم محمد علی جناح اپنے ملک کی تاریخ میں محض اس لئے زندہ نہیں ہیں کہ وہ قومی آزادی کی تحریک کے سربراہ

تھے، جس کے نتیجے میں ایک خود مختار پاکستان کا قیام عمل میں آیا بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ایک وسیع النظر دانشور اور مفکر تھے اور انھوں نے پاکستان کی آئندہ ترقی کے لئے ایک لائحۂ عمل بھی مرتب کردیا تھا۔"

علوم تاریخ کےایک روسی طالب علم و۔ ن۔ موسکالنکو نے اپنے مقالے میں کہا کہ قائد اعظم پاکستان کے معاشی ڈھانچے کو یکسر بدل دینا اور اسے جدید صنعتوں کی بنیاد پر تشکیل دینا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں فروغ صنعت کا مقصد یہ تھا کہ ایک طرف بےروزگاری ختم ہو اور دوسری طرف حکومت کو دوسرے ترقیاتی منصوبے عمل میں لانے کے لئے کافی رقم مل جائے۔ علوم تاریخ ھی کے ایک اور طالب علم ا۔ م کمپانتسیو نے قائد اعظم کی خارجہ پالیسی کو سراہتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ وہ تمام ممالک اور قوموں پر زور دیتے رہے کہ وہ امن و عافیت اور باھمی دوستی کی بنیاد پر زندگی بسر کریں۔ وہ سمجھتے تھے کہ سوویت یونین سمیت تمام پڑوسی ملکوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات ضروری ھیں۔ طالب علم نے یاد دلایا کہ پاکستان اور سوویت یونین کے مابین اچھے سفارتی تعلقات اسی وقت قائم ہوگئے تھے کہ جب وہ ملک کے پہلے گورنر جنرل تھے۔

جناب سجاد حیدر صاحب نےخود بھی قائد اعظم کے سیاسی ورثے کے بارے میں مختصر روئداد پیش کی اور کہا کہ وہ آزاد پاکستان کے قیام کی جدوجہد کے لئے اس وجہ سے علمبردار ہوئے تھے کہ وہ غریب عوام کے مفادات پورے کر کے انھیں خوشحالی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے قائد اعظم کی خارجہ پالیسی پر

روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ساری دنیا میں قیام امن کے حامی تھے۔

علامہ اقبال کا جشن پیدائش

اسی طرح پاکستان میں ۱۹۷۶ء علامہ اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کے لئے مخصوص کیا گیا تو جناب سجاد حیدر نے ماسکو میں ایک جلسے کا اہتمام کیا جس میں اقبال کی اصل مطبوعات کے علاوہ ان ترجموں کی نمائش بھی کی گئی جو روسی، ازبکی، تاجکی، تاتاری اور دوسری زبانوں میں ہوچکے ہیں۔ روسی مصنفین کی طبعزاد کتابیں، جو علامہ اقبال پر لکھی گئیں، ان کے علاوہ تھیں۔ سوویت ماہرین شرقیہ نے اس موقع پر عمدہ الفاظ میں شاعر مشرق کو خراج تحسین بھی ادا کیا۔ اپنے فرائض منصبی کی ادائی کے علاوہ محترم سجاد صاحب کی یہ کارگزاریاں ادبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے لائق تحسین ہیں۔

علامہ اقبال پر ایک اور جلسے کا اہتمام تاجکستان کی اکیڈمی آف سائنسز کے صدر اور میرے عزیز دوست جناب ڈاکٹر محمد عاصموف کی سربراہی میں بمقام دوشنبہ منعقد ہوا۔ خود انہوں نے اس موقع پر کہا:

”ہم اس آدمی کی سالگرہ منارہے ہیں جو ہم تاجکوں کو خاص طور پر عزیز ہے۔ وہ اردو اور فارسی زبانوں میں شعر کہتے تھے جو ہم سے قریب اور ہمارے لئے قابل فہم زبانیں ہیں۔ ان کی نظمیں ایسے لوگوں کو بے حد پسند ہیں جو شاعری کو سراہتے اور اس سے گرمجوشی کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔“

محمد عاصموف صاحب نے زور دے کر یہ بات کہی کہ برصغیر جنوبی ایشیا کے شاعروں اور ادیبوں کے ادبی ورثے کا مطالعہ کرتے ہوئے تاجک اسکالروں نے محمد اقبال پر خصوصی توجہ دی ہے۔ تاجک رسالوں میں اقبال کی نظمیں ، ان کی زندگی اور ان کی تخلیقی سرگرمیوں سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اکیڈمی کے علوم شرقیہ کے ادارے نے جناب عبداللہ جان غفاروف کا لکھا ہوا ایک کتابچہ " علامہ اقبال " بھی شائع کیا۔ اقبال کی نظموں کا ایک مجموعہ " صدائے مشرق " بھی مرتب کیا گیا۔ تاجکستان بلکہ تمام روس میں علامہ کی شاعری کو مقبول بنانے میں میرے دوست میر سعید میر شاکر کافی اہم حصہ لیتے رہے ہیں۔ وہ ایک عوامی شاعر ہیں۔ انہوں نے اقبال کی نظموں کا تاجک زبان میں ترجمہ کر کے پہلا مجموعہ ۱۹۵۸ میں شائع کیا تھا۔ اس جلسے میں بھی سفیر پاکستان جناب سجاد حیدر نے شرکت کی تھی۔ انہوں نے اس موقع پر کہا تھا :

" ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ علامہ اقبال نے روس میں ۱۹۱۷ میں برپا ہونے والے انقلاب اکتوبر کی فتح کی پذیرائی کی تھی۔ شاعر نے اس انقلاب کو مشرق کے سیاہ بادلوں میں سے آزادی کا طلوع ہوتا ہوا سورج قرار دیا تھا جس نے ایک نئے دور کا آغاز کیا جس میں تمام لوگ اپنی زندگیوں کے مالک ہیں "۔

یہ تقریب تاجک اکیڈمی کے ڈرامہ تھیٹر میں منعقد ہوئی تھی جو وہاں کے عظیم شاعر ابوالقاسم لاہوتی کے نام سے موسوم ہے۔

ماسکو روانگی سے قبل میں نے یہ بھی مناسب سمجھا تھا

که صدرالدین عینی کانفرنس میں پڑھے جانے والے اپنے مقالے کے خاص خاص حصے اردو زبان میں ایک مضمون کی صورت میں لکھ کر پاکستان کے چند اخبارات کو بھیج دئے اس تاکید کے ساتھ کہ مضمون ۱۰ اپریل سے قبل شائع نہ کیا جائے - ایک دو اخبارات نے پورا مقالہ عینی کی تصویر کے ساتھ شائع کیا - باقی نے اقتباسات پر اکتفا کیا - مقصد یہ تھا کہ اس طرح ابنائے وطن کو یہ معلوم ہوجائے کہ عینی کی صد سالہ جوبلی کس اہتمام سے منائی جارہی ہے -

ہوا کے دوش پر

بعض لوگ جب کسی دور دراز ملک کے لئے آمادۂ سفر ہوتے ہیں تو انہیں بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے - رخت سفر باندھنے اور خاص لباس کا اہتمام کرنے میں بڑا وقت گنواتے ہیں لیکن میں پچھلے اٹھارہ بیس سال میں متعدد غیر ملکوں کا سفر کرنے اور دنیا کے چپے چپے میں گھوم لینے کے باعث اس کا اس درجہ عادی ہوگیا ہوں کہ اب وطن سے باہر جانا میرے معمولات میں اس حد تک شامل ہوگیا ہے ، بلکہ میری فطرت کا ایسا جزو بن گیا ہے ، کہ اگر صرف دو گھنٹے پہلے مجھے کسی سفر پر جانے کی فرمائش ملے تو میں کسی پریشانی یا گھبراہٹ کے بغیر اپنی روانگی کی تیاری کرلونگا بشرطیکہ سرکاری پابندیاں بھی آسان کردی جائیں - پچھلے چند سال سے میری زندگی کا ایک مخصوص حصہ ہوا کے دوش پر گزرنے لگا ہے - اسی لئے رخت سفر میرے ساتھ بہت ہی مختصر ہوتا ہے - ایک چھوٹا اٹیچی کیس ، ایک ہینڈبیگ ، انگریزی اردو کی چند

کتابیں اور رسالے۔ میں سردی گرمی کی مختلف النوع کیفیات سے بھی خالی الذھن رھتا ھوں۔ میری شریک حیات نے زور دیا کہ روس کی سردی کے پیش نظر میں اپنا چسٹر، جسے بہت ھی کم استعمال کیا ھے، اپنے ساتھ رکھ لوں تاکہ وقت ضرورت کام آجائے" لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پندرہ سال پہلے جب میں ایک طبی وفد لے کر چین گیا تھا، سردی کا زمانہ تھا اور وہاں کی سردی بھی مشہور ھے تو کون سا چسٹر یا گرم پل اوور لے کر گیا تھا۔ اگر انسان اپنے اندر قوت مدافعت پیدا کرلے تو بیرونی اثرات شکست کھا جاتے ھیں۔ حتیٰ کہ کوئی وبائی بیماری پھیلے تو جسم اپنی قوت سے کام لے کر جراثیم کو مات دے سکتا ھے۔ میں سخت سے سخت سردی میں بھی کوئی گرم مشروب نہیں پیتا۔ لوگ ایسے دنوں میں مجھے ٹھنڈا مشروب پیتے دیکھ کر حیران رہ جاتے ھیں۔

کراچی سے روسی ھوائی جہاز ایئرو فلوٹ کی روانگی کا وقت کسی قدر غیر مناسب تھا، میرے لئے نہیں کیونکہ میں آدھی رات گزرنے کے بعد اٹھ جانے کا عادی ھوں لیکن مجھے رخصت کرنے والے کیوں پریشان ھوں۔ چنانچہ میں نے ھمدرد کے ایگزیکٹو افسروں کو ھدایت کردی تھی کہ وہ مجھے " فی امان اللہ" کہنے کے لئے ھوائی اڈے پر نہ آئیں، اس لئے بھی کہ اب تو میری زندگی سفروں ھی میں بسر ھوتی ھے۔ آخر وہ لوگ کب تک اس طرح مجھے روانہ کرتے رھینگے اور لینے آتے رھیں گے۔ پھر بھی برادر عزیز ڈاکٹر محمد الیاس، مسز ایل، اے، ڈی، سلوا اور حکیم محمد یٰسین آھی گئے۔ نیز میری بیٹی سعدیہ اور ان کی نورچشم ماھم سے گھر پر نہ رھا گیا۔ میں ان سب کا شکریہ بھی ادا نہیں کرسکا

کیونکہ ایک مختصر سا لفظ اس زحمت کا بدل نہیں بن سکتا۔ ان عزیزوں کے علاوہ "فرینڈ شپ ہاؤس" کے ڈائرکٹر مسٹر تلاگانوف بھی مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے ہوائی اڈے پر آگئے۔ انہیں سفارتی مراعات حاصل ہیں، اس لئے وہ مجھے ہوائی جہاز تک بٹھانے کے لئے میدان میں چلے گئے۔ ان کی اس حد تک زحمت کا میں نے خلوص قلب کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔ یہ ان کے بلند اخلاق کا ایک نمونہ تھا۔

ایئرو فلوٹ

روسی ہوائی کمپنی "ایئرو فلوٹ" کے قیام اور اس کے پھیلاؤ کی تاریخ خاصی پرانی اور دلچسپ ہے۔ اب سے تقریباً نصف صدی پہلے ۱۹۲۶ء کے موسم سرما میں یہ کمپنی قائم ہوئی اور محکمۂ شہری پرواز کا پہلا ہوائی جہاز ماسکو سے اڑ کر الن باٹور کے ہوائی اڈے پر اترا جو منگولی عوامی جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔ اس سے اگلے سال مسافر بردار روسی جہازوں نے ایران اور افغانستان کے ساتھ فضائی رشتہ قائم کرلیا۔ پھر رفتہ رفتہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے متعدد ملکوں سے، جن کی مجموعی تعداد اب بیاسی کے قریب ہے، اس کا ناطہ جڑتا چلا گیا۔ اس کے چار ٹربائن انجنوں والے آئی ایل ۶۲ نامی جہازوں کی رفتار نوسو کلو میٹر فی گھنٹہ ہے اور ایک پرواز میں وہ دس ہزار کلو میٹر تک جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک سو چھیاسی تک مسافر بیک وقت سوار ہوسکتے ہیں۔ جہازوں کی دوسری قسم ٹی یو ۱۵۴ کہلاتی ہے۔ جن میں نہایت طاقتور تین ٹربو جٹ انجن لگتے ہیں۔

ان کی رفتار ۹۰۰ کلو میٹر فی گھنٹہ ہے اور ایک پرواز میں پانچ ہزار کلومیٹر تک جاسکتے ہیں۔ ان میں نشستوں کی تعداد ایکسو چونسٹھ تک ہوتی ہے۔ فضائی کمپنی کے ارباب اقتدار کا نصب العین یہ بتایا جاتا ہے کہ تیز رفتاری، آرام اور مہمان نوازی میں کوئی دوسری کمپنی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ مجھے ان الفاظ کو سچ ماننے میں تامل ہے۔ صرف یہ ماننا پڑیگا کہ اس کے جہاز ماسکو سے اڑکر کہیں رکے بغیر ٹوکیو، پیکنگ، دھلی، کراچی اور بمبئی اور صرف ایک جگہ رک کر کوالالمپور، سنگاپور اور کولمبو پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا افتخار اور کمپنیوں کو بھی حاصل ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ جہاز میں مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے کھانے مسافروں کی مرضی کے مطابق مل سکتے ہیں۔

میں نے متعدد ہوائی کمپنیوں کے جہازوں میں سینکڑوں بار سفر کیا ہے اور شکایت کی نوبت کبھی نہیں آئی ہے اور نہ کسی اعتراض کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اس جہاز کے انجنوں میں لگے ہوئے پنکھوں کا شور کانوں کے پردے متاثر کردینے کے لئے کافی ہے۔ دوسرے جہازوں میں شور کی شدت اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ پھر اس جہاز کی کرسیاں آرام دہ نہیں تہیں۔ قطاروں کے درمیان اتنی جگہ بھی نہیں تھی کہ ٹانگیں اطمینان سے پھلائی جاسکتیں۔ ایسی صورت میں سب سے اچھی نشست آگے کی ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ اسے ترجیح دیتا اور اپنے لئے بک کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ سامنے کے کاؤنٹر پر کاغذ رکھ کر اپنا کام کرتے رہو اور جب منزل آئے تو اسے لپیٹ کر بریف کیس میں رکھ لو۔ مگر اس جہاز کی میزبان بد مزاج خاتون

نے اس جگہ غیر روسیوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دی اور کراچی اسٹیل ملز کے تین آدمیوں کو، جو اس کے ہم وطن تھے اور کسی کام سے اپنے ملک جارہے تھے، وہاں بٹھادیا۔ مجھے یہ بات اچھی معلوم نہ ہوئی۔

پپری میں مشینی کمپلیکس

اب سے چار سال پہلے بھلا کون تصور کرسکتا تھا کہ کراچی جیسے گنجان آباد شہر سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر پپری جیسے ویران علاقے میں ایک بھاری مشینی کمپلیکس وجود میں آجائیگا جس میں تکمیل کے بعد تقریباً پندرہ ہزار افراد کام کرینگے؟ لیکن ناقابل تصور ایک پرانا سہانا خواب اس وقت حقیقت میں تبدیل ہوگیا جب ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء کو کراچی اسٹیل ملز کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ یہ اسٹیل ملز پاکستان اور سوویت یونین کے درمیان گہری دوستی کا ثبوت اور سنگ میل ثابت ہوگا۔ اب ہوائی جہاز سے کوئی دشمن نیچے کی طرف نظر ڈالے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیگا کہ وہ جگہ جہاں پہلے صرف گرد آلود ہوائیں چلتی تھیں اور ہر آن یہاں کے نقشے کو بدلتی رہتی تھیں، ایک جدید ترین وسیع کارخانے کی داغ بیل پڑچکی ہے، ساری فضا خوشگوار ہوگئی ہے۔ یہاں کے لوگ، جو خانہ بدوشوں کی طرح بکھرے پڑے رہتے تھے اور ماہی گیری کے سوا کسی دوسرے کام سے واقف نہیں تھے، آج دیوہیکر مشینیں چلا رہے ہیں۔ سیکڑوں مقامی اور دوسرے شہروں سے آئے ہوئے افراد نے یہاں تربیت حاصل کرلی ہے اور بعض آئندہ کی توسیع کے

لئے تربیت پارہے ہیں۔ چار سال کے عرصے میں بہت کچھ ہوچکا ہے اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس دیو پیکر پروجکٹ میں سوویت پاکستان شراکت مستحکم تر اور بہت زیادہ قریب ہوتی جارہی ہے۔ ملز کے چیرمین کی نگرانی میں ملز سے متصل ایک نئے شہر کی تعمیر بھی جاری ہے جس میں یہاں کے کام کرنے والے آباد ہوتے جارہے ہیں۔ اب تک ڈھائی سو خاندانوں کو رہائش کی سہولتیں مل گئی ہیں۔ چند ماہ ہوئے سوویت یونین کی بیرونی معاشی تعلقات کی ریاستی کمیٹی کے ڈپٹی چیرمین جناب و۔ا۔ سرگی ئیف کام کا جائزہ لینے یہاں آئے تھے۔ وہ منصوبے کے تعمیری مراحل سے بہت خوش تھے۔ کراچی میں ایک بڑی پریس کانفرنس میں انہوں نے اپنے دورے کے تاثرات پیش کرتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا اور کام کرنے والوں کو مبارک باد دی۔ مبتدیوں کو تربیت دے کر ماہر فن بنانے والے ادارے کے پرنسپل جناب وہاب صدیقی بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے کام کی رفتار پر روشنی ڈالتے ہوئے آئندہ کے لائحۂ عمل کی ایک جھلک دکھائی تھی۔ اس کارخانے میں ہر سال تقریباً گیارہ لاکھ ٹن وزنی لوہے اور فولاد کی مشینیں تیار ہوسکینگی۔ اس مقصد کے لئے سوویت حکومت پاکستان کو نرم شرائط پر قرضے اور امداد دے رہی ہے۔

جنوری ۱۹۷۸ء میں چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے ہنوز زیر تعمیر اس اسٹیل ملز کے متعدد حصوں کے تفصیلی دورے کے دوران سوویت ماہروں، انجینئروں اور مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آج کی دنیا میں قومیں ایک دوسرے کو ان کی ترقی

میں مدد دیتی ہیں۔ چنانچہ ہمارا دوست ملک سوویت یونین پچھلے چار سال سے اس ملز کی تعمیر کے لئے فنی امداد کی فراہمی میں ہماری اعانت کر رہا ہے، جس کے لئے ہم اس حکومت کے شکرگزار ہیں۔ جب کراچی اسٹیل ملز مزدوروں کی محنت سے بن کر تیار ہوجائیگا تو پاکستان ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن ہوگا۔ اس وقت یہ ملز پاکستان کی معیشت کا مضبوط ستون ثابت ہوگا''۔

انہوں نے اسٹیل ملز میں کام کی رفتار تیز تر کرنے کی غرض سے تعمیر گاہ پر افرادی قوت میں اضافہ کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے پاکستان میں روس کے سفیر جناب ایس۔ اے عظیموف سے درخواست کی کہ وہ ان کا شکریہ سوویت یونین کے رہنماؤں تک پہنچادیں۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے زور دے کر یہ بات کہی کہ مزدوروں کو چاہیے کہ اس اہم پروجکٹ کی تعمیر کو جس قدر جلد ممکن ہوسکے پورا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ انہوں نے کہا اس پلانٹ کا فولاد پاکستان کی قومی معیشت کی ترقی کی بنیاد بن جائیگا۔ اس موقع پر سوویت چیف انجینئر اے، آئی یومارنیکو نے انہیں کنورٹر پلانٹ کا موڈل اور تعمیراتی کام سے متعلق تصویروں کا ایک البم پیش کیا جسے انہوں نے بخوشی قبول کرلیا۔

پلانٹ کے فنی ڈیزائن اور پاکستانی ماہرین کے تیار کردہ تخمینوں کے مطابق پلانٹ کے چالو ہونے کے ابتدائی دور ہی میں

ملک کی پگ آئرن اور اسٹیل بلٹ کی ضروریات کافی حد تک پوری ہونے لگیں گی جس کی وجہ سے پاکستان کو ان کی برآمدات پر خرچ کی جانے والی رقم میں کمی کرنے کا اچھا موقع ملیگا۔ اس کے ساتھ ھی یہ بھی ملحوظ رکھنا چاھئیے کہ اس وقت ملز کے مختلف شعبوں میں کوئی پندرہ ھزار سے زیادہ افراد کام کر رھے ھیں۔ ایک معاشی سروے کے مطابق ۷۹-۱۹۷۸ء میں یہ اسٹیل ملز جزوی طور پر پیداوار شروع کردیگا اور پھر ۸۴-۱۹۸۳ء میں جب مکمل پیداوار حاصل ہونے لگیگی تو سال کی فروخت سے ایک اندازے کے بموجب کوئی پانچ ارب سولہ کروڑ اسی لاکھ رپے کی رقم حاصل ھوگی۔ نیز اس کی وجہ سے دو ارب، پچیس کروڑ، پچاس لاکھ رپے کے زرمبادلہ کی سالانہ بچت ھوگی۔ ملز کی بستی آٹھ ھزار، ایک سو، چھبیس ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ھوئی ھے۔ پہلے مرحلے کے طور پر کوئی پانچ سو خاندان اس بستی میں منتقل ھوچکے ھیں۔

ان تمام مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں حکومت اور عوام کی جانب سے سوویت یونین کی حکومت پر خلوص شکریہ کی مستحق ھے۔

میزبان خاتون کا برتاؤ

لیکن اس احسان کا مطلب یہ نہیں ھے کہ مجھے جہاز میں بیٹھنے کے لئے اگلی سیٹ نہ دی جائے اور میرے نام بک ہونے کے باوجود کسی روسی افسر کو دیدی جائے۔ میں نے احتجاج کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اور معاملات میں میزبان خاتون کا برتاؤ کس نوعیت کا رھتا ھے۔ مجھے یاد ھے کہ ۱۹۷۵ء میں جب میں امیر خسرو اور فارابی کے جشن میں شرکت

کرنے کے لئے ماسکو جارہا تھا تو وہ رمضان المبارک کے دن تھے۔ میں نے گھڑی دیکھ کر اور وقت کے فرق کا لحاظ رکھتے ہوئے سحری کرنے کا اندازہ لگایا اور ایئرو فلوٹ پر میزبان خاتون سے آب سنگترہ یا کوئی اور جوس مانگا تو اس نے کسی قدر بے رخی سے کہا کہ جہاز پر جوس نہیں ملتا۔ میں نے مجبوراً پانی کا گلاس نوش جان کر کے روزہ رکھ لیا۔ پھر جب ماسکو سے دوشنبہ گیا تو میں نے دیکھا کہ سخت سردی کی وجہ سے دو بچے ٹھٹھر رہے ھیں۔ بچوں کے باپ نے اپنا کوٹ اتار کر بچوں پر ڈال دیا اور خود اکڑتا رہا۔ جہاز پر کمبل نہیں تھے۔ ھوسکتا ھے کہ دن کے وقت پرواز کی صورت میں ان کی فراھمی ممکن نہ ھوتی ھو لیکن ھنگامی حالات میں ھر چیز کا اھتمام ضروری ھوتا ھے۔ تاھم اس بار ایئرو فلوٹ نے دوپہر کے وقت بڑی خاطر داری کی۔ عمدہ قسم کا لنچ دیا گیا لیکن میں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ عرصۂ دراز سے میری عادت ھے کہ میں دن کو ھلکا ناشتہ کرتا ھوں اور کچھ نہیں کھاتا۔ صرف رات کا کھانا میرے لئے کافی ھے۔ میں زندہ رھنے کے لئے کھاتا ھوں، کھانا کھانے کے لئے زندہ نہیں ھوں۔ زیادہ کھانے سے میری مصروفیات میں اور میرے مشاغل میں خلل پڑتا تھا، اس لئے میں نے اس میں خاطر خواہ کمی کردی۔ میں دوپہر کو کچھ نہ کھانے سے زیادہ چاق و چوبند رھتا ھوں۔ صبح میں آب فواکہ اس لئے پیتا ھوں کہ علی الصبح ٹینس کے دو سیٹ کھیل لینے کے بعد پیٹ میں کچھ نہ کچھ چلا جانا چاھئے۔ لہذا جب میزبان خاتون میرے لئے لنچ لائیں تو میں نے شکریہ کے ساتھ اسے واپس کردیا۔ انھوں نے پوچھا کہ پینے کے لئے

کچھ لاؤں ؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں کوئی ٹھنڈا مشروب اور ممکن ہو تو دودھ۔ انہوں نے تعجب سے مجھے دیکھا۔

تہران میں عارضی قیام

تین گھنٹے کی اڑان کے بعد روسی جہاز ایران کے صدر مقام تہران پر اترا۔ آج سے چند سال قبل ایران پہنچ کر دل بہت خوش ہوتا تھا۔ یہ حافظ و سعدی، خیام اور نظامی کی سر زمین ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ یہیں لکھا گیا تھا۔ بوعلی سینا نے اپنے طبی تجربات اسی جگہ رہنے والوں پر کئے تھے۔ قرۃ العین کے نغمے اب بھی یہاں کی فضا میں گونجتے ہیں۔ ایران علاقائی تعاون کے ادارے میں پاکستان اور ترکی کا شریک رکن ہے۔ لیکن یہ تعاون اب صرف زیب داستان بن گیا ہے۔ ایران کو صرف اپنی سر زمین سے محبت ہے۔ پڑوسی ملکوں سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ اس ملک کی بے اندازہ دولت نے اور شاہ کے ذاتی مزاج نے ان کو احساس برتری میں مبتلا کردیا ہے۔ پاکستان کے ساتھ شاہ کا برتاؤ اس خلوص پر مبنی نہیں ہے جو صدر پاکستان ایوب خاں کے زمانے میں وافر تھا۔ وہ صدر ایوب سے درخواست کیا کرتے تھے کہ ہوائی جہاز میں ذرا تہران سے ہوکر گزر جائیے۔ اس سے میرے ملک کو استحکام نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ جب بھٹو ایران گئے تو ان کی آمد کی خبر اخبار کیہان نے آخری صفحے پر دی اور لکھا کہ بھٹو بھوکے پاکستانیوں کے لئے کھانا لینے آئے ہیں۔ اخبار نویس ہوا کے رخ کے ساتھ ساتھ سربراہ مملکت کے مزاج کا رنگ دیکھتے ہیں اور اسی انداز کی

باتیں کرتے ہیں۔ پاکستانیوں کے ساتھ شاہ کا سلوک اہانت آمیز ہے، جب ہی تو ایک اخبار نویس کو یہ الفاظ لکھنے کی جرأت ہوئی۔ تہران کا ہوائی اڈا اور میدان زرد دولت کی کرشمہ سازیوں کا مظہر ہے۔ یہ دولت کا غلط استعمال ہے۔ لیکن سب فرمانروا ایسا نہیں کرتے۔ سعودی عرب کے فرمانرواؤں نے بھی تیل سے بڑی دولت کمائی لیکن حاجیوں کے آرام و سہولت اور خانۂ خدا کی آرائش و تزئین کے لئے جو کچھ کیا وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ ایران کا خیال ہے کہ وہ پانچ چھ سال میں مشرق وسطیٰ کی سب سے بڑی طاقت ہوگا۔ رستم و سہراب اور افراسیاب کی داستانیں اب طاق نسیاں کی زینت بن چکی ہیں۔ سر زمین ایران نے کوئی دوسرا فردوسی پیدا نہیں کیا ہے۔ اس لئے شاہ کے خواب کی تعبیر کوئی نیا طلسم سامری ہی برلاسکتا ہے۔ ان تاثرات کے ہوتے ہوئے تہران کے ہوائی اڈے پر اترتے وقت اس دفعہ مجھے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔

تھوڑی سی کوفت اس لئے بھی ہوئی کہ آدھی رات بلکہ صبح کاذب کے وقت تمام مسافروں کو جہاز سے اتار کر ٹرانزٹ لاؤنج میں لے جانا بڑی زیادتی تھی۔ دوسری بین الاقوامی کمپنیاں ایسا نہیں کرتیں۔ سوچنے کی بات ہے۔ عارضی قیام صرف پینتالیس منٹ کے لئے تھا۔ جہاز سے اترنے اور کمرۂ انتظار تک جانے میں دس منٹ صرف ہوگئے اور اتنا ہی وقت واپس آنے اور جہاز پر دوبارہ سوار ہونے میں لگ گیا۔ اس طرح لاؤنج مس بیٹھنے کا عرصہ بیس یا پچیس منٹ کے برابر تھا۔ یہ زحمت آخر کیوں دی گئی۔ سب مسافر جہاز ہی میں بیٹھے رہتے تو کیا ہرج تھا۔ اندر کسی جھاڑ

پونچھ یا صفائی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ کیا مقصد یہ تھا کہ مسافر تہران میں ہوائی اڈے کی انتظار گاہ دیکھ لیں۔ وہاں جو آرائشی سامان تھا اس پر کسی نے اچٹتی ہوئی نظر بھی نہیں ڈالی ہوگی۔

ماسکو میں

پون گھنٹے بعد سفر دوبارہ شروع ہوگیا اور چند ساعت گزرنے پر منزل مقصود آگئی۔ جب پاکستان میں صبح کے پونے دس بجے تھے ماسکو میں پونے آٹھ بجے کا عمل تھا۔ ایک دم اعلان ہوا کہ ہوائی جہاز ماسکو کے ہوائی میدان پر اترنے والا ہے۔ میں حیران تھا کہ بڑی طویل مسافت بہت جلد طے کرلی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایئرو فلوٹ کے طیارے نسبتاً زیادہ تیز رفتار ہوتے ہیں۔ عرصۂ دراز سے سوویت یونین کی طیارہ سازی کی صنعت میں ترقی کا رجحان اس طور پر ہے کہ زیادہ مسافر اور زیادہ سامان کو لے جایا جائے اور فضائی حمل و نقل کی رفتار بڑھتی رہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان کو آواز سے زیادہ تیز رفتار طیاروں کی ضرورت ہے؟ کیا اس تیز رفتاری سے اس کی صحت پر کوئی برا اثر پڑسکتا ہے؟ ماسکو سے الما عطا یعنی کزاخستان کے دارالحکومت کے راستے پر ٹی۔یو ۱۴۴ نامی طیارہ باقاعدہ اڑایا گیا۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ آواز سے کم رفتار کے ہوائی جہازوں کے مقابلے میں اس پر سفر کرنا زیادہ خوشگوار ہے۔ اس میں جھٹکے نہیں لگتے اور پرواز کے وقت میں ۶۶ تا ۷۰ فیصد تک بچت ہوجاتی ہے۔ اس طیارے کی رفتار ڈھائی ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ ہے اور ایک ہوائی جہاز اپنی

زندگی میں تیس ہزار گھنٹے پرواز کر سکتا ہے ۔ بالفاظ دیگر اس مدت میں ٹی ۔ یو ۱۴۴ زمین سے چاند تک کے فاصلے کو تقریباً دو سو اسی بار عبور کرلیگا ۔ اس کے بعد سپر سونک پروازوں کا سلسلہ شروع ہوگا ۔ آخری منزل نہ جانے کہاں ہوگی !

ماسکو میں کئی ہوائی مستقر ہیں لیکن یہ چار سب سے زیادہ مصروف رہتے ہیں :

(۱) شیریمت یے وو ۔ (۲) ونو کووو ۔ (۳) بائی کووو ۔ (۴) ڈوموڈی ڈووو ۔ ان میں سے موخر الذکر دو دوسری جنگ عظیم کے دوران تعمیر ہوئے تھے کہ جب ہوائی نقل و حمل کی رفتار تیز تر ہوگئی تھی ۔ فوجیوں کو اور فوجی ساز و سامان کو ان ہوائی اڈوں سے لیجانا اور لانا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا جو شہری پروازوں کے کام آتے تھے ۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد ان کو قائم رکھا گیا ۔ البتہ وہ سامان کی بار برداری کے لئے مخصوص کردئے گئے ۔ ان پر مسافر بردار جہاز بھی اترتے ہیں ۔ لیکن مسافروں کی زیادہ آمد و رفت اول الذکر دو ہوائی اڈوں پر رہتی ہے ۔ ان دونوں پر روزانہ تقریباً دو لاکھ مسافر اترتے چڑھتے ہیں ۔ اس ضمن میں اوسطاً ڈیڑھ ہزار چھوٹے بڑے جہاز ، جن میں غیر ملکی ہوائی جہاز بھی شامل ہیں ، یہاں اترتے یا پرواز کرتے ہیں ۔ ان سب اڈوں پر فضائی پرواز سے متعلق ہر قسم کی سہولتیں میسر آسکتی ہیں ۔ ان اڈوں سے وسیع شہر کے مختلف حصوں میں پہنچنے کے لئے سڑکوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جن کی دیکھ بھال خاطر خواہ انداز میں کی جاتی ہے ۔

میں جہاز سے باہر آیا تو سفارت خانۂ پاکستان کے دو

نمائندوں کو وہاں موجود پایا۔ ایک اقبال صاحب تھے جو مجھے لینے آئے تھے۔ دوسرے منظر شفیق صاحب تھے جو نائب، سفیر احمد کمال صاحب کو لینے آئے تھے۔ میں نے احمد کمال صاحب کو جہاز پر پرواز کے دوران نہیں دیکھا تھا، حالانکہ میں ان سے واقف ضرور تھا۔ خیر وہ اترے تو میں ان سے ملا۔ کچھ عرصے پہلے وہ پیرس میں تھے۔ وہ یونیسکو سے متعلق نیشنل کمیشن اور خود یونیسکو سے تعلق رکھتے تھے۔ میں کئی بار پیرس گیا لیکن وہاں ان سے کبھی شرف ملاقات حاصل نہ ہوا تھا۔ اب وہ ماسکو میں سفارت خانۂ پاکستان میں نائب سفیر (ناظم الامور) ھیں۔ ان کی طرف سے میرا ذھن صاف نہیں تھا کیونکہ وہ پیرس میں ایک بار مجھے وقت دے کر بھی نہیں ملے تھے۔ خصوصاً اس وقت کہ جب میں یونیسکو کے افسران سے ان کے ماھنامہ کوریئر کا اردو ایڈیشن پاکستان سے نکالنے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کر رھا تھا، ان کو موجود ھونا چاھئے تھا۔ وہ اس موقع پر نہیں آئے۔ البتہ ان کے سکریٹری جناب آفریدی نے مذاکرات میں شرکت کی تھی۔ خیر آج ان سے ملاقات ھوگئی۔ میں نے اخلاقاً ان کی بیگم صاحبہ کو بھی سلام کرلیا مگر انہوں نے جواب عطا نہیں کیا جو اسلامی معاشرے میں ضروری ھوجاتا ھے۔ منظر شفیق صاحب نے فرمایا:

"حکیم صاحب! آپ کی تشریف آوری کی ھمیں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ نہ آپ کے پروگرام کا ھمیں کوئی علم ھے"۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ دل ھی دل میں کچھ پریشان سے تھے کہ اب ان کو میرے لئے کوئی زحمت اٹھانی پڑیگی۔ میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ ذرا بھی پریشانی کی ضرورت نہیں ھے

کیونکہ وزارت خارجہ روس کا کوئی نہ کوئی نمائندہ میری پذیرائی کے لئے یہاں موجود ہوگا اور ان ہی کو میرا انتظام کرنا ہے۔ انہیں اس وقت تک بے چینی رہی جب تک کہ مس مارگریٹا وی آئی پی روم میں نہ آگئیں۔ وہ مجھے لینے آئی تھیں۔ بہت خندہ پیشانی سے ملیں۔ وہ اردو خوب بولتی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ۱۹۶۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے کے لئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کے شاگردوں میں شامل تھیں۔ مجھے یہ سن کر تھوڑی سی مایوسی ہوئی کہ سفیر پاکستان جناب سجاد حیدر صاحب ، جن کو میں نے اپنی روانگی سے قبل مطلع کردیا تھا ، اپنی اہلیہ محترمہ روح افزا بیگم صاحبہ کو ساتھ لے کر فن لینڈ کے سرکاری دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اقبال صاحب نے بتایا کہ سفیر صاحب نے آپ کی پذیرائی کے لئے مجھے پوری طرح ہدایات دی ہیں۔ آپ ان کے گھر بھی قیام کرسکتے ہیں۔ ان کی موٹر بھی حاضر ہے۔ جناب محترم اقبال صاحب نے یہ بات اس وقت بتائی کہ جب مس مارگریٹا آگئیں اور انہیں پتہ چل گیا کہ اب ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کام سے ہمارے سفارتی نمائندے عموماً گھبرایا ہی کرتے ہیں۔

ہوٹل یوکرائن میں

ہوائی میدان کی روایتی کارروائیاں جلد ہی ختم ہوگئیں اور میں باہر نکل آیا۔ میرا سامان بھی لا کر موٹر میں رکھ دیا گیا جو روسی وزارت خارجہ نے بھیجی تھی۔ احمد کمال صاحب اپنے سفارت خانے کی موٹر میں روانہ ہوگئے۔ اقبال صاحب مجھے چھوڑنے

کے لئے ہوٹل تک آئے۔ میرا قیام سرکاری طور پر ہوٹل یوکرائن میں کیا گیا تھا۔ بڑی پر شکوہ عمارت ہے۔ ماسکو میں بہ شمول ماسکو یونیورسٹی ایسی شاندار دس عمارتیں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے بعد جرمن قیدیوں نے ان دس عمارات کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ مس مارگریٹا نے سچ کہا کہ جو لوگ ہماری آزادی کو تاخت و تاراج کرنے آئے تھے کیا ان کو اتنی سزا بھی نہ دی جاتی کہ وہ ان عمارتوں کی تعمیر میں ہاتھ بٹائیں۔

شروع میں روس بہت بڑا ملک نہیں تھا۔ قرب و جوار کے چھوٹے چھوٹے علاقے، جن کو ریاستوں کی حیثیت حاصل تھی، رفتہ رفتہ اس ملک سے الحاق کرتے رہے اور اس طرح سوویت یونین وجود میں آگئی۔ اس وقت پندرہ ریاستی جمہوریتیں سوویت وفاق میں شامل ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

روسی سوویت وفاقی اشترا کی جمہوریہ (روس) یوکرین سوویت اشترا کی جمہوریہ (یوکرین) بائلو روسی سوویت اشتراکی جمہوریہ (بائلوروس یعنی سفید روس) ازبک سوویت اشتراکی جمہوریہ (ازبکستان) کزاخ سوویت اشتراکی جمہوریہ (کزاخستان) جارجیائی سوویت اشتراکی جمہوریہ (جارجیا) آذربائجان سوویت اشتراکی جمہوریہ (آذربائجان) لتھونیائی سوویت اشتراکی جمہوریہ (لتھونیا) مولداویائی سویت اشتراکی جمہوریہ (مولداویا) لت ویائی سوویت اشتراکی جمہوریہ (لت ویا) کرغز سوویت اشتراکی جمہوریہ (کرغزیہ) تاجک سویت اشتراکی جمہوریہ (تاجکستان) آرمینی سوویت اشتراکی جمہوریہ (آرمینیا) ترکمانی سوویت اشتراکی جمہوریہ (ترکمانیہ) استونیائی سوویت اشتراکی

جمہوریہ (استونیا)۔ ان کے علاوہ بیس خود مختار جمہوریتیں، آٹھ خود مختار علاقے اور دس قومی علاقے بھی شامل ہیں۔ سوویت یونین میں سو سے زیادہ قومیں اور قومیتیں آباد ہیں۔ بے دین لوگوں کے علاوہ تقریباً پانچ مذاہب کے ماننے والے بھی یہاں رہتے ہیں جن کو اپنے مذہبی فرائض کی ادائی میں شخصی آزادی حاصل ہے۔ سوویت یونین میں ریاستی اقتدار کا اعلیٰ ترین ادارہ سوویت یونین کی سپریم کونسل ہے۔ تمام جمہوریتوں اور علاقوں کو اس کونسل میں براہ راست نمائندگی ملتی ہے۔ انتظامیہ کا اعلیٰ ترین ادارہ یونین کی مجلس وزراء ہے۔ اس کی تشکیل یونین کی سپریم کونسل کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے۔

اس سلسلۂ خیال کی کڑیاں ہوٹل یوکرائن سے ملتی ہیں جہاں میرے قیام کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ ہوٹل درحقیقت مغربی سیلانیوں اور سیاحوں کی رہائش کا مرکز بنتا ہے۔ لیکن ان دنوں اور بھی غیر معمولی گہما گہمی تھی کیونکہ وہاں سوشلسٹ پارٹی کا سالانہ جلسہ ہورہا تھا۔ اس لئے اس سیاسی جماعت کے سبھی اراکین جو یقیناً اہم مراتب کے حامل کہے جاسکتے ہیں، وہاں مقیم تھے۔ یوں بھی ماسکو میں سیاحوں کا موسم تھا۔ مغرب کے لوگ جوق در جوق آرہے تھے۔ ہوٹل میں بالکل گنجائش نہیں رہی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو استقبالیہ پر خاصی دیر لگی کیونکہ عین اس وقت ڈیوٹی بدلنے والی تھی۔ موجودہ خاتون نے مجھ سے کہا:

”ذرا توقف فرمائیے۔ اگلی ڈیوٹی پر آنے والی خاتون آپ کو کمرہ الاٹ کردینگی۔ اصولی طور پر آپ کی بکنگ ہوگئی ہے“۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ وہ خاتون مجھ سے اردو

اور دوسروں سے روسی زبان بول رہی تھیں۔ ان میں شائستگی کے ساتھ ساتھ انتہائی سادگی تھی۔ اقبال صاحب نے چپکے سے بتایا کہ یہاں تنخواہ سب کے لئے یکساں ہے، یعنی نقد صرف آسی روبل ملتے ہیں۔ باورچی اور خانساماں کو بھی، استقبالیہ خاتون کو بھی اور منیجر کو بھی۔ یہ بات میرے لئے بالکل نئی تھی، اس لئے کسی قدر تعجب خیز تھی۔ اس میں اچھائی تھی اور برائی بھی۔

چند منٹ بعد دوسری خاتون نے چارج لے کر مجھے اوپر کی ایک منزل پر کمرہ نمبر ۵۶۱ الاٹ کردیا۔ میں لفٹ کے ذریعہ سے اوپر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ ابھی خالی ہوا ہے، اس لئے صفائی نہیں ہوئی اور پوری طرح آراستہ نہیں ہے۔ مجھ سے درخواست کی گئی کہ چند منٹ برآمدے میں انتظار کروں، جہاں صوفے بچھے ہوئے تھے۔ مس مارگریٹا کچھ بے چین سی نظر آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرہ صاف اور آراستہ ہوگیا اور میں اس میں سما گیا۔

گاہے گاہے بازخواں۔۔۔۔

یادش بخیر ۱۹۷۵ء میں جب میں امیر خسرو دہلوی کے جشن میں شرکت کے لئے اس سر زمین پر پہنچا تھا اور جمیل الدین عالی صاحب میرے ساتھ تھے تو ہمارے قیام کا اہتمام "ہوٹل نیشنل" میں کیا گیا تھا جیسا کہ میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں۔ عالی صاحب اچھی رنگین طبیعت کے مالک ہیں، اور کیوں نہ ہوں، شاعر جو ٹھیرے۔ پائے کے شاعر اور ہندی انداز کے دوہے لکھنے والے شاعر۔ اس دوران قیام میں ہم ایک روز ہوٹل کے رستوران میں چلے گئے۔ یہ امریکی انداز کا میخانہ بھی تھا۔ عالی صاحب کی رگ

ظرافت

[redacted] پڑی مگر انہوں نے ہوٹل کی میزبان کو بلا کر اپنے لئے مشروب سادہ کا آرڈر دیدیا ۔ وہ جانتے تھے کہ میں اس شغل سے اپنے آپ کو محروم رکھتا ہوں ۔ میں نے اسے امریکی انداز کا میخانہ اس لئے کہا کہ وہاں بل امریکی ڈالر میں ادا کیا جاتا ہے ۔ روسی روبل قبول نہیں کئے جاتے ۔ کتنی عجیب سی بات ہے ۔ میں نے اپنے لئے ایک گلاس جوس منگا لیا تھا ۔ یہ جوس شاید گریپ فروٹ کا تھا ۔ تلخی بہت تھی مگر میرے لئے اس میخانے کے ماحول کی تلخی کیا کم تھی ۔ اس تلخی میں ایک اور اضافہ اس لئے ہوا تھا کہ عالی صاحب کے پہلو میں ایک روسی جوان خاتون آ کر بیٹھ گئی اور اس نے بلا تکلف عالی صاحب کی بانہہ میں اپنی بانہہ ڈال دی اور بڑے انداز میں کہا کہ مجھے بھی ایک جام عطا ہو سرکار ! عالی صاحب نے مجھے دیکھا ۔ میں نے اردو زبان میں ان کو اشارہ کردیا ۔ میں نے کہا کہ وہ تنہا نہیں تھی ۔ ایک اور فاحشہ اسکے ساتھ تھی اور دور بیٹھی ہمارے تاثرات کا جائزہ لے رہی تھی ۔ جوس کی تلخی نے مجھے ماحول کا جائزہ لینے میں مدد دی تھی ۔ عالی صاحب نے میری بات مان لی تھی ، مگر وہاں سے ہمیں اٹھ جانا پڑا کہ وہ عورت ہر لمحہ عالی صاحب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی اور کوئی حادثہ فاجعہ پیش آجانے کا خطرہ غالب آچلا تھا ۔ میں نے وہاں سے اٹھنے سے پہلے منہ کا مزا ٹھیک کرنے کے لئے آئس کریم منگالی تھی اور عالی صاحب نے '' بیضۂ مچھلی '' (کے ویر) جو بڑی قیمتی چیز ہے ، ٹوسٹوں پر لگا کر نگلنے شروع کردئے تھے ۔ عالی صاحب نے مجھے گواہ بنانا چاھا کہ فیض احمد فیض صاحب جیسے روسی المزاج پاکستانی دعوا کرتے ہیں کہ

روس میں فحاشی ختم کردی گئی ہے ، عصمت فروشی بالکل نہیں ہوتی۔ اب بتائیے کہ یہ عورتیں کون تھیں۔ میں انکی گواہی دینے کے لئے تیار ہوگیا کہ وہ طوائفیں تھیں۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ شادی نہیں ہوئی تو کیا ، باراتیں تو بہت سی دیکھی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ عیاشی کرنے کے بعد ہی عیاش مزاج لوگوں کو سمجھا جائے۔

اقبال صاحب کی رائے ہوئی کہ میں مس مارگریٹا کو ایک بجے تک کے لئے رخصت کردوں تاکہ یہ " رپورٹنگ " وغیرہ کرلیں۔ میں نے ان کی بات مناسب سمجھی۔ اندازہ یہ ہوا کہ خود مارگریٹا بھی یہی چاہتی تھیں۔ گو رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے میں ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کرنا چاہتا تھا مگر اقبال صاحب کا مشورہ تھا کہ میں ان کے ساتھ چل کر " پانوراما " کی سیر کرلوں۔ میرے کان کھڑے ہوئے۔ ریاست ہائے متحدہ کی حکومت پاکستانی قارئین کے لئے انگریزی زبان میں ایک ماہنامہ " پانوراما " اور اردو زبان میں " سیر بین " شائع کرتی ہے۔ لیکن یہاں مطلب دوسرا تھا۔ لہذا میں آمادہ ہوگیا۔ البتہ غسل کر کے تازہ دم ہوجانا ضروری تھا۔ میں بارہ مہینے ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کا عادی ہوں ، خواہ اپنے وطن میں رہوں یا چین ، روس ، جاپان میں۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔ لوگوں کو میرے اس معمول پر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن میری بچپن سے یہی عادت رہی ہے۔

پانوراما کی سیر

سفارت خانے کی موٹر موجود تھی۔ اقبال صاحب مجھے

پانوراما لے گئے ۔ ایک وسیع عمارت کو تاریخی واقعات سے سجایا گیا تھا ۔ فرانس کے مرد آھن نپولین بونا پارٹ نے ۱۸۱۲ء میں روس پر حملہ کیا تھا ۔ اس وقت ایک روسی جرنیل نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں بیٹھ کر دوسرے جرنیلوں اور کمانڈروں کو ھدایت کی تھی کہ نپولین کی فوجوں کو ماسکو میں بے روک ٹوک داخل ہونے دیا جائے اور اپنی فوجیں احتیاط کے ساتھ شہر کے چاروں طرف پھیلادی جائیں ۔ اس طرح محاصرہ کر لینے کے بعد دائرہ رفتہ رفتہ تنگ کیا جائے اور فرانسیسی فوجوں پر قابو پالیا جائے یا انہیں شکست خوردہ حالت میں مراجعت کے لئے مجبور کیا جائے ۔ چنانچہ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور نپولین کی فوجیں بہت سی توپوں ، فوجی گاڑیوں اور جنگی ساز و سامان کو چھوڑ کر فرار ہوگئیں ۔ پانوراما میں وہ سامان محفوظ کر کے نمائش کے لئے رکھا گیا ھے اور میدان جنگ کی نقشہ کشی اس طرح کی گئی ھے کہ سارے مناظر کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ھے ۔ میدان جنگ کو حقیقت سے قریب تر دکھایا گیا ھے ۔ یہ معلوم ھوتا ھے کہ سچ مچ کی لڑائی ھورھی ھے ۔ فوجیوں کے پتلے بر سر پیکار ھیں ۔ کہیں کہیں مصوروں نے بھی اپنے کمالات دکھائے ھیں ۔ یہ سیر بہت دلچسپ اور معلومات افزا رھی ۔

ساڑھے بارہ بجے اقبال صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے ۔ ان کی اھلیہ اور دو بچے بڑے تپاک سے ملے ۔ ان کا ایک بچہ اسپتال میں داخل ھے ۔ اس کی ایک آنکھ میں قرنیہ پر زخم ھوگیا ھے ۔ ڈاکٹروں کی تجویز پر بچے کی ماں کا خون نکال کر زخم کے قریب اس کے دو انجکشن لگائے گئے ۔ یہ طریق علاج نہ جانے کیا ھے ۔

میں نے زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ روس میں علاج اور جراحی کے طریقے بہت ترقی کر گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ کوئی نئی دریافت ہو۔

ماسکو کے جس مکان میں سفارتی ارکان رہتے ہیں وہاں باہر پولس کی چوکی لازماً ہوتی ہے۔ وہ یہاں ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھتے ہیں۔ ذرا سا شبہ ہوجائے تو پوچھ گچھ شروع کردیتے ہیں۔ سفارتی نمائندوں پر بھی پابندیاں ہیں۔ وہ وزارت داخلہ کی اجازت کے بغیر ماسکو کی مقررہ حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ اس اعتبار سے روس بڑا مشکل ملک ہے۔ سفیروں سے وہاں کے لوگ کوئی ربط ضبط رکھ ہی نہیں سکتے۔ میں ۱۹۷۵ء میں یہاں آیا تو بابا جان غفوروف میرے ساتھ ساتھ پاکستانی سفارت خانے میں آگئے تھے۔ ان کی ہمت قابل داد ہے۔ ایسی جرات کوئی نہیں کرسکتا۔ یا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ اور با اثر شخصیت کی وجہ سے مستثنیٰ سمجھے گئے ہوں۔

آدھ گھنٹے بعد یعنی تقریباً ایک بجے اقبال صاحب نے مجھے واپس لا کر ہوٹل یوکرائن چھوڑ دیا۔ یہاں مس مارگریٹا میری منتظر تھیں۔ میں نے اقبال صاحب کا شکریہ ادا کیا اور انہیں رخصت کردیا۔ پھر میں مس مارگریٹا کے اصرار پر ان کے ساتھ ہوٹل کے ڈائننگ روم میں چلا گیا، جہاں میں نے ناشتے کے انداز میں کچھ کھا پی لیا، کیونکہ میں دوپہر کو ناشتے کا عادی ہوں۔ مس صاحبہ نے کھانا نوش جان کیا۔ بل انہوں نے ادا کردیا۔ ان کو سرکاری طور پر ہدایت تھی کہ میرا سارا خرچ وہ برداشت کریں۔

مصنفین کی انجمن

اس کے بعد پتہ چلا کہ چار بجے میری ملاقات دفتر متعلقہ میں ہے۔

شعبۂ تعلقات عامہ کے ماتحت روسی مصنفین اور غیر ملکی مصنفین کی ایک انجمن قائم ہے۔ ماسکو میں اس کا صدر دفتر ہے اور دوسرے شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ اسی شعبے کے ماتحت دوسرے ملکوں میں روسی دوستی کی انجمنیں قائم ہیں۔ روس کے شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور صحافی ان انجمنوں میں برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ دفتر میں قائم شدہ لائبریریوں سے استفادہ کرتے اور آپس میں تبادل خیال کرتے ہیں۔ ماسکو میں انجمن کے دفتر کی نگران مادام مریم سلگانک لےوونا ہیں۔ وہ بہت اچھی انگریزی بولتی ہیں۔ ذرا کوشش کر کے اردو بھی بول لیتی ہیں۔ کچھ عرصے پاکستان میں رہ چکی ہیں۔ مگر زیادہ عرصہ انہوں نے ہندوستان میں گزارا ہے۔ ہم وہاں وقت سے ذرا پہلے پہنچ گئے تھے۔ اس لئے چند منٹ انتظار کرنا پڑا۔ لیکن ٹھیک چار بجے ملاقات ہوگئی۔ کمرۂ ملاقات مصنفین کی بڑی عمارت میں ہے جہاں اس وقت بڑی چہل پہل تھی لیکن بہت سے لوگ مشکل سے اهل قلم لگتے تھے۔ مادام مریم سلگانک سے اور ان کے رفقائے کار سے بات چیت شروع ہوئی جو دلچسپ اور معلومات افزا تھی۔ معلوم ہوا کہ ان کے پاس میرا بایو ڈیٹا (حالات زندگی) نہیں ہے۔ میرے بریف کیس میں چھپی ہوئی چند کاپیاں موجود تھیں۔ میں نے فوراً ایک کاپی ان کو دیدی۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ وہ

میرے بارے میں اخبارات میں تعارفی نوٹ چھپوانا چاھتی تھیں۔ اس سے سہولت ھوگئی۔ صدرالدین عینی سے متعلق میرے مقالے کا ذکر آیا تو میں نے ان کو بتادیا کہ میں کراچی سے چھپوا کر اپنے ساتھ لایا ھوں۔ اس سے ان کو بڑا اطمینان ھوا۔ ان کا خیال تھا کہ میرے پاس ایک مسودہ ھوگا اور تقسیم کرنے کے لئے انہیں ٹائپ کرانا ھوگا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اس کا ترجمہ روسی زبان میں فوراً کر کے طبع کرائینگی۔ اس لئے تقاضہ کیا کہ میں اس کی ایک کاپی وقت سے پہلے انہیں پہنچادوں۔ میں نے وعدہ کرلیا۔ مس مارگریٹا نے اشارتاً کہا کہ وہ اس کا اھتمام کردینگی۔

مادام کام میں بڑی مستعد اور ھر چیز سے باخبر رھتی ھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ روسی مصنفین کا ایک وفد پاکستان جانے والا تھا۔ وہ اسی مہینے کسی تاریخ تک وھاں پہنچیگا۔ انہوں نے بتایا کہ اس وفد کے قائد پر حملۂ قلب ھوگیا ھے اور معالجین نے ان کے لئے طویل بیرونی سفر غیرموزوں قرار دیدیا ھے۔ اس لئے اب وفد اس ماہ کی بجائے اکتوبر یا نومبر میں جائیگا۔ وفد کے پروگرام کے لئے پاکستان کی وزارت تعلیم نے مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ چنانچہ کراچی کا پروگرام میں نے تیار کر کے ان کے حوالے کردیا تھا۔

ایوان دوستی کے تحت ماسکو میں سوویت پاکستان ثقافتی انجمن کی داغ بیل ۲۳ مارچ ۱۹۶۶ء کو ڈالی گئی تھی۔ اس تاریخ کو انجمن اپنی سالگرہ مناتی ھے۔ اس موقع پر پاکستان کے ادب کے بارے میں مقالے پڑھے جاتے ھیں۔ روسی زبان میں بعض منتخب چیزوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ھے۔ چنانچہ اب تک علامہ اقبال

اور غالب کے کلام میں سے متعدد چیزوں کے ترجمے سامنے آچکے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی کہانیوں اور ڈراموں پر بھی طبع آزمائی ہوئی ہے۔ حال کے شاعروں اور ادیبوں میں سے فیض احمد فیض، ادا جعفری اور احمد ندیم قاسمی روس میں مقبول ہیں۔ اسی انجمن کے تحت کبھی کبھی پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کو ماسکو آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ چنانچہ انجمن کی پہلی سالگرہ پر ۱۹۶۷ء میں جناب ابراهیم جلیس کو دعوت دی گئی تھی۔ ان کی چند کہانیوں کے ترجمے روسی زبان میں ہوچکے ہیں۔ اس موقع پر جلیس صاحب نے اپنی ایک کہانی اردو زبان میں سنائی جس کا ترجمہ روسی زبان میں سامعین کو سنایا گیا۔

ڈاکٹر قریشی کے تجربات

اس انجمن کا دائرہ ادب اور شعر تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ ثقافتی روابط کے دوسرے پہلوؤں تک پھیل جاتا ہے۔ اس کے دائرے میں تاریخ، سیاست اور تجارت تک کو سمولیا جاتا ہے۔ چنانچہ کراچی یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس انجمن کے زیر اہتمام بلائے گئے تھے۔ چونکہ ان کی پہلو دار شخصیت بڑی ہمہ گیر ہے، اس لیے وہ ماسکو کے علاوہ لینن گراڈ، جارجیا، آذر بائجان، تاجکستان اور ازبکستان بھی گئے اور ہر جگہ ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ، فلسفیوں اور سائنسدانوں سے نیز اپنے مشاغل حیات کے اعتبار سے ماہرین تعلیمات سے بھی ملاقات کی۔ کچھ اپنے تجربات بیان کئے، کچھ ان کے تجربات سے استفادہ کیا۔ انہوں نے ہر جگہ طلبہ کی

تعلیمی ترقیوں اور سرگرمیوں کے اعداد و شمار بھی جمع کئے ۔ جب ڈاکٹر صاحب سے ان کی واپسیٔ وطن سے قبل ان کے دورے کے تاثرات کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا :

” مجھے یہ کہنا چاہئے کہ میں اپنے دورے سے بالکل مطمئن ہوں ۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ نہ صرف سائنسداں اور افسران حکومت نے بلکہ عام لوگوں نے بھی میرا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا ہے ۔ آپ نے صنعت اور تعلیم میں مثالی کامیابیاں حاصل کی ہیں ۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ معاشی ترقی کی اعلیٰ سطح کے حصول کے بعد بھی آپ نے اس قومی ثقافت کی روایتی شکلوں کو برقرار رکھا ہے جسے ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں ، کیونکہ ہماری اس کے ساتھ وابستگی ہے ۔ میں نے بیلے رقص اور اوپیرا سے لطف اٹھایا لیکن تاجکستان کے جدید شعرا کو میں نے سب سے زیادہ پسند کیا ۔ خصوصاً اس علاقے میں مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے ہی وطن میں ہوں ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان اور وسطی ایشیا کے درمیان صدیوں سے قریبی ثقافتی تعلقات قائم ہیں ۔ انگریزوں نے ہمارے ان روابط کو توڑ دیا تھا ۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو نئی زندگی بخشیں “۔

ایک اور سوال کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا :

” آپ کے بہت سے سائنسداں پاکستان میں گہری دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں ۔ انہوں نے پاکستان کی تاریخ ، معیشت اور ثقافت کے مطالعہ میں نمایاں ترقی حاصل کی ہے ۔ آپ کے بہت سے سائنسدانوں کو فارسی اور اردو زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہے ۔ آپ کے مستشرقین صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دے رہے ہیں

بلکه وه دونوں ممالک کے درمیان دوستانه تعلقات میں اضافے کے لئے بھی کام کر رہے ھیں ۔ اور میرا خیال ھے که معلومات ، ادب اور سائنسی دریافتوں کے تبادلے سے اس کام کو فروغ نصیب ھوگا ،،۔

انھی دنوں سوویت پاکستان ثقافتی انجمن کے زیر ایوان مشہور سوویت شاعر میخائیل لوکونن دورۂ پاکستان پر آئے تھے ۔ جب وه وطن واپس جانے لگے تو ان سے چند استفسارات کئے گئے ۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا :

,, لاھور ، ملتان ، راولپنڈی اور کراچی میں متعدد مہمان نواز ملاقاتیں اس قدر دلچسپ رھیں که انھوں نے مجھے فکرسخن کے لئے اور دونوں ممالک کے شعراء کے درمیان تعلقات کے لئے تازه عمده مواد فراھم کردیا ۔ مجھے ایسا محسوس ھوا که جیسے میں نے کسی خاص قوت سامعه کی مدد سے اردو ، سندھی اور پشتو شاعری کی نبض کو محسوس کیا یا اس کا ادراک کیا ھو ۔ حالانکه میں ان زبانوں کو نہیں جانتا ، پھر بھی میں نے ان کی اصل روح کو اچھی طرح محسوس کر لیا ھے ۔ به حیثیت ایک ادیب کے مجھے یه جان کر بے حد مسرت ھوئی که سوویت یونین کی طرح پاکستان بھی ایک کثیرالاقوامی ملک ھے اور مختلف زبانوں کی ادبیات میں باھمی ربط کے قیام اور باھمی ترجموں کا مسئله بےحد اھم ھے ۔ پاکستان کے ادیبوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کے اعتبار سے اور ان مشاھدات و نظریات کے اعتبار سے جن تک صنف شاعری پر بات چیت کے دوران میری رسائی ھوئی تھی ، میرا دورۂ پاکستان بڑا کامیاب اور اھم رہا ھے ،،۔

انھوں نے ان شاعروں اور ادیبوں کے نام گنوائے جن سے وه متاثر ھوئے تھے ۔

فلموں کا نمائشی میلہ

اتفاق کی بات ہے کہ اس سال مذکورہ بالا انجمن کے زیر اہتمام پاکستانی فلموں کا ایک نمائشی میلہ بھی ماسکو میں منعقد ہوا جس میں متعدد پاکستانی فلم دکھائے گئے - اس موقع پر ان فلموں سے متعلق فنکاروں، ڈرامہ نگاروں، ہدایت کاروں اور موسیقی دانوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا - اس میلے میں ''سراج الدولہ،، نامی فلم کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا تھا - مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دو تین روسی فلموں کے مکالمے اردو میں ''ڈب،، کئے گئے ہیں - میں نے سوچا کہ اگر صدر الدین عینی کانفرنس کے منتظمین یا مس مارگریٹا سے کہہ کر ان فلموں میں سے کسی ایک کو دیکھنے کا موقع مل جائے تو اچھا ہو -

سوویت پاکستان ثقافتی انجمن کے ایک سرگرم رکن مشہور شاعر کونستن تن سیمونوف ہیں - ان سے ملاقات ہوگئی - ان کی ایک نظم کا ترجمہ جناب انور احسن صدیقی نے بڑے کمال کے ساتھ کیا ہے - اگر کسی سے نہ کہا جائے کہ وہ روسی نظم کا ترجمہ ہے تو سننے والے یہ سوچنے کے لئے مجبور ہونگے کہ یہ ہمارے کس پاکستانی شاعر کا کلام ہے - فراوانئی جذبات اور انداز بیان کے لحاظ سے اس میں اردو نظم کا رچاؤ پایا جاتا ہے - اس کا ٹیپ کا مصرع ہے:

''میں اک دن لوٹ کر آؤنگا میری منتظر رہنا،،

غالب کے نام پر

مرزا غالب کے ساتھ روسی شاعروں کے دلی تعلق کا ذکر اوپر کر چکا ہوں - ان سے بے پناہ عقیدت کا اظہار ایک اور طرح بھی

کیا گیا ہے۔ جس طرح اردو شاعری میں چنبیلی، گلاب ، موتیا اور چمپا کا ذکر آتا ہے ، روسی شاعری میں لی لاک کے پھولوں کو سراہا جاتا ہے۔ ایک بار ایک سہانی چمکیلی صبح کے وقت جب اس کے روشن ارغوانی رنگ کے گچھے کھل اٹھے تو شاعری کے زبردست شائق لیونِد کولیس نکوف کی وصیت کے مطابق انہیں عظیم شاعر مرزا غالب کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ بات اس قدر مشہور ہوئی کہ اب بہت سے روسی لی لاک کو " مرزا غالب " کہنے لگے ہیں۔ تاہم یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس ملک میں بہت سے پھولوں کو وہاں کی اہم شخصیتوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ بات قابل قدر ہے کہ پہلی بار اردو کے عظیم شاعر کو یہ درجۂ قبول حاصل ہوا۔

لینن کا جشن ولادت

۱۹۷۰ء میں روس کے نجات دہندہ لینن کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں کو کچھ لکھنے کی دعوت دی گئی۔ مذکورہ بالا انجمن کے زیر اہتمام پاکستانی شاعر اور ادیب بھی مقابلے میں شریک کئے گئے۔ کامیاب مصنفین کے لئے گرانقدر انعامات رکھے گئے تھے۔ مجھے خوشی اور فخر ہے کہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے وابستہ جناب قمرھاشمی نے جو ایک باکمال نغزگو شاعر ہیں، مقابلے میں حصہ لیا اور انعام پایا۔ ان کی طویل نظم کا عنوان تھا " مرا پیام محبت بنام لینن ہے "۔ انہوں نے لینن کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین ادا کرتے ہوئے ان کو " عظیم انسان ، عظیم رہبر ، عزم و ایثار و آگہی کے پیکر ، تحریک عصر حاضر کی روح تازہ، خوگر امن و آشتی ، مینار روشنی ، جیسے

شاندار الفاظ سے یاد کرتے ہوئے ایک بند میں کہا تھا :

جہاں بھی انسانیت پہ ہوتے رہے مظالم
وہاں ثریا نشیں رہا ہے مقام ان کا
لکھا ہے تاریخ انقلابات نے ہمیشہ
سنہرے حرفوں سے نام ان کا

قمر ہاشمی صاحب کے علاوہ اور بھی پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کو مختلف انعامات ملے تھے ۔ غرض یہ ہے کہ اس انجمن نے ، جس کے صدر دفاتر کراچی اور ماسکو میں اور شاخیں دونوں ملکوں کے متعدد شہروں میں قائم ہیں ، بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ۔ اس انجمن کے ایما پر ایک سوویت اشاعت گھر '' پروگریسو پبلشرز ،، کے نام سے قائم ہے جو دنیا کی چالیس سے زیادہ زبانوں میں سماجی ، سیاسی ، سائنسی اور افسانوی ادب کی کتابیں ہر سال شائع کرتا رہتا ہے ۔ اس سال یعنی ۱۹۷۸ء کے لئے جو اشاعتی پروگرام ادارے نے مرتب کیا ہے ، اس میں لینن انعام یافتہ میخائیل شولوخوف کا ناول '' کنوارے کھیت ،، پروفیسر وی افاناسی ئینف کی کتاب '' سوشلزم اور کمیونزم ،، الیکساندر کپرن کی کہانیوں کا مجموعہ ، رسول حمزاتوف کی کتاب '' میرا داغستان '' اور بچوں کے مصنف یف گینی چاروشن کی کتاب ، جو بلی کے ایک بچے کی کہانی ہے ، سب سے زیادہ قابل ذکر مطبوعات ہونگی ۔ میں نے ان کتابوں کو اشاعت کے فوراً بعد حاصل کرنے کی فرمائش کر دی ہے ۔

طبی اداروں کا پروگرام

میں ادب اور شعر کی دنیا میں کھویا ہوا تھا کہ ایک دم

مادام مریم سلگانک نے مجھسے سوال کیا کہ میں دو تین دن میں کیا کیا کرنا اور کیا کیا دیکھنا چاھتا ھوں - میں نے کہا کہ آج کا دن تو ختم ہی ھو گیا ھے - اب ۱۲ اور ۱۳ اپریل کے دو دن باقی ھیں - ان میں اگر روس کا کینسرانسٹیٹیوٹ ، اوپن ھارٹ سرجری کا کلینک اور ماسکو یونیورسٹی دیکھ لوں تو بہت اچھا ھو - ان کے لئے اول الذکر پروگرام ذرا مشکل معلوم ھوئے ، تاھم انہوں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا - مس مارگریٹا کا بھی یہی خیال تھا - حالانکہ اول الذکر دونوں پروگرام میرے لئے زیادہ جاذب نظر تھے - سرطان سے نجات پانے کے لئے خود میں نے پاکستان میں ایک تحریک چلائی ھے جس کے سلسلے میں سگریٹ کے خلاف مہم سر کرنے کا بیڑا اٹھایا ھے - اگر سرکاری تعاون پوری طرح نصیب ھوگیا ، تو میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب رھونگا -

دل کے ٹکڑے کرنا اردو شاعری میں تقریباً ایک محاورہ بن گیا ھے - لیکن عملی طور پر دنیا بھر کے سرجنوں نے گوشت اور خون کے اس لوتھڑے پر طبع آزمائی شروع کر دی ھے - طرح طرح سے اسے کاٹ پیٹ کر خرابیاں دور کرنے کے طریقے معلوم کر لئے ھیں - اس ضمن میں چین اور روس سب سے آگے ھیں - چین کے لئے ایک طبی وفد نے جا کر وھاں کے سرجنوں کے کرشمے بچشم خود دیکھ چکا ھوں - ضرورت تھی کہ سوویت یونین میں دل کی جراحی کا حال دیکھوں -

امراض اطفال کے سلسلے میں سرجری ایک علاحدہ فن ھے کیونکہ بچے کا جسم کسی بالغ انسان کے جسم کے مقابلے میں زیادہ نازک ، سلائم اور کسی قدر غیر ترقی یافتہ ھوتا ھے ، اس لئے اس

سے نمٹنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ۔ سوویت یونین کے ہر بڑے شہر میں یا تو ایک سرجیکل کلینک ہوتا ہے یا ہر اسپتال میں اس شعبے کا ایک وارڈ قائم کیا جاتا ہے ۔ اس ضمن میں ماسکو کا '' دولت سکی اسکول ،، ایک اعلیٰ ترین ادارہ ہے ۔ ڈاکٹر اولگاپولیا کووا کی میز پر شیشے کے نیچے پھولے پھولے گالوں والی بچی کی تصویر رکھی ہے جس کا نام ماشا تھا ۔ چند ہفتے پہلے اسے زچہ خانے سے سیدھا اس کلینک میں لایا گیا تھا ، کیونکہ اس میں بہت سے پیدائشی نقائص موجود تھے ۔ ایک نقص یہ تھا کہ اس کی غذا کی نالی بند تھی ۔ زچہ خانے کے منتظمین کا خیال تھا کہ آپریشن ممکن نہیں ہے ۔ لیکن کلینک میں پروفیسر استالن لاف دولت سکی نے ، جن کے نام پر ادارے کا نام رکھا گیا تھا ، آپریشن کیا ۔ ڈاکٹر اولگاپولیا کووا ان کی مدد کرتے رہے ۔ آخر ان کی جدوجہد کامیاب رہی اور بچی کو غذا ملنے لگی ۔ اس کی رپورٹ پڑھنے کے علاوہ میں نے کئی اور مریضوں کا حال معلوم کیا ۔ جگر کی تکالیف اور خون کی رگوں میں خرابی کا علاج بعض ملکوں میں جراحی کا ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے ۔ لیکن والیری اکوپیان ، جو اس ادارے کے ایک ذہین معالج ہیں ، اس قسم کے مریضوں سے اچھی طرح نمٹ لیتے ہیں ۔ انہوں نے بعض نادر قسم کے آپریشن بڑی کامیابی سے کئے ہیں ۔ جب کسی مریض کے بچنے کا امکان بہت کم ہوتا ہے اور مطلوبہ آپریشن کی نوعیت انتہائی پیچیدہ ہوتی ہے تو کوئی سرجن آسانی سے خطرہ مول نہیں لیتا ۔ لیکن والیری ایسے ہر چیلنج کو قبول کر لیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ موت کا حقیقتاً ایک وقت مقرر ہے ۔ اگر کسی مریض کے فوت ہونے کا لمحہ نہیں آیا ہے تو

اسے کسی نہ کسی صورت تندرست کیا جا سکتا ہے - البتہ سب سے پہلے کوشش ہونی چاہئے کہ مرض کو مزید بڑھنے سے روک دیا جائے - آپریشن کے وقت مریض کے جسم کی قیمتی حرارت اور خون کے ایک ایک قطرے کو بچانے کی کوشش کی جائے - کسی بالغ کا تھوڑا سا خون ضائع ہو جانا کوئی تشویش کی بات نہیں ہے ، لیکن ایک کم سن بچے یا بوڑھے کے معاملے میں خون کو محفوظ رکھنا بہت ضروری ہے -

ماسکو کی یونیورسٹیاں

ماسکو میں ایک نہیں دو یونیورسٹیاں ہیں - ایک ریاستی یونیورسٹی کہلاتی ہے اور دوسری پیٹرسن لومبا فرینڈشپ یونیورسٹی - ان دونوں میں غیرملکی طلبا کافی تعداد میں موجود ہیں - اول الذکر کی سیر کے لئے یہ وقت مناسب نہیں تھا ، کیونکہ تمام غیر ملکی طلبا، جن میں پاکستانی سب سے زیادہ تعداد میں ہیں، تعلیمی دورے اور مشاہدے کے لئے تاشقند گئے ہوئے تھے - مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ پاکستانی طلبا نے ، جن کی تعداد بیس ہے ، اپنی ایک علحدہ انجمن بنا رکھی ہے ، جس کے صدر جناب عبدالرزاق ابرو سندھ یونیورسٹی ، حیدرآباد ، کی طرف سے وہاں داخل ہیں اور ارضیات کے موضوع پر تحقیقاتی مطالعہ کر رہے ہیں - ایک اور طالب علم سیف اللہ میمن ہیں ، جو کراچی کے رہنے والے ہیں - ان دونوں کی تعلیمی سرگرمیاں بہت زیادہ قابل قدر سمجھی جاتی ہیں - اگر وہ ماسکو میں ہوتے تو میں ان سے ضرور ملاقات کرتا - اس یونیورسٹی میں بیرونی طلبا کے ڈائرکٹر ایوان پالوفچ برمان ہیں جو



ماسکو میں لومونوسوف یونیورسٹی



ماسکو میں لینن سنٹرل اسٹیڈیم

کئی سال سے اس عہدے پر فائز ہیں اور اپنے طلبا سے بے حد محبت، خلوص اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں۔ وہ بھی تمام طلبا کے ساتھ تاشقند گئے ہوئے تھے۔ ان سے مل کر یقیناً مجھے بڑی خوشی ہوتی، اور جب وہ پاکستانی طلبا کی تعریف کرتے تو میں فخر محسوس کرتا۔

ماسکو میں پیٹرسن لومبا فرینڈ شپ یونیورسٹی ۱۹۶۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہاں بھی پاکستانی خاصی تعداد میں داخل ہیں۔ اس یونیورسٹی کے گریجویٹ اس وقت ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکا کے بہت سے ممالک میں کام کر رہے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے ماہرین کی حیثیت سے وہ اپنے اپنے متعلقہ ملک کی معیشت، صحت عامہ، تعلیم، سائنس اور ثقافت کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ موجودہ تعلیمی سال میں نوے ممالک کے چھ ہزار چار سو سے زیادہ طلبا وہاں داخل ہیں۔ اس متحدہ کثیر الاقوامی خاندان میں پاکستانی طلبا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انجینئرنگ فیکلٹی کے تیسرے سال کے ایک طالب علم منصور شاہد گزشتہ چار سال سے وہاں داخل ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں پاکستانی طلبا کے صدر بھی ہیں۔ ایک موقع پر ایک نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ان کی تنظیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ پروفیسروں اور استادوں کو پاکستان کے لئے اعلیٰ تربیت یافتہ ماہرین کی تیاری میں مدد دی جائے۔ تعلیم کے علاوہ انجمن اپنے طلبا کو ان کے فرصت کے اوقات گزارنے میں بھی مناسب مدد دیتی ہے اور بہت سے کھیلوں کی سرگرمیوں، سیرو تفریح اور طلبا کی تقریبات کا اہتمام کرتی ہے جس میں پاکستان کے سفیر، سفارت خانے کے اراکین، سوویت پاکستان دوستی کی انجمن کے

کارکن ، طلبا کی دوسری انجمنوں کے نمائندے وغیرہ شریک ہوتے ہیں۔ میزبان ہونے کے اعتبار سے پاکستانی طلبا اپنے علاقائی گیت اور رقص پیش کرتے ہیں اور مہمانوں کو اپنے مختلف فنون لطیفہ سے واقف کرتے ہیں۔

شاهد حسین یونیورسٹی کے پہلے پوسٹ گریجویٹ طالب علم تھے، جن سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہا۔ میں نے سنا کہ وہ ایک ماہر معاشیات ہیں۔ ان کے قیام کے چار سال بعد ۱۹۶۵ء میں پہلی بار یونیورسٹی سے اولین گریجویٹ فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ ان کی تعداد دو سو اٹھائیس تھی۔ اس سال ان کی تعداد بڑھکر پانچ سو باسٹھ ہوگئی ہے۔ ان میں سے تقریباً تین سو چالیس ایشیا ، افریقہ اور لاطینی امریکا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر دس پاکستانی طلبا فارغ التحصیل ہوچکے ہیں۔ اب ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ اس سال پاکستانی طلبا کی تعداد ستر ہے۔ وہ ہر شعبے میں شرکت کررہے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ عابد کامران اور حسن امیر شاہ طبیعیات اور ریاضی کے شعبوں میں پہلے پاکستانی طلبا ہیں۔ یونیورسٹی میں تجربہ گاہوں کے علاوہ ایک عمدہ لائبریری بھی موجود ہے جس میں مختلف زبانوں کی سات لاکھ سے زیادہ کتابیں رکھی گئی ہیں۔ روسی ، فارسی اور عربی کے علاوہ اردو زبان کی کتابیں سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ تمام طلبا اپنی نجی بات چیت قومی زبان میں کرتے ہیں۔ اس طرح بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آتی ہیں۔ یہاں ہر قسم کے کھیل کھیلے جاتے ہیں ، لیکن برف پڑنے کے زمانے میں " اسکی ئنگ " کا کھیل سب سے زیادہ مرغوب ہوتا ہے۔ مشاہدے اور مطالعے کے لئے سرکاری خرچ پر دوسرے شہروں کی سیر

بھی کرائی جاتی ہے جسے تعلیم کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

”روس کا دل“

ایک نا معلوم زمانے سے ماسکو کو ”روس کا دل“ کہا جاتا رہا ہے۔ تاریخ میں اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۱۴۷ء میں ملتا ہے۔ تاہم آثار قدیمہ کی حالیہ کھدائیوں میں ایسا مواد دریافت ہوا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نویں صدی عیسوی میں اس جگہ پر، جہاں آج کریملن واقع ہے، چاردیواری سے گھری ہوئی ایک بستی موجود تھی۔ ماسکو کی ترقی میں اس حقیقت نے بڑی مدد دی ہے کہ یہ ازمنۂ وسطیٰ کی اہم آبی اور بری شاہراہوں کے سنگم پر واقع تھا۔ اس لئے ماسکو زیادہ مالدار ہوتا گیا۔ اس نے اپنے چاروں طرف فصیلیں کھڑی کرلیں اور بہت جلد اس وقت کی مرکزی روسی ریاست کا دارالحکومت سمجھا جانے لگا۔ لیکن کچھ ہی عرصے میں اس کے بجائے زار روس کے نام پر قائم شدہ شہر پیٹرزبرگ (موجودہ لینن گراڈ) صدر مقام ہوگیا۔ اس نئے شہر کو بحیرۂ بالٹک کے کنارے پیٹر اول نے آباد کیا تھا۔ لیکن اس سرکاری تبدیلی کے باوجود لوگوں کے ذہنوں میں ماسکو، ”روس کے دل“ کی حیثیت سے باقی رہا اور یہ محض ایک اتفاقی امر نہیں ہے کہ ملک کی پہلی یونیورسٹی ۱۷۵۵ء میں ماسکو ہی میں قائم کی گئی کیونکہ بیشتر دانشور اور سائنس داں، ادیب اور فنکار، رقاص و موسیقار اسی شہر میں بدستور رہتے اور کام کرتے رہے۔ نئے شہر کے قیام نے کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔ پھر انیسویں صدی میں صنعت و حرفت کی تیزی سے ترقی ہوئی تو ماسکو ایک بڑا صنعتی مرکز

بن گیا۔ اس کے قرب و جوار کے دیہی علاقوں میں لوگ بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ وہ سب نئی صنعتی دوڑ میں حصہ لینے کے لئے نکل آئے۔ حتیٰ کہ اکتوبر کے انقلاب کے بعد مارچ ۱۹۱۸ء میں ماسکو ایک بار پھر باقاعدہ ملک کا دارالحکومت تسلیم کرلیا گیا۔ اس وقت حکومت کے سربراہ وی۔ آئی۔ لینن تھے۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں سوویت سوشلسٹ جمہوریتوں نے مل کر یونین بنائی تو اس نے بھی اس فیصلے پر مہر توثیق ثبت کردی۔

پچھلے ساٹھ سال کے دوران یہ شہر اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ اس کا تصور بھی محال ہے۔ اس کا رقبہ ۸۷۸ء۷ مربع کلومیٹر ہے۔ اس میں سے ۲۸۶ مربع کلومیٹر باغوں، پارکوں اور دوسرے مقامات پر لگے ہوئے پودوں سے گھراہوا ہے۔ رہائشی رقبہ بارہ کروڑ تیس لاکھ مربع میٹر سے زیادہ ہے اور زیر زمین ریلوے لائن کی، جسے میٹرو کہا جاتا ہے، مجموعی لمبائی دوسو کلومیٹر کے قریب ہے۔ رقبے میں پانچ گنے اضافے کے باعث آبادی بھی تقریباً چارگنی بڑھ گئی ہے جو اب تقریباً اسی لاکھ ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر روزانہ کئی سو فلیٹ تعمیر ہوتے رہے ہیں۔ اس قدر تیزی سے کام نہ ہوتا تو آبادکاری کا کام مشکل ہو جاتا۔ اس اعتبار سے آمد و رفت کا نظام مناسب رکھنے کے لئے ایسے کارخانے قائم ہوئے جو پرزے جوڑ کر روزانہ ڈیڑھ ہزار موٹر گاڑیاں، بسیں اور ٹرک تیار کرنے لگے تاکہ تمام ملک کی ضرورت پوری کرسکیں۔ اس طرح کچھ کارخانے روزانہ تیس لاکھ گز سے زیادہ کپڑا' ایک لاکھ جوڑی سے زیادہ جوتے، ڈھائی ہزار ٹی وی سیٹ، پچاس ہزار دستی گھڑیاں اور کوئی چھ سو کپڑے دھونے کی مشینیں تیار کرنے لگے۔

سوویت یونین نے ماہرین کی موجودگی کے پیش نظر اکیڈیمی آف سائنسز اور اس کے ماتحت چھہتر تحقیقاتی ادارے اسی شہر میں قائم کئے اور اسی اعلا تعلیمی ادارے کھول دئے جن میں مخصوص تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد اس وقت چھ لاکھ چالیس ہزار ہے۔ ایک ہزار تین سو عام اسکول ہیں جن میں طلبا کی تعداد ساڑھے آٹھ لاکھ ہے۔ تحصیل معلومات اور فروغ علم کے لئے چار ہزار تین سو لائبریریاں ہیں۔ تفریح کے لئے پچیس تھیٹر، ساڑھے پانچ سو سنیما گھر اور چھپن عجائب گھر ہیں۔ صرف ماسکو میں پبلک ٹرانسپورٹ سے ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ افراد روزانہ سفر کرتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے مشاغل حیات کے اعتبار سے کئی کئی بار گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں۔ بہت سی ایسی برقی موٹریں بھی تیار ہوتی ہیں جن کی صلاحیت سو کلو واٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔ جو کارخانے تعمیراتی سازو سامان تیار کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ پیداوار کی کل مقدار گزشتہ ساٹھ سال میں دو ہزار گنی سے زیادہ ہوگئی ہے۔

انقلاب اکتوبر سے چارسال پہلے ماسکو میں صرف پچاس ہسپتال تھے جن میں بستروں کی کل تعداد دس ہزار کے قریب تھی۔ آج مختلف نوعیت کے دو سو ساٹھ ہسپتال اور شفاخانے قائم ہیں، جن میں سوا لاکھہ اقامتی مریض زیر علاج رہ سکتے ہیں۔ بیرونی مریضوں کے شعبے ان کے علاوہ ہیں۔ ابتدائی طبی امداد کے ایک ہزار آٹھ سو مرکز ہیں۔ ان تمام ہسپتالوں اور مرکزوں وغیرہ سے طبی امداد مفت ملتی ہے۔ زچگی کے ڈھائی سو مشاورتی مرکز ہیں جہاں زچاؤں اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے قیمتی مشورے دئے جاتے ہیں۔ لوگوں کو تندرست اور چاق و چوبند رکھنے کے لئے مختلف

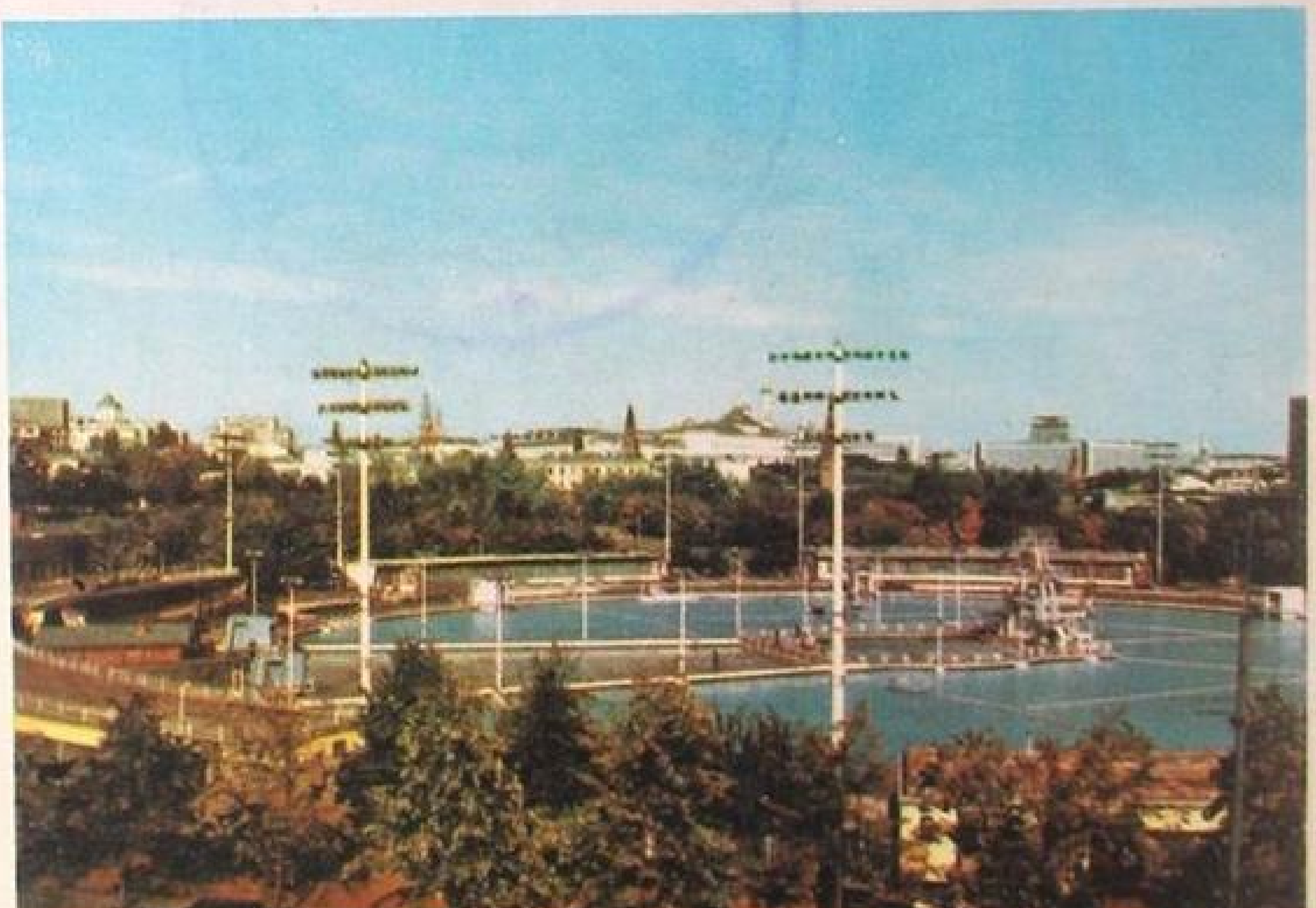
کھیلوں کے ستاون اسٹیڈیم ، ایک ہزار چار سو جمنازیم ، تیس تیراکی کے تالاب ، دو سو سے زیادہ اسکی ئنگ کے میدان اور اس کی تنصیبات ھیں۔ کھیل کے کل اداروں کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہے۔

دلچسپ اعداد و شمار

ماسکو سے نکل کر سارے ملک یعنی سوویت یونین کے نقشے پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا رقبہ دو کروڑ چوبیس لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ یعنی یہ کرۂ ارض پر خشکی کے حصے کا ایک چھٹا حصہ ہے۔ امریکا سے تین گنا ، برطانیہ سے نوے گنا یا پورے لاطینی امریکا کے برابر ہے۔ یکم جنوری ۱۹۷۷ء کو تمام یونین کی آبادی پچیس کروڑ اناسی لاکھ تھی۔ گویا آزادی کے بعد ساٹھ سال کے عرصے میں دس کروڑ نفوس کا اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۱۳ء میں روس میں لوگوں کی اوسط توقع حیات بتیس سال تھی جو ۱۹۶۷ء میں درازیٔ عمر کی تدابیر اختیار کرنے کے باعث ستر سال ہوگئی اور اب تقریباً پچھتر سال ہے۔ معلوم ہوا کہ دنیا کے معمر ترین سوویت شہری کا انتقال اب سے ساڑھے چار سال قبل ہوا۔ وہ آذربائجان کے ۱۶۸ سالہ شیرعلی مسلموف تھے۔ اب سوسال سے زیادہ عمر کے بڑے گروہ میں سب سے زیادہ معمر آذربائجان ھی کے ۱۴۳ سالہ مجید آغائیف ھیں۔ ۱۹۷۰ء میں سوویت یونین میں سوسال سے زیادہ عمر کے افراد کی تعداد انیس ہزار تین سو تھی۔ اب بیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ رفتار پیدائش نہ بہت زیادہ ہے اور نہ بہت کم۔ ہر منٹ گزرنے پر ملک میں نوبچے پیدا ہوتے ھیں اور جیسا کہ عموماً ہر ملک میں ہوتا ہے ، نوزائیدہ بچوں میں لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی تعداد



ماسکو میں قومی اقتصادی نمائش کا دفتر



ماسکو میں تیراکی کا تالاب

زیادہ ہوتی ہے۔ روس میں بھی اس وقت یہی حال ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت سارے ملک میں عورتوں کی تعداد چھپن فیصد ہے کیونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران بےشمار مرد سپاہی کام آگئے تھے۔ عورتیں، جو محاذ جنگ سے دور رہ کر لڑائی کے کاموں میں حصہ لیتی تھیں، بہت کم فوت ہوئیں۔ قیاس ہے کہ تھوڑے عرصے میں عورتوں اور مردوں کا تناسب برابر ہوجائیگا۔ ملک میں آبادی کی اکثریت یعنی باسٹھ فیصد لوگ شہروں میں رہتے ہیں۔ پہلے دیہی آبادی زیادہ تھی لیکن مشینوں کے استعمال نے اس تناسب کو بدل دیا ہے۔ ملک کا سب سے زیادہ قدیم شہر آرمینیا کا دارالحکومت یریوان ہے، جو ڈھائی ہزار سال قبل آباد ہوا تھا اور سب سے زیادہ نیا شہر تنیدا ہے جو بیکال و آمور ریلوے لائن پر اس وقت زیر تعمیر ہے۔ ملک کے تمام شہروں اور قصبوں کی مجموعی تعداد دوہزار ہے اور اگر اس میں شہری طرز کی دور افتادہ بستیاں بھی شامل کرلی جائیں تو یہ تعداد تین گنی ہوجائیگی۔ ان میں سے نصف شہر اور قصبے سوویت یونین کے دوران اقتدار تعمیر ہوئے۔ پہلے کچے دیہات کی تعداد زیادہ تھی۔ ملک میں ایسے شہروں کی تعداد انتالیس ہے جن کی آبادی سات لاکھ سے زیادہ ہے۔ پہلے روس بڑی حد تک کسانوں کا ملک تھا۔ لیکن پچھلے ساٹھ سال میں زبردست صنعتی طاقت کا گہوارہ بن گیا ہے۔

کریملن کا علاقہ

ذرا پہلے برسبیل تذکرہ کریملن کا نام آیا ہے۔ کریملن کا علاقہ ایک بے ڈھنگی، بے قاعدہ تکون کی صورت میں دریائے ماسکو

کے کنارے واقع ھے۔ تینوں اطراف کسی قدر اونچی نیچی فصیلوں کا سلسلہ ھے۔ اس میں داخل ھونے کے لئے تین بڑے اور متعدد چھوٹے دروازے ھیں جن میں سے موٹر گاڑیاں اور ٹرک تک گزرسکتے ھیں۔ بڑے دروازوں کے اوپر اونچے مینار ھیں، جن کے کلسوں پر یاقوتی رنگ کے ستارے جگمگاتے نظر آتے ھیں۔ ھر ستارہ پانچ کونوں کا اور وزن میں تقریباً ایک ٹن کا ھے۔ ھر ایک کے پہلو تین تین گز لمبے ھیں۔ انھیں ایک دائرے میں لگے ھوئے لوھے کے چھوٹے چھوٹے گولوں کے اوپر اس طرح نصب کیا گیا ھے کہ ھوا کا ذراسا جھونکا ھر ستارے کو گردش میں لے آتا ھے۔ یہ ستارے قدیم زمانے سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ۱۹۳۰ء میں لگائے گئے تھے۔ دن کے وقت وہ سنہرے نظر آتے ھیں جو ان پر پھرے ھوئے رنگ کو ظاھر کرتے ھیں۔ البتہ رات کے وقت ان میں سے یاقوتی رنگ کی شعاعیں نکلتی ھیں کیونکہ تیز بجلی کے لیمپ ان کے وسط میں اسی طرح لگائے گئے ھیں کہ وہ نیچے سے نظارہ کرنے والوں کو نظر نہیں آتے۔ لیمپ کے گولے خود بھی حرکت میں رھتے ھیں جس کے باعث روشنی چلتی پھرتی معلوم ھوتی ھے۔

ھر بڑا دروازہ ایک تاریخی نوعیت کا ھے۔ دو دروازے جانب غرب ھیں اور ایک جانب شرق ھے۔ جانب شرق سرخ چوک، لینن کا مقبرہ اور عجائب گھر خاص اھمیت کے حامل ھیں۔ اس طرف ایک کھلا وسیع میدان بھی ھے جس میں قومی تقریبات کے عوامی اجتماعات ھوتے ھیں۔ جانب غرب وسیع باغ ھے جس میں انواع و اقسام کے پھولوں کی کیاریاں، بیلیں، پودے اور درخت ھر وقت موسم بہار کا رنگ طاری رکھتے ھیں۔ بچوں کے لئے جھولے،



ماسکو میں کریملن کی عمارات



کریملن میں لینن لائبریری

چکر اور ھنڈولے بھی لگے ہوئے ھیں جن پر ھمہ وقت بچوں کی یلغار رہتی ھے۔ کبڈی کی قسم کا ایک کھیل بھی کھیلا جاتا ھے جسے دیکھنے کے لئے بہت سے تماش بین جمع ہوتے ھیں۔ تینوں طرف دبیز دیواروں پر سات سات گنبد بھی بنائے گئے ھیں۔ ان میں سے ھر ایک کا ڈیزائن مختلف ھے۔ دیواروں کی لہر دار سطح کے بموجب وہ اونچے نیچے ہونے کے علاوہ وضع قطع میں بھی یکساں نہیں ھیں۔ کوئی گول ھے تو کوئی مخروطی، کوئی چوکور ھے تو کوئی ھفت پہلو۔ ان گنبدوں کے سائے میں ہوٹل تعمیر کئے گئے ھیں جن میں زیادہ تر غیر ملکی سفارتی نمائندے قیام کرتے ھیں۔

ایک گنبد کے نیچے تیز دھار کا ایک چشمہ ھے جس کا پانی باقاعدہ استعمال ہوتا ھے اور خاص طور سے اس زمانے میں کہ جب مختلف جنگوں میں کریملن کا محاصرہ ہوا اور فوجوں نے اس کی فصیل کے اندر پناہ لی تو اسی کا پانی ان کی پیاس بجھاتا اور ان کی دوسری ضروریات پوری کرتا رہا تھا۔ البتہ اب آب رسانی کا نظام عام قاعدے کے مطابق درست کرلیا گیا ھے۔

جانب غرب جو بردوئسکی مینار ھے، وہ خاص طور سے مدافعین کے کام آیا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر کتافیا نام کا ایک اور مینار ھے جو کریملن کی کسی دیوار کا جزو تو نہیں ھے لیکن علاقے کے لئے بڑی اھمیت رکھتا ھے۔ وھاں سے "باب تثلیث" (ٹرینٹی گیٹ) تک ایک پشتہ تعمیر کیا گیا ھے۔ وہ اس کمرے کی کھڑکی کے عین محاذ میں ھے جسے لینن، اپنے قیام کریملن کے دوران مطالعہ کے لئے استعمال کرتے تھے۔

جانب شرق اسپاسکی دروازہ سرخ چوک کے سامنے ھے۔

یہ دروازہ بالکل چوکور ہے۔ اس کے مینار کی بلندی پر ستارے سے نیچے ایک بڑا گھنٹہ نصب ہے جس کے ڈائل چاروں طرف نظر آتے ہیں۔ ان پر لگی ہوئی سوئیاں سونے کی ہیں اور ہر طرف ایک سے بارہ تک کے ہندسے بھی سونے کے پتروں سے بنائے گئے ہیں جو خوب صیقل شدہ ہونے کے باعث رات کو چمکتے ہیں۔ بہت دور سے ان کو پڑھا جاسکتا ہے۔ ہر پندرہ منٹ کے بعد یہ گھنٹہ وقت ظاہر کرنے کی آواز دیتا ہے۔ یہ خودکار ہے۔ چابی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کا لنگر ایسی زنجیروں کے ساتھ منسلک ہے جو بہت وزنی ہیں۔ زنجیروں کے ساتھ تیس گھنٹیاں لگی ہوئی ہیں جن پر موگریوں کی ضرب لگنے سے تیز آواز نکلتی ہے۔ آوازوں کا سلسلہ ریڈیو کے نظام سے ملتا ہے۔ اس طرح کریملن کے اس گھنٹے کی آواز ہر ایک گھنٹے کے بعد ساری دنیا میں سنی جاسکتی ہے۔

سامنے ایوانوفسکایا نامی چوک میں کریملن تھیٹر سے ذرا آگے دائیں طرف وسیع شاہی محل ہے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ یہ ایک مستطیل کی صورت میں ہے جس کے وسط میں بارہ گز اونچا گنبد ہے۔ یہ انیسویں صدی کے وسط میں اس وقت کے زار روس کے حکم پر مشہور معمار کونسٹنٹین ٹون نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے کلس پر ایک سرخ پھریرا لگا ہوا ہے جو قومی تہواروں اور تقریبات کے موقع پر یا جب سپریم سوویت کا اجلاس ہورہا ہو، لہراتا نظر آتا ہے۔ گنبد میں داخل ہونے کے چار دروازے ہیں۔ ہر دروازے پر سنگ مرمر کی ایک طویل و عریض تختی نصب ہے۔ ان سب پر سونے کے حروف میں ”روس کی سپریم سوویت“ کندہ ہے۔ اندر وسیع ایوان ہیں جن میں لگی ہوئی بڑی بڑی کھڑکیاں دیواروں کو زینت دیتی ہیں۔ ان

میں جڑے ہوئے شیشے خاص طور سے نقاشی کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنے کے باعث قابل دید ہیں۔ ہر چھت میں بہت سے خوبصورت جھاڑ آویزاں ہیں، جن میں لگے ہوئے قمقمے اپنی تیز روشنیوں سے بڑی جگمگاہٹ پیدا کرتے ہیں۔

اصل اسمبلی ہال کے علاوہ چھوٹے کمروں میں مختلف قسم کے اجلاس ہوتے ہیں۔ اسمبلی ہال میں نہایت نرم گدیلے والی آرام کرسیاں ترتیب سے لگائی گئی ہیں۔ ہر کرسی کے سامنے ایک ڈیسک لگا ہوا ہے جس پر صوتی آلات نصب ہیں۔ سارے ایوان کی دیواروں پر تقریباً سات ہزار لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ خفیف آواز بھی نشر ہوکر ہر شخص کو صاف سنائی دیتی ہے۔ اسٹیج کے عقب میں لٹکے ہوئے پردے پر لینن کی ایک عظیم الشان روغنی تصویر کئی ماہرین فن نے مل کر بنائی ہے۔ ایوان میں جب بھی کوئی تقریر ہو، اس کا ساتھ ساتھ ترجمہ تیس صوبائی زبانوں میں ہوتا رہتا ہے۔ صوتی آلات کے ذریعہ سے ہر شخص اپنی مرضی یا سمجھ کے مطابق ایک علیحدہ زبان میں تقریر سن سکتا ہے۔

ایک ایوان عوام کے اجتماعات کے لئے مخصوص ہے۔ سنٹ جارج ہال کے نام سے ایک اور وسیع ایوان قدیم فوجیوں کے نام سے منسوب ہے جس میں ان کی وردیاں، اسلحہ اور امتیازی نشانات محفوظ کئے گئے ہیں۔ سنگ مرمر کی طویل پٹیوں پر خاص جوانمردوں کے نام اور کارنامے سنہرے حروف میں کندہ کئے گئے ہیں۔ جون ۱۹۶۹ء میں یہاں ایک بہت بڑا اجتماع ہوا تھا جس میں کارل مارکس اور لینن کے اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔

کریملن کا عظیم الشان شاہی محل، جس کو ۱۹۶۱ء میں نئی وضع دی گئی اور نئے انداز میں آراستہ کیا گیا، بہت بڑے پیمانے کے عوامی اجتماعات کے کام آتا ہے۔ اس میں چھ ہزار کرسیاں قرینے سے لگی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دوہزار افراد کی گنجائش موجود ہے۔ اس کے کمرۂ ضیافت میں بیک وقت ڈھائی ہزار افراد کھانا کھاسکتے ہیں۔ یہ کئی منزلہ ہے۔ اس کی دومنزلیں عام سطح زمین سے نیچے بھی ہیں۔

سرخ چوک کریملن کی شمال مشرقی فصیل کے سامنے واقع ہے۔ کسی زمانے میں یہ اشیائے خرید و فروخت کی بہت بڑی منڈی تھا۔ پھر اسے عوامی چوک کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہاں سرکاری ترجمان عوام کو جمع کرکے زار روس کے فرمان سنایا کرتے تھے تاکہ لوگ ان احکامات کے مطابق زندگی بسر کریں۔ اب اس میں سرخی مائل بھورے رنگ کے سنگین چوکے جمادئے گئے ہیں اس طرح کہ بیچ کا حصہ ابھرا ہوا ہے اور چاروں طرف ڈھلان ہے۔ یہاں ہنگاموں کا تو ذکر ہی کیا، معمولی شوروشغب بھی سنائی نہیں دیتا۔ ہر وقت ایک پروقار خاموشی چھائی رہتی ہے۔ صرف اسپاسکی مینار میں بجنےوالا گھنٹہ اس طلسم خاموشی کو وقفے وقفے سے توڑتا ہے۔ اس خاموشی میں احترام کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے کیونکہ قریب ہی ایک وسیع عمارت ہے جو روس کے نجات دھندہ وی، آئی، لینن کا مقبرہ ہے۔

سرخی مائل سیاہ رنگ کی یہ چوکور عمارت بڑی شاندار ہے۔ بڑے ہال میں لینن کی لاش محفوظ حالت میں اس طرح رکھی گئی ہے کہ اسے حنوط شدہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن مصر کی حنوط شدہ لاشوں

میں اور اس میں نمایاں فرق ہے۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لینن آسودۂ خواب ہیں اور اگر فوت ہوگئے ہیں تو مشکل سے چوبیس گھنٹے گزرے ہیں۔ ان کے دیدار کے لئے زائرین کا ایک زبردست تانتا بندھا رہتا ہے۔ کئی کئی دن پہلے دیدار کرنے کی درخواست منظور ہوتی ہے، نمبر ملتا ہے، وقت مقرر کیا جاتا ہے اور لوگ بڑے نظم و احترام کے ساتھ قطار لگا کر جمع ہوجاتے ہیں اور گھنٹوں انتظار میں رہتے ہیں۔ ان کی باری آتی ہے تو دیدار محض چند منٹ کے لئے ہوتا ہے۔ برہنہ سر کھڑے ہوئے منتظمین اگلے شخص کو ہٹا کر دوسرے نمبر پر کھڑے ہوئے شخص کو آگے بڑھنے کا موقع دیتے ہیں۔ ملک کے ہر حصے سے اور کچھ بیرونی ملکوں کے عقیدت مند بھی اس مقصد کے لئے سرخ چوک کا طواف کرنے آتے ہیں۔ عقیدت و احترام کا جذبہ ان کا دامن تھامے رکھتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی بددل ہوکر واپس نہیں جاتا۔ انتظار کی گھڑیاں صبر و سکون اور خاموشی کے ساتھ گزار دیتا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو کریملن کی دیوار بقعۂ نور بنی ہوئی تھی اور لینن کا مزار روشنیوں کا مرکز تھا۔ لوگ آ آکر پھول چڑھا رہے تھے۔ عین اس وقت ایک نیا شادی شدہ جوڑا بھی آپہنچا۔ دونوں لباس عروسی میں تھے۔ انہوں نے ازراہ عقیدت لینن کی قبر پر پھول رکھ کر خوشی منائی۔ ہمارے ملک میں اسے بدشگونی سمجھا جاتا۔ مجھے بتایا گیا کہ بہت سے نئے جوڑے لینن کی قبر پر آکر اسی طرح عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسطرح ان کی دلی مراد برآئیگی۔ ان کی ازدواجی زندگی اچھی گزریگی۔ اس سے ذرا آگے مقبرے کے دروازے پر دو فوجی بت کھڑے پہرا دے رہے تھے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ زندہ انسان ہیں یا مجسمے

ہیں۔ یہ اس انداز میں ایک گھنٹے سے زیادہ کھڑے نہیں رہ سکتے تھے، اس لئے ان کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ پھر بھی کہنا پڑیگا کہ ان میں بڑی سکت تھی۔ اس کے بعد لینن کا کمرۂ مطالعہ بھی قابل دید ہے۔ اس میں ہر چیز اس طرح قرینے سے رکھی ہوئی ہے گویا کہ لینن مطالعہ کرتے کرتے اٹھ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام وہیں گزارے تھے اور وہیں رہ کر اپنا آخری منشور مرتب کیا تھا، جس پر آج تک عمل ہورہا ہے۔ روسیوں کے نزدیک وہ ان کی الہامی کتاب کے برابر ہے۔

فصیل شہر کے اندر ایک گرجا بھی ہے جو سنٹ باسل کا گرجا گھر کہلاتا ہے۔ اب اسے بھی عجائب گھر بنادیا گیا ہے۔ وہ سولھویں صدی عیسوی میں ایک خاص موقع کی یادگار منانے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ گرجا کے قریب ہی دو جانبازوں کی یادگار قائم ہے۔ ان میں سے ایک چبوترے پر کھڑا ہے اور اپنی انگلی سے ایک سمت میں اشارہ کررہا ہے۔ دوسرا بیٹھا ہوا ہے، ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ڈھال تھامے ہوئے ہے۔ اس یادگار کے دامن میں ایک کتبہ لگا ہے جس پر کندہ ہے: ''روس شکر گزار ہے اہلیان منن اور شہزادہ پوژ ارسکی کا۔'' سترھویں صدی کے آغاز میں ان سورما رضا کاروں نے فوج کشی کر کے ماسکو کو پولینڈ کے حملہ آوروں سے بچا لیا تھا۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی یادگار عمارتیں ہیں۔ مثلاً تاریخ کا عجائب گھر، ملک کا سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور اور انجمن تاجران کا اجتماعی مرکز وغیرہ۔ یعنی اگر کوئی شخص ماسکو آئے اور کریملن کے علاقے سے آنکھیں بند کر کے گزر جائے تو سمجھنا

چاهئے که اس نے روس کے قلب پر تو قدم رکھا لیکن اس قلب کی گہرائیوں کا اور دھڑکنوں کا جائزہ نہیں لیا۔

اسی علاقے میں ”لینن لائبریری“ بھی قائم ھے۔ مطالعه کرنے کی غرض سے نہیں، سرسری جائزہ لینے کے خیال سے میں نے اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس میں عام داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ پہلے کارڈ بنوانا پڑتا ھے۔ چنانچه میں نے ایک فارم بھر دیا۔ بہت معمولی فیس ادا کردی۔ کاؤنٹر پر منتظم اعلیٰ ایک خاتون تھیں۔ انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ یه تو صاف ظاہر تھا که میں روسی نہیں، کوئی غیر ملکی ہوں لیکن میرا لباس ان کے لئے جاذب نظر تھا۔ انہوں نے بڑی عنایت کی که مجھے پانچ سال کے لئے رکنیت کا کارڈ عطا کردیا۔ انہیں کیا معلوم تھا که میں وھاں پانچ ماہ بلکه پانچ ھفتے بھی نہیں رہ سکونگا۔ بہرحال میں کارڈ لے کر لائبریری میں داخل ہوگیا۔ یه روس کی بہت بڑی لائبریریوں میں شمار ہوتی ھے۔ اس میں ستر لاکھ سے زیادہ کتابیں رکھی گئی ھیں۔ وقت کی کمی کے باعث میں نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ میں شعبۂ مشرقی علوم میں بھی گیا۔ وھاں فہرست کو دیکھا۔ اس میں پاکستان کی اردو کتابیں بھی موجود تھیں مگر کوئی اچھا انتخاب نہیں تھا۔ بس جو کتاب آ گئی، رکھ لی گئی۔ اس سے زیادہ دلچسپی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے سوال کیا که کیا میری کوئی کتاب بھی یہاں موجود ھے؟ ترجمان نے انڈکس دیکھا تو اردو کی کوئی کتاب تو نہیں ملی۔ البته ”میڈیسن ان چائنا“ کا اندراج مل گیا۔ ظاہر ھے که مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے فیصله کیا که ان کو اپنی اردو کتابیں بھیج دونگا۔

صدر الدین عینی کی تقریب میں شرکت کے لئے ہندوستان سے جناب پروفیسر جعفری اور محترمہ [redacted] جعفری کو دعوت نامے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ دونوں آرہے ہیں۔ یہ بات میرے علم میں ہے کہ پاکستان کے فیض احمد فیض صاحب پچھلے دنوں دہلی میں تھے۔ توقع ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ روس آئیں گے۔

ماسکو گردی

انجمن مصنفین روس کے دفتر میں تبادل خیال سے فارغ ہوکر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب ماسکو گردی ہونی چاہئے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ جب تک کسی جگہ کو پیدل چل پھر کر نہ دیکھا جائے، اس وقت تک وہاں کا صحیح حال معلوم نہیں ہوسکتا۔ میری مترجم اور سکریٹری مس مارگریٹا پاؤلونا اس ضمن میں نئی ہیں مگر ان کی اردو دانی نیز ان کی سادگی اور خوش مزاجی قابل رشک ہے۔ مجھے یہ اردو داں خاتون پسند آئی ہیں۔ خصوصاً اس اعتبار سے بھی کہ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا بڑا احساس ہے۔ انہیں حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ کاش ! یہ جذبہ ہر شخص میں پیدا ہوجائے خواہ وہ روسی نژاد ہو یا پاکستان کا باشندہ۔

میں نے انگریزی زبان میں روسی طبی کتابوں اور بعض ادبی مطبوعات سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ لہذا مس مارگریٹا مجھے کتابوں کے ایک بڑے بازار میں لے گئیں۔ میں نے دیکھا کہ کتابوں کے بازار میں مطالعہ کے شوقین افراد کی بڑی ریل پیل ہے۔ دوکانوں میں کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ہے تو لوگ باہر پٹریوں پر نکل آئے ہیں اور وہیں کھڑے ہوکر کتابوں کو دیکھ بھال کر پسند کر رہے

ہیں۔ میں نے کتابوں کے ساتھ اس ذوق و شوق کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ پھر یہی نہیں کہ لوگ ورق گردانی پر اکتفا کرتے ہیں بلکہ وہ کوئی نہ کوئی کتاب خریدتے بھی ضرور ہیں۔ کتب خانوں کے قریب ہی اخبارات کے اسٹال بھی تھے۔ ان پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بیشتر لوگ دو دو تین تین اخبارات خرید کر لے جا رہے تھے۔ کتب و رسائل اور اخبارات کی پالیسی وضع کرنے میں حکومت نے سخت احتیاط ہی نہیں برتی بلکہ اپنے مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی مرضی اور منشا اور حکمت عملی کے بغیر کتابوں کی اشاعت آخری مرحلے سے نہیں گزرسکتی۔ لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ سنسر کی پابندی کسی مسودے کو رد کردے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ عوام قومی حکومت کے اصولوں کو عزیز رکھتے ہیں اور کوئی قدم ایسا نہیں اٹھاتے جو حکومت کی ناپسندیدگی کا باعث ہو، حکومت کے خلاف ہو یا پارٹی کے منشور کے منافی ہو۔ اسی منشا اور مقصد کے تحت غیر ملکی مطبوعات کی درآمد پر خاصی پابندیاں عائد ہیں۔ روس جانے سے پہلے میں نے اپنا مقالہ جو کانفرنس میں پڑھنے کے لئے تھا، پمفلٹ کی صورت میں چھپوا لیا تھا اور دو سو کاپیاں حاضرین میں تقسیم کرنے کے لئے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ میرے سامان میں شامل تھیں۔ اس کے علاوہ ذاتی مطالعے کے لئے چند کتابیں بھی تھیں۔ ہوائی اڈے پر مجھے کسٹم کے ارباب حل وعقد نے وی آئی پی یعنی اہم شخصیتوں میں شمار کیا اور میرا سامان میرے جانے بغیر باہر آگیا اور موٹر میں رکھوا دیا گیا۔ فرائض کے ساتھ وہ اصول احترام کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔

اشاعت کتب

کتابوں کے بازار میں رہتے ہوئے میری تحقیقاتی فطرت اپنا کام کرتی رہی۔ میں نے معلوم کیا کہ سوویت یونین کی سب ریاستوں میں مجموعی طور پر نواسی مقامی زبانوں اور اکیاون غیر ملکی زبانوں میں تقریباً ایک ارب اسی کروڑ کتابوں کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔ ہر سال اتنی کتابوں کی ایسی اشاعت کہیں اور سننے میں نہیں آئی۔ ان کتابوں کی کھپت بھی یقینی ہے کیونکہ سوویت یونین میں ایک لاکھ پچیس ہزار پبلک لائبریریاں قائم ہیں جن میں کتابوں کا ذخیرہ انقلاب سے پہلے کے روس کے مقابلے میں ایک سو چوبیس گنا زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں عوام میں خود کتابیں خرید کر پڑھنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو کتابیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے لائبریریوں میں جاتے ہیں یا پھر شائقین علم وہاں جا کر کتابوں کا سرسری جائزہ لے کر یہ معلوم کرتے ہیں کہ ان کے ذوق اور مطلب کی کونسی کتاب کس اشاعت گھر سے مل سکتی ہے تاکہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ آرڈر دے کر منگوا سکیں یا کسی قریبی کتب خانے سے خرید لیں۔ وہ دوسروں سے مانگ تانگ کر کتاب کا مطالعہ کرنا غیر اخلاقی فعل سمجھتے ہیں۔ چونکہ تمام ریاستوں میں ہر قسم کی تعلیم مفت اور عام ہے، اسلئے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔

اوپر کتابوں کے جو اعداد و شمار دئے گئے ہیں، ان میں کتب نصاب شامل نہیں ہیں۔ وہ سرکاری طور پر چھپتی اور درسگاہوں میں مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ موجودہ تعلیمی سال میں یونین کے عام ابتدائی اور ثانوی مدارس میں زیر تعلیم طلبا کی تعداد پانچ کروڑ بیس لاکھ

ہے جبکہ اعلیٰ اور خصوصی تعلیمی اداروں میں ان کی تعداد ایک کروڑ دس لاکھ کے قریب ہے۔

اخبارات و رسائل کا بھی یہی حال ہے۔ ملک بھر میں کم و بیش پندرہ ہزار روزنامے اور مختلف موضوعات اور طبقات کی ضرویات پوری کرنے والے سترہ ہزار رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ بہت سے اخبارات کے صبح اور شام کے ایڈیشن الگ الگ چھپتے ہیں۔ ایک ہی نام سے بہت سے اخبارات کئی شہروں سے نکلتے ہیں۔ وہ پرائیویٹ اداروں کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ سرکاری بھی ہیں لیکن سب کے لئے ایک صحافتی ضابطۂ اخلاق رائج ہے جس کی پابندی پورے خلوص اور صحیح جذبے کے ساتھ کرنی پڑتی ہے۔ حکومت کو شاذ و نادر ہی کسی تحریر پر احتساب کرنا پڑتا ہے۔

کتابوں کی دکانوں میں ایک سر سری جائزے سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔ چونکہ بیشتر زبانوں سے میں ناواقف تھا، اس لئے حتمی رائے قائم نہیں ہوسکی۔ اس کی حد قیاس آرائی تک رہی۔ ایک دکان میں عربی، فارسی اور اردو تک کی کتابیں نظر آئیں۔ ان میں بھی صرف روسی نقطۂ نظر کی کتابیں نہیں ہیں بلکہ دوسرے موضاعات اور مکاتیب فکر کی کتابیں بھی شامل ہیں، جو غیر سیاسی اور خالص علمی ہیں۔ ایسی کتابوں کے ساتھ سوتیلے پن کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ انہیں بھی دوسری مطبوعات کی طرح نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔

کئی زبانوں میں ایک ہی موضوع کی نظموں کے نئے مجموعے نظر سے گزرے۔ عنوان ہے "لینن اور مشرق"۔ ان میں لینن سے متعلق افریقی ایشیائی شاعروں کی وہ نظمیں شامل ہیں جو لینن کی

صد سالہ تقریبات کے موقع پر کہی گئی تھیں اور سوویت یونین کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوگئی ہیں ۔ میں نے اردو ، فارسی اور عربی میں شائع ہونے والے ایسے مجموعے لے لئے ۔ پاکستانی شاعروں میں سے فیض احمد فیض کی نظم '' مرغ بسمل کی مانند شب تلملائی ،،۔ حسن حمیدی کی نظم ''عہد تابندہ ،،۔ مسلم شمیم کی نظم '' نذرماسکو ،،۔ قمر ہاشمی کی نظم '' میرا پیام محبت بنام لینن ،، اور دوسرے شاعروں کی نظمیں شامل اوراق ہیں ۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ ان اور دیگر پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف کرغزیہ زبان میں سب سے زیادہ مقبول ہیں ۔ حال ہی میں اس زبان میں نظموں کا ایک اور مجموعہ '' آزاد دا وولی ،، یعنی طوفان آزادی خوبصورت جلد میں شائع ہوا ہے ۔ اس میں جناب جوش ملیح آبادی ، ابن انشا ، قتیل شفائی اور احسان دانش کی تخلیقات شامل ہیں ۔ کرغزیہ کے ایک شاعرسلیمان مینولوف نے بنگلہ دیش کے عوامی شاعر جسیم الدین مرحوم کی نظموں کا ترجمہ کرنے میں حقیقی شاعرانہ جذبے سے کام لیا ہے ۔ ان کی دو نظموں '' سنہرا دیس '' اور '' گھر مسکراتے ہیں ،، کا خاص طور پر کامیاب ترجمہ کیا ہے ۔ مجھے اس حقیقت کا علم انگریزی متن سے ہوا جو کرغزیہ زبان کے ساتھ ساتھ شامل اوراق ہے ۔ سوویت یونین کی بہت سی کتابیں بیک وقت ایک ہی جلد میں دو یا تین زبانوں میں چھپتی ہیں ۔ مجھے یہ بات پسند آئی ہے ۔ نثرنگاروں میں سے پاکستان کے چند ادیب مثلاً احمد ندیم قاسمی ، شوکت عثمانی اور سعادت حسن منٹو یونین کی ریاستوں میں مقبول ہیں ۔

روزنامہ پراودا

میں نے روسی روزنامہ پراودا کے انگریزی ایڈیشن کا ایک

تازہ شمارہ خرید لیا۔ یوں تو یہ اخبار سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا پرچہ ہے اور وہی اس کا خرچ برداشت کرتی ہے لیکن اس میں ہر مکتبۂ فکر کی ترجمانی نہایت آزادی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ملک کے آئین کی دفعہ ۱۲۵ میں سوویت شہریوں کے جن بنیادی سیاسی حقوق کو بیان کیا گیا ہے، ان میں پریس کی آزادی بھی شامل ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

"ان شہری حقوق کی ضمانت محنت کش عوام اور ان کی تنظیموں کو، چھاپہ خانوں، کاغذ کے ذخیروں، عوامی عمارتوں، سڑکوں، مواصلاتی سہولتوں اور ان کے حقوق کے استعمال کے لئے درکار دیگر ضروری سازوسامان کا مالک بنا کر دی گئی ہے۔"

پراودا اخبار کی مجموعی تعداد اشاعت چورانوے لاکھ کے قریب ہے، یہ افتخار شاید کسی اور ملک کے کسی اخبار کو نصیب نہ ہو، پاکستان کا تو ذکر ہی کیا۔ اگر اس کے کسی اخبار کی اشاعت ایک لاکھ سے اوپر چلی جائے تو اسے صحافت کی دنیا کا ایک معجزہ ہی کہا جاسکیگا۔

معیشت کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھنے والے اخبارات متعلقہ وزارتوں اور محکموں کی جانب سے ان لوگوں کے لئے شائع کئے جاتے ہیں جن کا تعلق مختلف پیشوں سے ہے۔ مثال کے طور پر اس قسم کا ایک پرانا سوویت اخبار "گودوک" وزارت ریلوے اور ریلوے ٹرانسپورٹ ورکرز یونین کی مرکزی کمیٹی کی جانب سے شائع کیا جاتا ہے۔ طبی کارکنوں، تعمیراتی کمپنیوں، تجارت سے تعلق رکھنے والے کارکنوں، ادیبوں، شاعروں، ڈرامہ نگاروں، افسانہ نویسوں

اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے کارکنوں کے اپنے اپنے اخبارات ہیں۔ بڑے بڑے کارخانے، اجتماعی کھیت اور ادارے اپنے لئے چھوٹے سائز کے اخبارات نکالتے ہیں جن میں متعلقہ ادارے کی سرگرمیوں اور اس کے کارکنوں کی کامیابیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی بعض کوتاہیوں اور ان پر قابو پانے کے طریقوں کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔ مزدور، اجتماعی کسان اور دفتری ملازمین غیر ملازم نامہ نگاروں کی حیثیت سے ان اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعداد اشاعت جان بوجھ کر محدود رکھی جاتی ہے۔

دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے برعکس سوویت یونین میں کوئی ذاتی اشاعت گھر موجود نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا اخبار نکلتا ہے جو ایک فرد یا چند افراد کے گروہ کی ذاتی ملکیت ہو۔ اخبارات کی فروخت سے وہاں جس قدر رقم حاصل ہوتی ہے وہ ان اخبارات کی سربراہ تنظیموں کے کھاتے میں جمع ہوتی ہے۔ مدیران رسائل و اخبارات تک تمام کارکنوں کو ہر ماہ ان کے فرائض کی نوعیت کے بموجب تنخواہ یا معاوضہ ملتا ہے لیکن ان میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ امر ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ سوویت اقتدار کے قیام کے فوراً ہی بعد انسان کے ہاتھوں دوسرے انسان کے استحصال پر پابندی لگادی گئی اور دوسروں کی محنت خرید کر اس کے ذریعے سے مالدار بننے کے نظام کا خاتمہ کردیا گیا تھا۔ تمام کارخانے اور ادارے، آمد و رفت اور مواصلات کے وسائل جو پہلے نجی افراد کی ملکیت تھے، عوام کے ہاتھوں میں منتقل کردئے گئے۔ ان میں چھاپہ خانے اور اخبارات و رسائل بھی شامل تھے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سرمایہ دار اخبارات کی بھاری اکثریت کے لئے اشتہارات آمدنی کے اہم ترین وسائل میں سے ایک ہے۔ ایسے اخبارات کا آپس میں مقابلہ نہایت شدید ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اخبار کا مالک، خواہ ذاتی طور پر پسند کرے یا نہ کرے، مجبور ہوتا ہے کہ پابندی کے ساتھ ہر اشاعت میں قارئین کے ذوق اور ضرورت کا لحاظ رکھے بغیر، زیادہ سے زیادہ اشتہارات شائع کرے تاکہ خود دیوالیہ ہونے سے بچا رہے اور دوسرے ناشرین کے ساتھ مقابلہ کرسکے۔ ایسے اخبارات کے مالکان مجبور ہوتے ہیں کہ اشتہار دینے والوں کی مرضی اور منشا کے مطابق چلیں تاکہ وہ دوسرے اخبارات سے ناطہ نہ جوڑلیں اور اس طرح اخبار کو اس کے واحد یا ایک بڑے ذریعۂ آمدنی سے محروم نہ کردیں۔ اس کے برعکس سوویت یونین میں، جہاں اخبارات کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم آمدنی کا بڑا وسیلہ ہوتی ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔ چنانچہ اکثر اخبارات میں اشتہارات برائے نام یا بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ البتہ جو اخبارات صرف تجارتی مقاصد کے لئے مخصوص ہوتے ہیں، بہت سے اشتہارات چھاپتے ہیں۔ لیکن ان کی اشاعت قلیل ہوتی ہے۔ انہیں پڑھنے والوں کا طبقہ بھی مخصوص ہوتا ہے۔ اسی طرح فلمی اشتہارات بھی زیادہ تر فلمی پرچوں میں شائع ہوتے ہیں اور فلم کے شائقین انہیں خریدتے ہیں۔ اس طرح عام دلچسپی کے اخبارات کو انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں رائے عامہ کی ترجمانی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ لہذا عوام کی خواہشات کی ترجمانی کرتے ہوئے سوویت اخبارات ہر قسم کے دباؤ سے آزاد رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ایمان دار اور صداقت پسند بنے رہتے ہیں۔

مجھے بتایا گیا کہ صبح دس بجے کے بعد اخبارات و رسائل کی فروخت میں کسی قدر کمی ہوجاتی ہے کیونکہ انہیں خریدنے والے اس وقت تک خرید چکتے ہیں۔ اس کے بعد وہاں سے تصویری پوسٹ کارڈ، پمفلٹ، کتابچے، ٹکٹ، لفافے، خط لکھنے کا کاغذ، فلم اسٹاروں اور خلا بازوں کی تصاویر، بال پن اور مقبول نغموں کے ریکارڈ فروخت ہونے لگتے ہیں۔ پانچ بجے تک یہ گہما گہمی رہتی ہے۔ پھر شام کے اخبارات پہنچ جاتے ہیں اور عوام اپنے کام سے فارغ ہوکر گھروں کی طرف لوٹتے وقت انہیں خرید کر لے جاتے ہیں اور دن کی کسل دور کرنے کے لئے انہیں پڑھتے ہیں۔ ان میں کوئی گرما گرم خبر مشکل ہی سے چھپتی ہے۔

ہوٹل کے ہر کمرے میں مسافر کے ذوق یا لسانی واقفیت کا لحاظ رکھتے ہوئے روزانہ کے اخبارات رکھے جاتے ہیں۔ لیکن میں وہاں کے اخبارات کی کاپیاں پاکستان لے جانا چاہتا تھا، اس لئے ان کو خرید لینا مناسب سمجھا۔ میرے ایک اشارے پر میرے ذوق کے مطابق کتابیں بھی مل سکتی تھیں لیکن میں نے ان کی خریداری کو ترجیح دی۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ جب کتابوں کی قیمت روبل میں ادا کرنی چاہی تو کتب فروش نے امریکی ڈالر مانگے۔ حالانکہ اس سے قبل ہوٹل میں ہم نے ڈالر دینے چاہے تو منیجر نے روبل طلب کئے تھے۔ اسی قسم کا تضاد کئی جگہ دیکھنے میں آیا۔ کہیں امریکی ڈالروں کے لئے اصرار کیا گیا اور کہیں روسی روبل مانگے گئے۔ ایک جگہ اپنی حیرت دور کرنے کے لئے دریافت کرلیا کہ قاعدہ کیا ہے مگر تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔ اصل قاعدہ اپنی مرضی کا ہے۔ پھر بازار میں روبل کو ڈالر میں یا ڈالر کو

روبل میں بدلنے کا طریقہ آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک فارم بھرنا پڑتا ہے جو ہرجگہ میسر نہیں آسکتا۔

روسی میٹرو

کتابوں کے بازار سے فراغت پانے کے بعد روسی میٹرو کی سیر کا پروگرام بنا۔ مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ ماسکو میں زمین دوز ریلیں بھی چلتی ہیں۔ اب تک مجھے لندن اور پیرس کا تجربہ تھا۔ مس مارگریٹا پاؤلونا نے بتایا کہ ”نہیں جی، ماسکو میٹرو بھی خوب ہے۔“ وہ بہت اچھی اور بامحاورہ اردو بولتی ہیں۔ ان کے بعض محاوروں کے صحیح استعمال پر مجھے حیرت ہوئی ہے۔ ان کا ”اب نہیں جی!“ کا استعمال بڑا دلچسپ ہے۔ میں نے آج ان سے پوچھا کہ ”کیا آپ نے لندن کی میٹرو دیکھی ہے۔“ انہوں نے بتایا کہ میں تو اپنی زندگی میں روس سے باہر صرف ایک بار گئی ہوں۔ میں نے کہا کہ لندن تو بہت قریب ہے۔ انھیں بتایا کہ لندن سے میرا قریبی تعلق ہے۔ وہاں ہمدرد مطب اور دواخانہ ہے اور کبھی کبھی میں خود وہاں جاکر مطب کرتا اور مریضوں کے لئے طب مشرق کے طریقۂ علاج کے مطابق دوائیں تجویز کرتاہوں۔ میں آپ کو ایسے ہی کسی موقع پر لندن آنے کی دعوت دونگا۔ مس مارگریٹا نے بڑے دلچسپ انداز میں کہا: ”اس کی کوشش بھی نہ کیجئے۔“ اس جملے میں ایک جہان آباد تھا۔ میں نے اس موضوع پر خاموشی اختیار کرلی اور زمین دوز ریلیں دیکھنے کی تیاری کرلی۔

ماسکو میں زیر زمین کل نناوے ریلوے اسٹیشن ہیں۔ میں نے آج تیرہ چودہ اسٹیشن دیکھ لئے۔ ان کا نظام بڑا دلچسپ ہے۔

کسی بھی اسٹیشن پر لگی ہوئی مشین میں دس کوپک ڈال دیجئے اور اس کے بعد ''زیر زمین'' جب تک دل چاھے، رھئے، اور جھاں دل چاھے، ریل سے چلے جائیے۔ ھر اسٹیشن پر راستے بنے ھوئے ھیں اور ھر گزرگاہ پر مشینیں لگی ھوئی ھیں۔ اگر دس کوپک نہ ڈالے جائیں اور اندر جانے کی کوشش کی جائے تو ناکامی ھوگی۔ راستہ بند ھوجائیگا۔ میں نے تجربے کے طور پر ایسا کرنا چاھا لیکن ارادہ ترک کردیا۔ لندن میٹرو اور پیرس میٹرو میں بھی پھلے یھی قاعدہ تھا کہ ایک بار داخل ھوکر چاھے رات تک نہ نکلیں مگر اب اسے منسوخ کردیا گیا ھے۔ سیزن ٹکٹ جن کے پاس ھیں، ان کا راستہ الگ ھوتا ھے اور چک کرنے کے لئے عورتیں موجود رھتی ھیں۔ یوں بھی میٹرو پر زیادہ تر عورتیں ھی کام کرتی ھیں اور اکثریت بوڑھی عورتوں کی ھے۔ بعض بڑے اسٹیشنوں کی خودکار سیڑھیوں پر بوڑھی عورتیں کرسی پر نیم دراز دیکھی گئیں۔ میں نے مارگریٹا سے پوچھا: ''یہ صاحبہ یھاں کیوں تشریف فرما ھیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''چونکہ بعض جگہ یہ سیڑھیاں بھت بلند ھیں، کوئی بھی حادثہ پیش آسکتا ھے، اس لئے یہ فرسٹ ایڈ اور دوسری قسم کی امداد کے لئے متعین ھیں۔'' یہ بات مجھے اچھی معلوم ھوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سوویت یونین کی حکومت عوام کا کس درجہ خیال رکھتی ھے۔

ماسکو میٹرو کا استعمال بھی خوب ھے، بالخصوص شام کے وقت، جو ھم نے پسند کیا تھا۔ اس وقت بڑی آمد و رفت اور خوب چھل پھل رھتی ھے۔ ٹرینیں بڑی تیز رفتار ھیں اور بکثرت ھیں۔ ھر دو منٹ کے بعد ٹرین ضرور ھی مل جاتی ھے۔ زیادہ دیر انتظار

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر ایک میں ڈبوں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے اور سب بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اس طریقۂ سفر کو پسند کرتے ہیں۔ میں نے تیرہ چودہ اسٹیشنوں کی سیر کی اور کہیں بھی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ بہرحال دو گھنٹے کا یہ تجربہ بہت ہی دلچسپ اور معلومات افزا رہا۔ لوگوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بعض ڈبوں کے بارے میں تو یہ گمان ہوا کہ شاید یہ مطالعے کے کمرے ہیں۔ ہر شخص کے ہاتھ میں کتاب تھی اور ہر شخص پوری محویت کے ساتھ مطالعے میں مشغول تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر طالب علم امتحان دینے جا رہا ہے۔ مطالعہ کا یہ ذوق خوب ہے۔ لندن میٹرو میں بھی آدھے سے ذرا کم ہی مسافر اخبار بینی کرتے نظر آتے ہیں۔ پیرس میں مطالعہ کرنے والوں کی تعداد برائے نام ہوتی ہے۔

یہاں میٹرو میں میری نگاہیں اختلاط مرد و زن دیکھنا چاہتی تھیں۔ میں نے اپنی توجہ کو مرکوز اور نگاہوں کو تیز رکھا مگر ماسکو میٹرو میں ڈبوں کی سیٹوں پر کوئی بےہودگی نظر نہ آئی۔ اس شائستگی اور انسانیت پر اطمینان ہوا۔ پیرس میٹرو میں اب سے چند سال پہلے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میٹرو مظاہرۂ حیوانیت کے لئے ہے مگر چارلس ڈیگال نے ذہنی انقلاب برپا کیا اور جب ۱۹۷۳ء میں مجھے پھر پیرس میں کوئی مہینہ بھر تک رہنے کا اتفاق ہوا اور کم خرچ میٹرو استعمال کرنے کا زیادہ موقع ملا تو میں نے ایک ماہ میں صرف ایک بار بارہ بجے شب ایک جگہ بوس و کنار دیکھا جبکہ لندن میں آج بھی اس مشغلے میں زیادتی ہی ہوتی جا رہی ہے۔ جہاں تک ماسکو میٹرو کا تعلق ہے ایسا نہیں ہوتا۔

میں نے اس دوران میں خاص طور پر یہ چیز نوٹ کی کہ ان ریلوں میں، جہاں روز روشن میں بھی بلب جلتے ہوتے ہیں، کوئی بیہودگی نہیں ہوتی۔ ہر عورت و مرد کو، ہر بوڑھے اور جوان کو اپنے کام سے کام ہے۔ ہنسی ٹھٹھول تک کا کوئی مظاہرہ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ کسی عورت کو چھیڑنا تو بڑی بات ہے، نظر جما کر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ جبکہ مرد اور عورت سب ایک ساتھ چڑھتے، اترتے اور بیٹھتے ہیں۔ یہ نظم و ضبط قابل تعریف ہے۔

البتہ ایک خاص بات یہ ہے کہ ۱۹۷۰ء میں جب میں ماسکو پہلی بار آیا تو یہ نوٹ کیا تھا کہ لوگ بالکل خاموش تھے۔ نہ ہنستے تھے، نہ کھیلتے تھے۔ لینن کے مزار پر اور کریملن کے احاطے میں بھی لوگ گم صم نظر آئے۔ مزار لینن کے قریب ایک بڑا اسٹور ہے، اس کا نام ''گم'' ہے۔ میں نے سوچا کہ شاید لوگ یہاں اسی لئے گم صم رہتے ہیں۔ مگر اس بار یعنی ۱۹۷۸ء میں مزاج کی تبدیلی محسوس کی۔ لوگ اپنے چہروں پر اب مسکراہٹ کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

لندن میٹرو اور پیرس میٹرو کے کم و بیش ہر اسٹیشن پر اشتہارات کی بھرمار دیکھی گئی۔ ہر اسٹیشن کی دیواریں معقول اور نا معقول اشتہارات سے لپی ہوئی دیکھی گئیں اور خود ریل کے ڈبوں میں اشتہارات کی بھرمار ہے۔ ان کے برعکس ماسکو میٹرو میں کسی بھی اسٹیشن کی دیواروں پر یا ریل کے ڈبوں کے اندر کوئی اشتہار نظر نہیں آیا۔

ماسکو میٹرو کا ہر اسٹیشن کسی نہ کسی واقعہ کی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے اور حسن و جمال کا ایک منظر پیش کرتا ہے۔

ایسے جاندار اور خوب صورت اسٹیشن میں نے تو کہیں اور دیکھے نہیں ۔ ہر جگہ سنگ سفید کا استعمال بڑی فراوانی سے کیا گیا ہے۔ روشنی کے لئے ہر اسٹیشن پر الگ الگ نمونے کے جھاڑ آویزاں ہیں ، ایسے کہ دیکھ کر دل خوش ہوجائے ۔ ایسے جھاڑ فانوس تو عموماً محلات میں ہوا کرتے ہیں ۔

ایک اسٹیشن روس کی سب سے اہم شخصیت لینن کے نام سے منسوب ہے ۔ ان کے اقوال اسٹیشن کی دیواروں پر بڑی خوب صورتی کے ساتھ رنگین حروف میں لکھے گئے ہیں ۔ کوئی قول کسی واقعہ سے متعلق ہے تو اس کی نقشہ کشی بھی کی گئی ہے ۔ حتیٰ کہ زینوں پر جو ریلنگ ہے ، اس کے نقش و نگار میں بھی کوئی نہ کوئی قول ثبت کیا گیا ہے ۔ ہر اسٹیشن پر یہی حال ہے ۔ غرض میٹرو کے اکثر اسٹیشن کسی نہ کسی تاریخ کے حامل ہیں ۔ میں نے اس انداز فکر اور طرز عمل کو دل چسپی کے ساتھ دیکھا اور میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا ۔ میں نے اس کا اثر بھی قبول کیا ۔ ایسے کام صرف وہی اقوام و ملل کرسکتی ہیں جو زندہ رہنا چاہتی اور زندہ رہنے کے طریقے جانتی ہیں اور زندہ لوگوں کو ہمنوا بنانے پر کمربستہ ہیں ۔ میں نے چشم تصور سے وطن عزیز کا مشاہدہ کیا تو کم سے کم کراچی کا نقشہ برعکس نظر آیا ۔ یہاں گلیوں اور سڑکوں ، محلوں اور بازاروں میں لوگ چلتے پھرتے اوباشی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ ھنسی مذاق ہی نہیں، ایزا رسانی، دھکم پیل معمولات زندگی میں شامل ہوگئے ہیں ۔ انسانیت کچلے ہوئے سانپ کی طرح رینگتی نظر آتی ہے ۔

میٹرو کی سیر دو گھنٹے میں ختم ہوئی اور اس دوران میں

سگریٹ یا سگار کا ذرہ برابر دھواں پھیپھڑوں میں نہیں گیا۔ میٹرو میں سگریٹ نوشی ممنوع ہے۔ اس ممانعت کا ہر شخص احترام کرتا ہے۔ حالانکہ اس ضمن میں کوئی ھدایت کہیں لکھی ہوئی نظر نہیں آتی۔ ہمارے ملک کی شاید ہر بس میں "سگریٹ نوشی منع ہے"، لکھا ہوا نظر آئیگا لیکن کنڈکٹر اور ڈرائیور سمیت اکثر مسافر یہ شغل کرتے نظر آئیں گے اور پاس بیٹھے ہوئے مسافر کا ذرا لحاظ نہیں کرینگے۔ میٹرو میں اگر کوئی شخص سگریٹ پیتا نظر آجائے تو سمجھ لیجئے کہ وہ غیر ملکی ہے اور شہر کے قانون سے ناواقف ہے۔

میں نے اس دوران میں ایک بڑا دلچسپ مطالعہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ تمام چہروں پر ایک فلسفیانہ برد باری اور سنجیدگی طاری ہے۔ کسی مرد یا عورت کا مسکراتا چہرا نظر نہیں آیا۔ نہ کسی کا قہقہہ سنائی دیا۔ ہوائی جہاز ھی سے اس مطالعے کا آغاز ہوا تھا اور اس وقت تک ہزاروں روسی چہرے مسکراہٹ کے بغیر دیکھ لئیے۔ ہوٹل نیشنل کے کاؤنٹر پر بھی چار خواتین مومی مورتیوں کی طرح دکھائی دیں مگر کیا مجال کہ ان کے چہروں کی سنجیدگی بلکہ یوں کہئے کہ ان کے ماتھے کے بل ذرا بھی دور ہوجائیں۔ لفٹ میں، کمروں کی خادمائیں، سب کے چہرے مسکراہٹ کے بغیر تھے۔ شاید اوقات کار میں یہ ان کے فرائض کا جزو تھا۔ اسکے بعد وہ مسکرانے اور قہقہے لگانے کےلئے وقت نکالتے ہونگے۔

اچھی طرح سیر کرلینے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا تو میں نے مس مارگریٹا پاؤلونا کو مخلصانہ مشورہ دیا کہ وہ یہاں سے ھی اپنے گھر چلی جائیں کیونکہ وہ ماسکو سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے اور میٹرو کے ذریعہ سے ھی انہیں جانا تھا۔ میں نے یقین دلایا

کہ میں تنہا ہوٹل یوکرائن چلا جاؤنگا۔ لیکن وہ اللہ کی بندی نہ مانی۔ اسے اپنی ذمہ داری کا پوری طرح احساس تھا۔ مجھے اس نیک خاتون پر ترس آرہا تھا کیونکہ اب سردی کی لہر زیادہ شدید ہوگئی تھی۔ یہ درست ہے کہ وہ اس کی عادی تھیں لیکن پھر بھی سردی محسوس تو سب کو ہوتی ہے۔ لیکن میرے مشورے کے برعکس وہ ہوٹل تک ساتھ آئیں اور مجھے ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ کر چلی گئیں۔

میں اس دوران میں اتنا تھک گیا تھا کہ قوا جواب دے گئے تھے۔ بازار میں پیدل چلنے کے علاوہ میٹرو کی دو گھنٹے کی سیر میں بھی بہر حال پیدل ھی چلنا پڑا۔ مجموعی طور پر سولہ سترہ میل کی مسافت طے کی۔ اپنی پرانی عادت ترک کردینے کے باعث اور کچھ تقاضائے عمر کی وجہ سے زیادہ پیدل چلنا اب اکھرنے لگا ہے۔ ورنہ ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب میں پہاڑوں پر ۱۵-۲۰ میل روزانہ چلتا تھا اور کوئی تھکن نہیں ہوتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد میں کراچی آگیا تو زندگی کے معمولات بدل گئے۔ اب گھر سے مطب اور مطب سے ھمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کا دفتر معمول بن گیا ہے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ ھفتے میں دو تین دن صبح ٹینس کھیلنے کا وقت نکال لیتا ہوں ورنہ تو صحت ھی خراب ہوجائے۔ میٹرو سے واپس آنے کے بعد یہ جی چاھتا تھا کہ فوراً آرام کرنے کے لئے بستر پر دراز ہوجاؤں لیکن بھوک نے بھی سخت بیتاب کر رکھا تھا۔

میں نے غسل خانے میں جاکر ھاتھ منہ دھویا تاکہ ذرا ترو تازہ ہوجاؤں۔ پھر کھانے کے ھال میں چلا گیا۔ اگر انسان دن کو کچھ نہ کھائے اور ناشتہ بھی ھلکہ کرے تو رات کا کھانا تو

سیر ہو کر کھانا چاہئے۔ ہال میں چند لوگ پہلے سے موجود تھے۔ آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ زیادہ تر مقامی باشندے تھے۔ یہاں کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر بار کھانے کے پیسے نقد دینے ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ہوٹل میں مقیم مسافر کھانا کھائیں اور بل پر دستخط کردیں اور اپنے کمرے کا نمبر ڈال دیں تاکہ کھانے کی رقم ہوٹل کے بل میں کرائے وغیرہ کے ساتھ محسوب ہوجائے۔ یورپ میں ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے مگر ماسکو میں اور ممکن ہے تمام سوویت یونین میں بل فوراً ادا کرنا ہوتا ہے۔

میں جب ہال میں داخل ہوا تو کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی منتظمہ نے مجھے پہچان لیا کہ میں مہمان ہوں مگر میرے ساتھ چونکہ مس مارگریٹا نہیں تھیں، جن کو میری طرف سے بل ادا کرنا تھا، اسلئے وہ خاتون ذرا مذبذب تھی۔ میں نے اس کی گھبراہٹ محسوس کی اور اس کا تذبذب دور کردیا۔ میں نے اشارے سے بتایا کہ میں بل کی رقم ادا کر دونگا۔ اس نے اپنی زبان میں سوال کیا "مولیا" یعنی آپ کے پاس بل ادا کرنے کے لئے پیسہ ہے۔ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ مطمئن ہوگئی اور بیرے کو اشارہ کیا کہ مجھے اس روز کا مینو دکھا دیا جائے۔

طعام برائے نام

میرا قاعدہ ہے کہ میں دوسرے ملک میں جا کر گوشت کھانے سے اجتناب کرتا ہوں کیونکہ یہ یقین نہیں ہوسکتا کہ جانور اسلامی طریقے سے ذبح کیا گیا ہے۔ لہذا میں نے ٹماٹر کا سوپ اور ابلے ہوئے انڈے نیز ڈبل روٹی کے توس منگوا لئے۔ یہ

میرے لئے کافی سامان خوراک تھا ۔ ہوٹل کے کارکنوں کو تعجب ضرور ہوا ہوگا کیونکہ ایسی فرمائش کبھی کسی نے نہیں کی ہوگی ۔ آخر میں آئس کریم نے لطف دیدیا ۔ ہال میں دوسرے لوگ گرم کافی پی رہے تھے کیونکہ موسم سرد تھا ۔ ہال کے ایک گوشے میں آرکسٹرا کا اہتمام تھا ۔ مغربی انداز کا گانا بجانا ہورہا تھا لیکن میرے لئے اس میں کوئی سامان نشاط نہیں تھا بلکہ میرے کانوں کے پردے لرز رہے تھے ۔ اپنے ملک میں جو پکا گانا گایا جاتا ہے اس سے بھی یہی کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے ۔

میں ہوائی جہاز کے ہر سفر میں عموماً آرام سے سوجاتا ہوں ۔ کرسیاں آرام دہ ہوں اور پاؤں پھیلانے کی جگہ مناسب ہو تو کسے نیند نہیں آسکتی ۔ لیکن ایئرو فلوٹ کے اس ہوائی جہاز نے ، جس سے میں نے سفر کیا ، کرسیاں غیر آرام دہ تھیں اور پاؤں پھیلانے کی جگہ نہیں تھی ۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اس نے میرے ہاتھ پیر توڑ دئے تھے ۔ جسم چور چور ہورہا تھا ۔ ہوائی اڈے سے ہوٹل پہنچنے پر ارادہ تھا کہ ایک دو گھنٹے خاموش لیٹ کر آرام کروں اور ساری تھکن دور کردوں لیکن ایک گھنٹے بھی کمر سیدھی کرنے کا موقع نہیں ملا ۔ سارے دن مصروفیت رہی ۔ اس پر پیدل چلنا مستزاد ہوگیا ۔ یہی وجہ ہے کہ جب رات کو سونے سے قبل اپنی دیرینہ عادت کے مطابق میں نے مسعود مفتی صاحب کی کتاب پڑھنے کی کوشش کی تو ایک پیرا گراف بھی حاضر دماغی کے ساتھ نہ پڑھ سکا ۔ فوراً آنکھ لگ گئی ۔ ایسا سویا کہ صبح کی خبر لایا ۔ رات بھر ایک ہی کروٹ سویا جو خلاف معمول تھا ۔ تاہم اس گہری نیند نے میرے انجر پنجر کہ جو ڈھیلے ہوگئے تھے ، خوب کس دئے

بالکل اسی طرح جیسے سازندہ سارنگی کے تار کس کر سر ساگر کی تیاری کرتا ہے۔ میں بھی تمام دن اس نئی سرزمین پر علمی اور ادبی جدو جہد کے لئے تیار ہو گیا۔

میرے دوست مسعود مفتی نے دو کتابیں حال ہی میں لکھی تھیں — ''لمحے'' اور ''ریزے''۔ میں یہ دونوں کتابیں اپنے ساتھ انتقاماً لے آیا تھا۔ سوچا تھا کہ یہاں فرصت کے لمحات میں پڑھ لونگا۔ یہ مشرقی پاکستان کے بارے میں ہیں۔ مشرقی پاکستان کا تاریخی سانحہ اس علاقے سے بھی تعلق رکھتا ہے جہاں میں اس وقت ٹھیرا ہوا تھا۔

دستکاری کی دکان میں

میں ناشتہ کر چکا تھا اور صبح کا ایک اخبار پڑھ رہا تھا جو ہوٹل کے منتظمین نے فراہم کردیا تھا کہ مس مارگریٹا پاؤلونا نو بجے کے قریب آگئیں۔ ان کی ذمہ‌داری کا دائرہ صرف مجھ تک وسیع تھا۔ یعنی میری ترجمانی ان کے فرائض میں داخل تھی۔ میں نے خیال کیا کہ جب فیض صاحب آجائیں گے تو شاید ان کی ترجمان بھی یہی خاتون ہونگی اور یہ ''شرکت غیرے'' کے مترادف بات ہوگی۔ ظاہر ہے کہ میں یہی چاہونگا کہ مس مارگریٹا فیض احمد فیض صاحب کا زیادہ خیال کریں۔ وہ بزرگ ہیں۔ پھر روس میں ان کا مقام بلند ہے۔ وہ لینن پرائز یافتہ ہیں کہ جو روس کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ اس وجہ سے فیض صاحب کو روس میں ہر پاکستانی سے زیادہ تفوق حاصل ہے اور ان کا مرتبہ بھی بلند ہے۔ شاید یہ کہنا بھی زیادہ غلط نہ ہوگا کہ جناب فیض پاکستان میں روس کے

نمائندے ہیں ۔ اس وجہ سے ان کو پاکستان میں بھی پورا تحفظ حاصل ہے ۔ کوئی ان کا بال بیکا نہیں کرسکتا ۔

ابھی وقت تھا ۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ قریب ہی روسی دست کاری کی جو چند دکانیں اور کھلونوں کا ایک مرکز ہے، وہاں جانا چاہئے ۔ ان کو دیکھ لینا معلوماتی اعتبار سے مناسب تھا ۔ لہذا مس مارگریٹا اور میں پیدل چل پڑے ۔ یہاں کی سیر بڑی دلچسپ رہی ۔ دستکاری کی دکانوں میں سے ایک دکان میں چینی مٹی کے ظروف رکھے تھے جو بہت ہی قابل دید تھے ۔ خصوصاً چائے کے سیٹ مجھے بہت پسند آئے ۔ ان پر جو مختلف رنگوں میں ہاتھ سے نقاشی کی گئی تھی وہ بےحد جاذب نظر تھی ۔ دوسرے ظروف میں مرتبان ، پیالے، رکابیاں اور حقے قابل ذکر تھے ۔ روس میں اس فن کو ۱۷۶۶ء میں یعنی روسی ملکہ کیتھرائن دوم کے عہد میں فروغ نصیب ہوا تھا ۔ اب کئی فیکٹریاں اس صنعت میں حصہ لے رہی ہیں ۔ اس کی تاریخ بہت دلچسپ ہے ۔ اس اٹھارہویں صدی میں فرانس کی ایک فرم روس سے عمارتی لکڑی خریدتی تھی ۔ روسی جہاز جب لکڑی کے سلیپر فرانس کے ساحل پر اتار کر واپس آتے تو کوئی اور وزنی چیز نہ ہونے کے باعث جہاز کا حصہ مطلوبہ سطح تک پانی میں ڈوب نہیں سکتا تھا ۔ اس لئے ساحل کے قریب ملنے والی ایک خاص قسم کی مٹی اس میں بھری جاتی اور روس آ کر اسے ساحل کے قریب ڈال دیا جاتا ۔ رفتہ رفتہ اس مٹی کا ایک پہاڑ بن گیا ۔ پھر ایک صنعت کار کو خیال آیا کہ اس مٹی سے استفادہ کیا جائے ۔ تجربات کے بعد اسے ظروف کے لئے مفید پایا گیا ۔ وہ مٹی ختم ہوگئی اور جہازوں کا سابقہ نظام بھی بدل گیا تو خود روس میں اس قسم

کی مٹی کی چھان بین شروع ہوئی اور ماسکو کے قریب ہی پہاڑوں میں اس کا پتہ لگا لیا گیا ۔ اب یہ ملک دوسرے علاقے کا محتاج نہیں رہا ۔ کئی کارخانے وجود میں آگئے۔ میں نے بہت سے ڈیزائن پسند تو کئے لیکن یہ سوچ کر مایوسی ہوئی کہ ان کو وطن تک لےجانا آسان کام نہیں ہے۔ نہ اتنا زرمبادلہ میرے پاس تھا نہ جہاز میں منظور شدہ وزن میں گنجائش تھی ۔ لہذا صرف اس سامان کی زیارت پر اکتفا کیا ۔ ایک اور دکان کھلونوں سے بھری ہوئی تھی ۔ وہ سادے، روغنی، چوبی اور کپڑے کے تھے۔ زیادہ تر لڑکیوں کے ذوق کو مد نظر رکھا گیا تھا ۔ بعض کھلونے وضع قطع کے اعتبار سے ان کھلونوں سے ملتے جلتے تھے جو برصغیر پاک و ھند میں ہولی دیوالی یا دوسرے تہواروں کے موقع پر بکتے ھیں ۔ میں نے ان کو بھی دیکھ لینا کافی سمجھا ۔ کچھ دکانیں گھریلو دستکاریوں یعنی کاٹج انڈسٹری کی تھیں ۔ ان میں بعض اشیاء انتہائی دلچسپ بلکہ دل پسند تھیں ۔ مثلاً قروشئے سے تیار کئے ہوئے خواتین کے پہننے کے کپڑے ترغیب خریداری دے رہے تھے مگر قیمتیں ان کی ایسی تھیں کہ جو سامان پسند آجائے، اسے میں خرید نہیں سکتا تھا ۔ اس سر زمین پر رہتے ہوئے جیب اجازت نہیں دیتی تھی ۔ مجھے اس سفر کے لئے صرف تیس ڈالر ملے تھے کیونکہ یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ میرے تمام اخراجات سرکاری طور پر برداشت کئے جائیں گے۔ لیکن ظاھر ہے کہ اس میں خریداری کی کوئی مد شامل نہیں ہوسکتی تھی - کوئی ذریعہ ممکن بھی ہو تو مجھے پسند نہیں تھا ۔

میں نے سفارت خانہٴ پاکستان کے جناب اقبال صاحب سے دریافت کیا کہ مجھے مختلف موقعوں پر کتنی ٹپ ادا کرنی چاھئے ۔

"ایک یا دو روبل" ان کا جواب تھا اور یہ ٹھیک ھی تھا - مجھے کچھ کچھ تجربہ ہو چلا تھا - مثلاً اپنا اوورکوٹ کسی نگراں کے پاس عارضی طور پر رکھوا دیا گیا تو ایک روبل ادا کرنا پڑگیا - زرمبادلہ کے نرخ کے مطابق ایک روبل پاکستان کے چودہ رپے کے برابر ہوتے ھیں - ایک سو امریکی ڈالر کے ستر روبل ملتے ھیں - اس سرکاری نرخ سے قطع نظر سنا ھے بازار میں زیادہ بھی مل جاتے ھیں - مگر تیس ڈالر کی قیمت بڑھانے کے لئے مجھے ناجائز کاروبار کا سہارا لینا پڑتا اور یہ مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا - یہ کھیل کھیلنے کے لئے اپنے ضمیر کو کچل کر اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈالنا پڑتا ھے - بہت سے دوسرے لوگوں کے لئے یہ بات معمولات زندگی میں داخل ھے - میں نے ھمیشہ اس سے اجتناب کیا ھے - بس اتنی بات ھے کہ اس اصول کو برقرار رکھنے کے لئے نقصان اٹھانا یا کم سے کم مایوس و محروم ہونا پڑا ھے - یہ غنیمت ھے - میں نے فیصلہ کیا کہ وہ قدم نہیں اٹھایا جائیگا جہاں ٹپ دینا پڑے -

روبل نہیں ڈالر

ایک دکان ایسی بھی دیکھی جہاں ھر چیز کی قیمت وصول کرتے وقت صرف ڈالر قبول کئے جاتے ھیں - یہ کتابوں کی دکان ھے - میں نے وہاں ماسکو کے بارے میں ایک مصور کتاب دیکھی - اسے دس امریکی ڈالر دے کر خرید لیا - یہ انگریزی زبان میں تھی اور ماسکو ھی کے ایک ناشر نے اسے چھاپا تھا - اس بازار کی باقی سب چیزوں کو میں عجائب گھر میں رکھی ہوئی اشیائے ممنوعہ

کی طرح صرف دیکھ کر آگے بڑھتا رہا ۔ اگر خریداری کا شوق مجھے ترغیب دیتا تو خواہ مخواہ دل دکھتا ۔ خصوصاً کتابوں کے معاملے میں عموماً میری نیت خراب ہونے لگتی ہے اور میں دل تھام کر رہ جاتا ہوں ۔ میری حالت یہ ہے کہ اگر مجھے اچھی کتابیں کہیں نظر آجائیں تو میں اپنے کپڑے فروخت کر کے ان کو خرید لونگا ۔ مگر ماسکو میں مجھے یہ سوچنا بھی پڑا کہ میری یہ سرد شیروانی اس سخت سرد مقام پر کون خریدیگا ! ممکن ہے کہ کسی عجائب گھر کا منتظم اسے ایک عجوبۂ روزگار سمجھ کر خریدلے اور اپنے عجائب گھر کی زینت بنادے !

اگر ہوٹل میں وقت ملاقات مقرر نہ ہوتا تو شاید کچھ اور دکانوں میں چیزوں کے دیدار کئے جاتے ۔ لہذا ہوٹل واپس آجانا پڑا ۔ ٹھیک پونے بارہ بجے '' مادام بلبل '' آگئیں ۔ مادام سولووی اووا مالی ڈورا تاتیانا مجھسے ملنے آگئیں ۔ ان کے روسی نام کا فصیح ترجمہ '' بلبل '' ہوتا ہے ۔ یہ مارگریٹا نے بتایا تھا ۔ (دروغ بر گردن مترجم) مادام سولووی اووا کا تعلق نیشنل کمیشن برائے یونیسکو روس سے ہے ۔ یہ یہاں نائب نگراں ہیں ۔ کورئر کے روسی ایڈیشن کی مدیرہ ہیں ۔ یونیسکو کے زیر اہتمام کورئر سولہ زبانوں میں نکلتا تھا ۔ میری کوشش سے وہ اردو زبان میں میری ہی ادارت میں چند ماہ سے نکلنے لگا ہے ۔ اس طرح اس کی اشاعت دنیا کی سترہ زبانوں میں ہونے لگی ہے ۔ سال گزشتہ پیرس میں مدیران کورئر کا جو اجلاس ستمبر میں منعقد ہوا تھا ، اس میں مجھے بھی شریک ہونا پڑا تھا ۔ مادام سولووی اووا نے بھی اس میں شرکت کی تھی اور ان سے میری ملاقات بس وہیں پیرس میں ہوئی تھی ۔ انہوں نے

آخری دن میرے بارے میں یہ ریمارک پاس کیا تھا : ''حکیم سعید تم بہت گہرے آدمی ہو۔ اوپر سے ٹھیرے ہوئے دکھائی دیتے ہو لیکن اندر ایک تلاطم برپا رہتا ہے۔'' میں ان کی اس رائے کے خوب مزے لیتا رہا۔ اب دوسری ملاقات کے وقت سوچا کہ ان سے پوچھوں کہ آپ اپنی رائے پر قائم ہیں یا کچھ ترمیم کردی ہے، لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔

شوہر نصف ترک بیٹا پاؤ ترک

مادام سولووی اووا کے شوہر کے والد ترک نژاد تھے۔ اس لئے وہ اپنے شوہر کو نیم ترک اور اپنے بیٹے کو پاؤ ترک کہتی ہیں۔ ان کے صاحبزادے ان دنوں واشنگٹن میں روسی سفارت خانے سے وابستہ ہیں۔ مادام خود بھی شروع میں امریکہ میں چار سال تک روسی سفارت خانے میں کام کرچکی ہیں۔ ان کی سیاسی زندگی بڑی دلچسپ ہے۔ انہوں نے جرمن زبان سیکھ لی تھی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی میں مقیم تھیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد نیورمبرگ ٹرائل شروع ہوا تو اس میں مادام سولووی اووا شریک تھیں۔ دیکھا جائے تو ان کے سیاسی کیرئر کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ہٹلر کے معتمد خاص ھرھیس کے بارے میں بتایا کہ وہ کم از کم سات مہینے تک یہ تاثر دیتا رہا کہ وہ حافظے سے محروم ہے اور اسے بالکل کچھ یاد نہیں ہے۔ اس کے وکلاء بھی مسلسل یہی کہتے رہے کہ ھرھیس یاد داشت کھو چکے ہیں۔ مگر سات ماہ کے بعد ھرھیس نے خود ہی اعتراف کرلیا کہ میں عدالت کو سات ماہ تک غلط تاثر دیتا رہا ہوں۔ مجھے بہت کچھ یاد ہے۔

ہوٹل سے نزدیک ریستوراں پراگ ایک معروف جگہ ہے۔ آج مادام موصوفہ نے دن کے کھانے کے لئے مجھے مدعو کیا اور اپنے ساتھ وہاں لے گئیں۔ میں نے واضح طور پر یہ مسئلہ ان کو سمجھا دیا کہ میں فل لنچ کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ محض ناشتے کے طور پر کچھ کھا پی لیتا ہوں۔ اب سوال یہ تھا کہ دودھ کہاں سے آئے۔ ریستوراں میں چائے یا کافی کے لئے پوڈر کا دودھ تو مل سکتا تھا لیکن ویسے پینے کے لئے دودھ کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ٹماٹر کے رس کو دودھ کا نعم البدل بنالیا۔ اس کے علاوہ حسب معمول ابلے ہوئے انڈے اور ڈبل روٹی پر اکتفا کیا۔ علاوہ ازیں کووی آر (مچھلی کے انڈے) بڑے مزیدار تھے۔ میں نے ان کا استعمال کیا۔ پروٹین کے لئے اس سے بہتر اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔ مگر ہے بڑی گرم شے۔ ۱۹۷۵ء میں بابا جان غفوروف نے کوئی چھے سات پونڈ کووی آر کا ڈبہ مجھے عطا فرمایا تھا۔ ہدایت تھی کہ میں اسے پیرس لے کر نہ جاؤں۔ وہاں کی حکومت اسے ضبط کرلیگی۔ لہذا میں اسے لندن لے گیا۔ وہاں دریافت کرنے پر قیمت کا اندازہ ہوا کہ وہ پانچ چھے ہزار رپے کے برابر تھی۔ میں نے یہ ہدیہ خضر نقوی صاحب کو دیدیا کہ وہ اس سے اپنے انگریز دوستوں کی خاطر تواضع کریں۔ میں نے خود استعمال نہیں کیا۔ لندن میں اس کی بڑی شہرت ہے۔ کووی آر بڑے مقوی باہ بھی ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی تجربہ نہیں کیا۔

مادام سولووی اووا سے دو گھنٹے تبادل خیال کیا۔ اور طے یہ پایا کہ دوسرے دن میں نیشنل کمیشن فار یونیسکو کے دفتر میں ساڑھے بارہ بجے پہنچ جاؤں۔ وہاں میری ملاقات سکریٹری جنرل

سے ہوگی اور لنچ بھی وہی دینگے ۔ سکریٹری جنرل جناب نکولائی ای میرنوف ہیں ۔ یہ بالکل واضح تھا کہ ہماری گفتگو کا دائرہ یونیسکو کے ماہنامہ کورئر سے بطور خاص متعلق ہوگا ۔ یونیسکو کے صدر مقام واقع پیرس میں کورئر تین زبانوں میں یعنی انگریزی، فرانسیسی اور روسی میں مرتب ہوتا ہے اور پھر دنیا کی سولہ اور زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوکر مقامی طور پر چھاپا جاتا ہے۔ حال ھی میں پاکستان سے اردو زبان میں اس کی اشاعت میری ادارت میں عمل میں آئی ہے ۔ اس لئے میر نوف صاحب اس ضمن میں مجھسے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے یقین کرلیا کہ یہ مذاکرات طرفین کے لئے مفید ثابت ہونگے۔ مادام نے مجھے ڈھائی بجے ہوٹل لاکر چھوڑ دیا ۔ اور کل تک کے لئے "چیری او" پر آج کی ملاقات ختم ہوگئی ۔

کمرے میں آیا تو مس مارگریٹا پاؤلونا میرے انتظار میں موجود تھیں ۔ اب کوئی طے شدہ پروگرام نہیں تھا ۔ اس لئےمناسب سمجھا گیا کہ آوارہ گردی پھر شروع کردی جائے ۔ چنانچہ ہم دونوں نکل کھڑے ہوئے اور ماسکو کی سڑکوں کا طول و عرض ناپتے رہے ۔ دکانوں میں جاکر مصنوعات اور بعض نوادرات کا جائزہ بھی لیا گیا ۔ یہ آوارہ گردی چھے بجے تک جاری رہی ۔ اس وقت سامنے ہوٹل میٹرو پول آ گیا ۔

تین سال پہلے کی پریشانی

اس ہوٹل میں ۱۹۷۰ء کے دوران سفر میں نے ایک دن قیام کیا تھا ۔ میرے ساتھ جمیل الدین عالی صاحب بھی تھے ۔ ہم

دونوں نے کفایت شعاری کے خیال سے ایک کمرہ لیا تھا کیونکہ کرائے کے طور پر ساٹھ امریکی ڈالر ادا کرنے تھے۔ کراچی سے روانہ ہوتے وقت ہم دونوں کو بتیس بتیس ڈالر ملے تھے۔ ان میں سے تیس تیس ڈالر کمرے کے کرائے میں خرچ ہوئے۔ اب بتائیے چار ڈالر میں مشترکہ طور پر ہم دونوں کیا کرتے۔ جمیل الدین عالی صاحب کی رائے تھی کہ ہمیں اس ضمن میں اپنے سفیر پاکستان سے شکایت کرنی چاہئیے۔ عالی صاحب ایک خاص مزاج کے آدمی ہیں۔ وہ خود بے خبری میں کبھی کبھی ایسی باتیں کرجاتے ہیں کہ جہاں ہمارے مخصوص حالات کے پیش نظر خاموشی مناسب ہوتی ہے۔

یہ تھی وہ صورت حال جس پر میں نے وزارت تعلیم سے سخت احتجاج کیا تھا کہ ہم کس طرح باہر جا کر پریشان ہوا کرتے ہیں۔ ارباب حل وعقد کو چاہئیے کہ کبھی عقل سے بھی کام لے لیا کریں۔ بیس سال پرانے قاعدوں کی لکیر پیٹنا چھوڑ دیں۔ اگر حالات فوراً درست نہ ہوجاتے اور ہمارے سفیر صاحب، ہم پر مہربان نہ ہوتے تو ہمارے میزبانوں کو اور وطن میں رہنے والے رفقاء کو پتہ بھی نہ چلتا کہ ہم پر کیسی مصیبت طاری ہوئی۔ وہ سمجھ ہی نہ سکتے کہ ہم ہوٹل کا کرایہ ادا کرنے کے بعد باقی اخراجات کس طرح پورے کرسکے۔ میں نے عالی صاحب سے کہہ دیا تھا کہ کچھ کپڑے میرے پاس ہیں۔ سرخ چوک بھی سامنے ہے جہاں ہر قسم کا کاروبار ہوتا ہے۔ نئی اور پرانی سبھی چیزیں بک جاتی ہیں۔ خریدار بھی مل جاتے ہیں۔ باہمی معاہدے کے طور پر میں نے کہا کہ کپڑے میں دکھاؤنگا۔ بھاؤ تاؤ بھی میں

ھی کرلونگا۔ جو رقم جمع ھوگی، دونوں بانٹ لیں گے۔ لیکن غنیمت ھے کہ اس ناپسندیدہ اقدام کی نوبت نہیں آئی۔ ورنہ میرے لئے اور عالی جی کے لئے یہ تجربہ کم دلچسپ نہ ھوتا۔ ممکن ھے کہ وہ گاھکوں کو جمع کرنے کے لئے اپنا کوئی دوھا بھی سنا دیتے۔

مرغی جان سے گئی

یہ سب باتیں جملہ ھائے معترضہ کے طور پر ذھن میں آئیں اور قلم کی روانی میں زیب داستاں ھوگئیں۔ دراصل ذکر تھا ھوٹل میٹرو پول میں پہنچنے کا۔ وھاں پہنچ کر مس مارگریٹا پاؤ لونا کی رائے ھوئی کہ ڈنر کھالینا چاھئے۔ کیونکہ اگر پروگرام کے مطابق ھم بیلے ڈانس دیکھنے والوں میں شامل ھوگئے تو رات دس بجے فارغ ھونگے اور اس وقت تمام ریستوران بند ملینگے اور ھم دونوں کو صبح تک کے لئے فاقہ کشی کی نوبت آجائیگی۔ میں نے حامی بھرلی۔ خیال تھا کہ میٹرو پول کے ریستوران میں دودھ اور دھی مل ھی جائیگا اور میں اس طرح لذت کام و دھن حاصل کرلونگا مگر توبہ ھے، وھاں تو سوائے شراب اور گوشت اور لوازمات شراب کے کچھ بھی ممکن الحصول نہ تھا۔ بارے مرغی کا آرڈر دیدیا گیا اور جب یہ مرغی آگئی تو مجھے خیال آیا کہ یہ حلال کیسے ھو سکتی ھے۔ چھری کس نے پھیری اور زبان سے 'اللہ' اکبر، کے الفاظ ادا ھوئے یا نہیں؟ یہ سوچ کر سخت کراھیت پیدا ھوئی۔ میں نے ھاتھ کھینچ لیا اور ایسے کھانے سے پرھیز کیا۔ اپنی اس حماقت پر افسوس بھی ھوا کہ آرڈر خود میں نے دیا تھا۔ مرغی جان سے گئی اور کھانے والوں کے سواد کا ذکر تو کیا، فرمائش کرنے والوں نے چکھا بھی نہیں۔

میں نے ہاتھ تو کھینچ لیا لیکن سلسلۂ خیال نے ایک واقعہ یاد دلا دیا ۔ گزشتہ اکتوبر میں یہ عاجز حکومت عراق کی دعوت پر کانفرنس ٹوین بی میں شریک ہونے بغداد گیا تھا ۔ وہاں میں تین دن تک انڈے کھاتا رہا ۔ ایک رات اسکاٹ لینڈ کے ایک دوست نے سوال کیا : '' کیا آپ سبزی خور ہیں ؟ ،، میں نے جواب دیا : '' نہیں ،، ۔ فرمایا : '' پھر یہ گوشت سے گریز کیوں ہے ؟ ،، میں نے کہا کہ میں حلال گوشت ہی کھا سکتا ہوں ۔ اسکوچ دوست نے قہقہہ لگایا اور کہا : '' یہ تو مسلم ملک ہے ،، ۔ مجھے بھی خیال آیا کہ واقعی میں بھی عجیب آدمی ہوں ۔ دراصل اس سے قبل میں تین ماہ مغرب میں رہا تھا اور اس دوران غیر حلال چیزوں سے پرہیز کرتا رہا تھا ۔ ذہن منتقل ہی نہ ہوا کہ اب میں دوسری جگہ ہوں ۔ لیکن یہ ممکن ہوتا بھی کیسے ۔ بغداد کے اس ہوٹل میں جب مینو سامنے آیا ، اس میں منجملہ اور چیزوں کے سؤر کا گوشت بھی درج تھا ۔ وہاں اکثر لوگ مے نوشی کرتے اور اس کے لوازمات سے دل بہلاتے ہیں ۔ اس لئے مغالطہ ہونا ضروری بھی تھا ۔ مس مارگریٹا کو میرے کھانا نہ کھانے کا افسوس ہوا ۔ مجھے بھی اس بات کا افسوس ہوا کہ وہ خرچ میزبان ملک کا تھا ۔

روسی بیلے اور بالشوئی تھیٹر

پروگرام کے مطابق میرے روسی میزبانوں نے مجھے روسی بیلے دکھانے کا انتظام کیا تھا ۔ میں رقص و موسیقی کے اجتماعات سے گریز کرتا ہوں ۔ میرے عام مشاغل دوسری نوعیت کے ہیں ۔ لیکن اپنی معلومات میں اضافے کے اعتبار سے یہ رقص دیکھ لینے میں کیا مضائقہ تھا ۔ روسی بیلے ڈانس کی اکثر تعریف سنی تھی ۔ سنا



روسی بیلے رقاصائیں جن کے مظاہرۂ فن کو حکیم محمد سعید نے پسند کیا ۔

تھا کہ ایک جم غفیر اسے دیکھنے کے لئے امنڈ پڑا ہے۔ ٹکٹ مہینوں پہلے بک چکے تھے۔ تا ھم میرے لئے کوئی دشوار مسئلہ نہیں تھا کیونکہ میرا انتظام تو سرکاری طور پر ہوا تھا۔ ہوٹل میٹروپول کے سامنے ھی بالشوئی تھیٹر واقع ہے۔ ۱۹۷۰ء میں وھاں داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میں اور جمیل الدین عالی صاحب کامیاب نہیں ہوسکے تھے کیونکہ سرکاری پروگرام میں اسے شامل نہیں کیا گیا تھا ۔ بہر نوع اس بار موقع مل گیا۔ روس میں اس تھیٹر کی بڑی اھمیت ہے۔چند دن پہلے ھی اس کا دوسوسالہ جشن تاسیس منایا گیا تھا ۔ وھاں اہم ترین تقریبات بھی ہوا کرتی ھیں۔ مثال کے طور پر صدر الدین عینی کے جشن صد سالہ کا آخری جلسہ ۲۳ اپریل کو اسی جگہ ہونا ہے۔

ماسکو میں بیلے رقص کے بین الاقوامی مقابلے اکثر ہوتے رہتے ھیں۔ ان کی حیثیت باقی دنیا کے فن رقص کے شاندار تہواروں جیسی ہوتی ہے ۔ پچھلے سال ان مقابلوں کی اھمیت اور بھی زیادہ تھی کیونکہ وہ ایسے موقع پر ہوئے کہ جب سوویت یونین کے عوام ایک عظیم تاریخی واقعے یعنی عظیم انقلاب اکتوبر کی ساٹھویں سالگرہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انقلاب اکتوبر کی کامیابی نے بیلے رقص کو نئے شائقین اور تماشائی عطا کئے تھے۔ سوویت عوام کی اکثریت کی دسترس اس فن تک ہوئی ۔ چنانچہ تھیٹر میں مزدور اور کسان بڑی تعداد میں آنے لگے اور انھوں نے روسی فنکاروں اور رقص کے ھدایت کاروں کو نئے خیالات عطا کئے اور یہ سکھایا کہ اس دلپذیر فن کو عوام کے قریب تر کس طرح لایا جائے۔ یہ عمل بڑا تدریجی تھا ۔ تاھم یہ نہیں ہوا کہ روسیوں نے قدیم

افسانوی یا دیومالائی موضوعات کو یکسر مسترد کردیا ہو۔ انھوں نے ممتاز اور شہرہ آفاق مصنفین کی تحریروں کی بنیاد پر غنائیہ ڈرامے پیش کئے اور اس کے ساتھ ھی بہت سے فلسفیانہ موضوعات اور اھم مسائل کے بارے میں بھی پروگرام پیش کئے جن سے نہ صرف عام لوگوں میں جمالیاتی شعور پیدا ھوا بلکہ ان کے تخلیقی کاموں کے عمرانی جذبے اور اخلاقی موقف سے بھی عوام کو روشناس کرایا گیا۔ رقص کی ترقی میں چند مشہور کمپنیوں مثلاً ایگورموئی سیئف کی قائم کردہ لوک ناچ کی ریاستی کمپنی اور بیریوژکا کی ریاستی رقص کمپنی وغیرہ کا بہت بڑا حصہ ھے۔ سوویت یونین کو اس بات پر فخر ھے کہ اس نے اپنے کلاسیکی ورثے کے قیمتی نگینوں کی حفاظت کی ھے۔ چائیکوفسکی، کلا ژونوف اور منکوس جیسے عظیم موسیقاروں کے شہپاروں کو استعمال کیا جاتا رہا ھے۔ اس ملک کے کثیرالقومیتی کلچر نے ساری دنیا میں بیلے آرٹ کی ترقی کو بہت متاثر کیا ھے اور اب بھی کر رہا ھے۔ اس حقیقت کا ایک ثبوت تو یہ ھی ھے کہ سوویت بیلے رقص کی کمپنیاں اور بیلے رقاص بیرونی ملکوں کے کامیاب دورے کرتے رھے ھیں۔ اس کے ساتھ ھی یہ حقیقت بھی اھمیت رکھتی ھے کہ سوویت استادوں اور ماھرین رقص کی مدد سے مختلف ملکوں میں بیلے کے قومی اسکول قائم ھوئے ھیں تاکہ مقامی باشندے اپنے ذوق کے مطابق اس فن میں دلچسپی لےسکیں۔ اس مقصد کے لئے تقریباً سارے ممالک کے رقص کے استاد تربیت حاصل کرنے سوویت یونین میں آتے رھتے ھیں۔ اس وقت ملک بھر میں چالیس اوپیرا اور بیلے تھیٹر، انیس بیلے اسکول اور شوقیہ آرٹ کمپنیوں میں حصہ لینے والے فن کار بڑی تعداد میں موجود ھیں۔ اسی لئے

ماسکو قدرتی طور پر بیلے رقص کے بین الاقوامی مقابلوں کا روایتی مرکز بن گیا ہے۔ ان موقعوں پر محض مختلف ممالک کے نوجوان بیلے رقاصوں کا باہمی مقابلہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ان سے دوستانہ تعلقات بھی وسیع ہوتے ہیں۔ نیز دنیا بھر کی رقص کی تہذیب کے نئے رجحانات سے واقفیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ اس طرح فطری صلاحیت رکھنے والے نئے نئے رقاصوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ رقص و موسیقی کے پاکستانی طائفے بھی اکثر سوویت یونین آتے رہتے ہیں کیونکہ وہی مقاصد ان کے بھی پیش نظر ہوتے ہیں۔ اگر اس موقع پر کوئی پاکستانی طائفہ ماسکو میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہوتا تو میں بڑے فخر و انبساط کے ساتھ شریک محفل ہوتا اور مس مارگریٹا سے کہتا کہ دیکھ لو ہم بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

بالشوئی تھیٹر کے چیف کوریوگرافر لینن انعام یافتہ اور سوویت یونین کے عوامی آرٹسٹ یوری گری گوروچ ہیں جو پچھلے سال بیلے مقابلے کے وقت جیوری کے سربراہ بھی تھے۔ آج وہ تھیٹر میں موجود نہیں تھے اور اگر ہوتے بھی تو میں اس فن کے بارے میں ان سے تبادل خیال کس طرح کرتا جبکہ میں اس فن لطیف سے واقف نہیں ہوں۔ غرض یہ کہ جب ہم دونوں بالشوئی تھیٹر میں داخل ہونے لگے تو دو اشخاص نے قریب آکر پوچھا: ''کیا آپ انگریزی جانتے ہیں؟'' اندازہ یہ ہوا کہ یہ دونوں عرب نژاد ہیں۔ ان کو بڑی کوشش کے باوجود بالشوئی تھیٹر کے ٹکٹ نہیں مل رہے تھے۔ میں نے مس مارگریٹا سے اردو میں بات کر کے انگریزی میں ان عربوں کو سمجھایا کہ ٹکٹ ملنے کی اب واحد صورت یہ ہے کہ کل دن کو

منیجر سے ملا جائے۔ وہ غیر ملکیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ٹکٹ کا انتظام کردینگے۔ میں نے ان کو جگہ بھی بتادی کہ کس جگہ جانا ہوگا۔

اب میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح محترمہ سولووی اووا کو ٹیلےفون کیا جائے تا کہ وہ کل صبح دس بجے کا کوئی پروگرام نہ بنائیں۔ بالشوئی تھیٹر کے نگران اعلا اتفاق سے اس وقت باہر نکلے تھے۔ میری سفید ٹھنڈی شیروانی ان کے لئے وجہ دلچسپی تھی۔ ان سے اپنا مقصد بیان کیا گیا تو انھوں نے اپنے کمرے سے فون کرنے کی اجازت دیدی۔ چلئے اپنی اس شیروانی کا کچھ تو فائدہ پہنچ ھی گیا!

میں بیلے وغیرہ کے باب میں اپنی بد ذوقی کا اعتراف پہلے ھی کر چکا ہوں۔ تاھم آج میں نے زندگی میں پہلی بار اس کھیل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مس مارگریٹا نے کہانی کا پس منظر سمجھایا۔ میں نے اس کو اپنے ذھن میں رکھ کر اس بے آواز یا بے مکالمہ ڈرامے کو سمجھنے کی کوشش کی اور جب سمجھ میں آ گیا تو واقعی بہت ھی لطف آیا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے کہ روسی بیلے ساری دنیا میں شہرت رکھتا ھے، میں نے اس خیال سے بھی اس کے رموز و نکات کو سمجھا تا کہ کہیں کسی محفل میں نا اھل ثابت نہ ھوسکوں۔ آج کے بیلے کا موضوع تھا ''انگارا''۔ یہ سائبیریا میں ایک دریا کا نام ھے۔ اس کو روسی زبان میں لکھا جائے تو اس طرح لکھنا ھوگا: ''AHГAPA''۔ روسی زبان میں بہت سے لاطینی حروف جوں کے توں لکھے جاتے ھیں لیکن ان کا تلفظ مختلف ھوتا ھے۔ اب اسی لفظ کو لیجئے۔ H حرف لاطینی میں ''ح'' کی آواز دیتا ھے اور

روسی میں ''ن'' کی۔ P حرف لاطینی میں ''پ'' کی آواز دیتا ہے اور روسی میں ''ر'' کی۔ وغیرہ وغیرہ۔

آج کے بیلے کی کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ دو بھائی ایک ہی لڑکی پر عاشق ہوجاتے ہیں۔ لڑکی ان دونوں کے درمیان فرق و امتیاز نہیں کرسکتی۔ اس طرح تینوں کردار عجیب کشمکش میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ کوئی فیصلہ کرنا ان میں سے کسی کے لئے بھی آسان نہیں ہوتا۔ بیلے کے رقص و سرود نے اس جذباتی مد و جزر کو ابھارنے کی سعی کی ہے۔ ھال کی تیز روشنی میں کبھی کبھی چکا چوند سی پیدا ہوتی تھی۔ اسلئے بعض اوقات منظر صاف نظر نہیں آتا تھا۔ تاہم اندر داخل ہوتے وقت جہاں کوٹ جمع کرائے گئے تھے، ایک دوربین کرائے پر لے لی گئی تھی۔ اس کے استعمال سے یہ فائدہ ہوا کہ کرداروں کے چہروں پر طاری ہونے والے جذبات کا مطالعہ بھی کیا جاسکا جو یقیناً دلچسپ ثابت ہوا۔

بالشوئی تھیٹر بڑی آب و تاب کی جگہ ہے۔ بڑی پرشکوہ عمارت ہے۔ اس کی ہر چیز قدیم ہے۔ قدامت کی پوری شان و شوکت ہر چیز سے عیاں ہے۔ مگر ہر شے زرق برق ہے۔ بس پردے نئے انداز کے ہیں اور وہ اس لئے ضروری ہیں کہ اب پردوں کو روسی انقلاب کا آئینہ‌دار ہونا چاہئے تھا۔

بیلے ڈانس کے علاوہ ناچ کی ایک اور قسم روس کی سرزمین کے لئے مخصوص ہے۔ اسے ہوپک رقص کہتے ہیں۔ یوں تو اس کا مظاہرہ سوویت یونین میں ہر جگہ ممکن ہے لیکن یوکرائن کے لئے اس کی خصوصیت روایتی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کو مشکل ہی سے کوئی یوکرائنی ایسا ملیگا جسے ہوپک رقص پسند نہ ہو اور جس

نے اپنی جوانی کے دنوں میں خود ہوپک رقص نہ کیا ہو۔ اکثر اوقات بڑے بوڑھے بھی شریک رقص نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کے بغیر مسرت و شادمانی کی کوئی محفل ممکن نہیں سمجھی جاتی۔ شام کے اجتماعات میں، شادی کی تقریبات میں، عوامی تہواروں میں، شہروں اور دیہات میں، کلبوں سے لے کر شہر کے چوراہوں تک پر اور پارکوں میں، ہر جگہ نوجوان اس سے لطف اندوز ہوتے نظر آتے ہیں۔ پہلے ایک یا دو آدمی آہستہ سے لوگوں کے حلقے میں داخل ہوتے ہیں اور بینڈ یا اکارڈین کی دھن پر اپنا پسندیدہ ہوپک رقص کرنے لگتے ہیں۔ جلدی ہی تیسرا اور چوتھا شخص ان میں شامل ہوجاتا ہے اور آپ کو پتہ بھی چلنے نہیں پاتا کہ سارے تماشائی خود بھی عملی طور پر رقص میں شامل ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی بے حد مقبولیت کا راز کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ عوام کے کردار اور ان کے مزاج کی واضح عکاسی کرتا ہے۔ ان کی خوش مزاجی، قوت و ہنر مندی، ان کی مستعدی اور حوصلے کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ ان کی اس صلاحیت کی عکاسی کرتا ہے کہ جس جوش و خروش سے وہ اپنے پیشے کے مطابق کام کرتے ہیں، اسی جوش و خروش کے ساتھ خوشی بھی مناتے ہیں۔ ہمارے ملک میں پٹھانوں کا جو کھٹک ناچ ہے، اس سے یہ بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔ بہت گھن گرج کے ساتھ ہر شخص ناچ میں مصروف رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہوپک کی تاریخ کا تعلق ماضیٔ بعید سے ہے۔ اس رقص نے ژاپوروژے سیچ میں جنم لیا جہاں آزاد کوسک رہا کرتے تھے۔

یہ بہادر اور زندہ دل لوگ تھے جنہیں اپنی آزادی سب سے زیادہ عزیز تھی - شروع میں یہ ناچ صرف مردوں کیلئے مخصوص تھا - وہ علاقہ اب ماضیٔ بعید کا حصہ بن چکا ھے لیکن ھوپک باقی رہ گیا ھے اور اس کی مقبولیت عام ہو گئی ھے - یہ اسٹیج پر بھی پیش کیا جانے لگا اور فلموں میں بھی عکاسی ھونے لگی - یوکرائن میں شوقیہ رقاصوں کے صدھا طائفے اور بیسیوں پیشہ ور طائفے اس رقص کو پیش کرتے ھیں - لیکن یہ غیر متنازعہ حقیقت ھے کہ پیشہ ور اور شوقیہ دونوں ھی قسم کے طائفوں میں مثالی ھوپک ریاستی اعزاز یافتہ طائفہ ھی پیش کرتا ھے جو سوویت یونین کے عوامی فن کار پاویل ورسکی کی رہنمائی میں کام کرتا ھے - اس با صلاحیت طائفے کا پیش کردہ رقص فن کے ایک حقیقی نمونے کی حیثیت رکھتا ھے -

میرے ایک واقف کار کو جو واقف فن بھی ھیں، اس مشہور و معروف ناچ کو ایک بار دیکھنے کا موقعہ ملا تھا- ان کے کہنے کے مطابق یہ ایک ناقابل بیان اور پر مسرت نظارہ تھا - اسٹیج پر رنگوں کا ایک طوفان بر پا تھا - لڑکیاں دائرے کی شکل میں گھوم رہی تھیں اور ان کے لباس میں ٹنکے ھوئے رنگ برنگے فیتے آپس میں مل کر ایک حلقہ بنارھے تھے اور ایسا محسوس ھوتا تھا گویا ایک زندہ دھنک آسمان سے نیچے اتر آئی ھے - نوجوان مرد گویا ھوا میں تیر رھے تھے اور یہ معلوم ھوتا تھا کہ جیسے ان کے پیر زمین کو چھو ھی نہ رھے ھوں - جنون کی یہ کیفیت بڑھتی ھی گئی - پھر جب موسیقی کی تان ٹوٹی اور رقاص ایک لمحے کے لئے ساکت ھوئے تو چار ھزار تماشائی فرد واحد کی طرح اپنی

نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور تالیوں کے ایک طوفان نے سارے ہال کو ہلا کر رکھ دیا ۔ اس موقعہ پر میرے واقف کار کے کہنے کے مطابق کئی افریقی طالب علم نیز اوسٹریلیا ، پولینڈ اور دوسرے ممالک کے سیاح بھی موجود تھے ۔ ان سب کو رقص و سرود کے ایک والہانا جذبے نے مسحور کر دیا تھا ۔

پاویل ورسکی کا طائفہ نسبتاً نیا ھے یعنی اس کی عمر صرف بیس سال ھے لیکن اس کی شہرت صرف سوویت یونین تک ھی محدود نہیں ھے ۔ اس کے رقاص دنیا کے بہت سے ملکوں میں ، جہاں وہ اپنے فن کا مظاھرہ کرچکے ھیں ، کافی مشہور ھیں ۔ ان کے غیر ملکی دورے، جن میں ھر سال اضافہ ھورھا ھے ، نہایت کامیاب سمجھے جاتے ھیں ۔ اس کامیابی کا راز صرف اس طائفے کی غیر معمولی مہارت ھی میں مضمر نہیں ھے بلکہ اس امر میں بھی پوشیدہ ھے کہ پاویل ورسکی اور ان کے طائفے کے اراکین اس عوامی رقص کے فن کو احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھ رھے ھیں ۔ ان تمام لوگوں کو ، جوطائفے کے پیش کردہ ھوپک رقص کی تشکیل کرتے ھیں ، ورسکی نے قومی تہواروں اور میلوں کے موقعوں پر یا شوقیہ مظاھرۂ فن کے دوران منتخب کیا اور پھر خود تربیت دے کر انھیں بہتر بنا لیا کہ وہ دنیا بھر میں نام پیدا کرسکیں ۔

دنیا کے اور بہت سے ملکوں کی طرح سوویت یونین میں نئے سال کا آغاز یکم جنوری سے ھوتا ھے ۔ وہ ایک ایسی تقریب کا دن ھوتا ھے جو گہرے خلوص اور پر مسرت جدت کی فضا سے سر شار ھوتی ھے ۔ لیکن بہت سی باتیں مغربی ملکوں کے رواج سے مختلف ھوتی ھیں ۔ تاھم وہ ایک چیز سے ھم آھنگ ھوتی ھیں ۔ وہ

هیں رقص کی محفلیں جو ہر جگہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ برپا ہوتی ہیں - نئے سال کا رقص ان لوگوں کے لئے جشن فتح ہوتا ہے جو جوان اور قوت حیات سے بھر پور ہوتے ہیں اور جن کی خوش بختی زمانے کی تلخی سے نا آشنا ہوتی ہے - والز رقص کی زمزمہ آمیز حرکات ناچنے والوں اور دیکھنے والوں کو عجائبات کی دنیا کا سفر کراتی ہیں - ایک ایسا سفر جو خواب میں نہیں، حقیقت میں ہوتا ہے - روس میں نئے سال کے رقص (بال) کی روایت زار روس پیٹر اول (۱۶۷۲ء تا ۱۷۲۰ء) کے زمانے سے شروع ہوئی تھی جس نے قبائلی ناچوں کا جنہیں وہ نا پسند کرتا تھا، خاتمہ کر کے شریف خاندانوں میں یورپی روایات کو سختی کے ساتھ فروغ دیا تھا - رفتہ رفتہ بال رقص نے نو جوان امراء کے دل جیت لئے - عظیم روسی ادیب تا لستائی نے اپنے ناول ''جنگ اور امن،، میں سینٹ پیٹرز برگ کے ایک رئیس کے محل میں منعقد ہونے والے نئے سال کے جشن کی شاندار تصویر کھینچی ہے جس میں مشہور رقاصہ نوجوان نتاشا روستووا نے شرکت کی تھی - آج کل کے روسی نوجوان بھی محفل رقص کی اس ہیروئن کے شیدائی نظر آتے ہیں - جو رقص اس نے پیش کیا تھا، وہ آج بھی تمام نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں مقبول ہے - کریملن کے کانگریس ہال میں اس کا سب سے بڑا مظاہرہ ہوتا ہے -

رقص کے مختلف پہلوؤں پر بہت زیادہ غور کرتے ہوئے مجھے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے وابستہ ایک جواں فکر شاعر جناب قمر ہاشمی کی نظم یاد آگئی جو انہوں نے لینن کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلے میں لکھی تھی - اس کا عنوان تھا '' سوویت عوام

کا رقص طرب،، چونکہ بے بحر کی نظمیں مجھے بہت کم یاد رہتی ہیں، اس لئے اس کے صرف آخری تین مصرعے حافظے کی لوح پر بر قرار رہ گئے :

اٹھاؤ ساغر کہ زندگی آج رقص میں ہے،
زمین انگڑائی لے رہی ہے،
یہ کائنات رقص میں ہے۔

بالشوئی تھیٹر میں رات پونے دس بجے بیلے رقص ختم ہوا۔ ہم دونوں باہر نکلے تو غضب کی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ ممکن ہے مس مارگریٹا کو زیادہ سردی نہ لگی ہو کیونکہ وہ جوان ہیں اور اسی سرزمین کی رہنے والی ہیں لیکن میں کسی قدر کپکپا گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ میں اپنا اوورکوٹ ساتھ لے آیا تھا، ورنہ قفلی جم جاتی۔ ٹیکسی کی تلاش تھی کہ اتنے میں قریب ہی سے ،، السلام علیکم،، نے ہمیں خاصہ چونکا دیا۔ میں نے مڑکر دیکھا تو ایک صورت جانی پہچانی تھی اور دو صورتیں ایسی تھیں کہ جن کو دیکھ کر میرا تو خون خشک ہوگیا۔ میں سمجھا کہ اس سرد رات اور ویران سڑک پر ہم دونوں دھر لئے گئے۔ مدافعت کے لئے غدہ ہائے فوق الکلیہ اپنی رطوبت خون میں چھوڑنے لگے مگر کسی مقابلے کی نوبت نہ آئی۔ یاد آگیا۔ ان صاحب کو کنگرس عالمی تاریخ سائنس، ایڈنبرا، اسکاٹ لینڈ، میں دیکھا تھا۔ خود انہوں نے اپنا تعارف کرانے میں دیر نہ کی۔ شیک ہینڈ ہوا اور پھر اسماعیل جرجانی پر تبادل خیال شروع ہوگیا۔ میرے پروگرام میں بہ ظاہر تاشقند شامل نہیں ہے۔ اسماعیل جرجانی کا مخطوطہ وہاں کے لئے ہے۔ اسماعیل جرجانی پر میرا مقالہ ایڈنبرا

میں پیش ہوا تھا ۔ اس لئے یہ صاحب مجھے پہچان کر اس موضوع پر گفتگو کرنے لگے ۔ برفیلی ہواؤں میں آدھ گھنٹے سڑک کے کنارے باتیں ہوتی رہیں ۔ بالآخر ایک ٹیکسی روک لی گئی اور میں مس مارگریٹا کے ساتھ ہوٹل یوکرائن آ گیا ۔ انھوں نے قریب ہی اپنی ایک دوست کے گھر قیام کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا ۔ میں نے ہوٹل پر اترنے کے بعد اسی ٹیکسی میں ان کو بھیج دیا ، ورنہ وہ پیدل جانے کا ارادہ کررہی تھیں جو مجھے کسی عنوان گوارا نہ تھا ۔ رات کا وقت ، موسم سرد اور پھر ٹھنڈی ہوائیں ، وہ جرأت و بہادری کا مظاہرہ کرنے کی عادی سہی، لیکن میں مطمئن نہیں تھا ۔ وہ اپنے اقدامات کی ذمہ دار تھیں لیکن مجھے بھی اپنی ذمہ‌داری کا احساس تھا ۔ یہ غنیمت ہے کہ انھوں نے میرا مشورہ قبول کرلیا ۔

میں نے کمرے میں پہنچ کر شب خوابی کا لباس پہنا یعنی تہ بند باندھا اور بستر پر دراز ہو گیا ۔ بستر اس قسم کا تو نہیں تھا جس پر میں اپنے وطن میں سونے کا عادی ہوں ۔ لیکن چونکہ خلاف معمول تھک گیا تھا، اس لئے لیٹتے ہی نیند آ گئی اور یہ غنیمت ہے کہ کوئی خواب بھی نظر نہیں آیا ۔ دماغ مکمل طور پر پر سکون تھا ۔

معمولات سے قطع نظر

ان دنوں خاصی بے فکری تھی ۔ نہ تو یہ فکر دامن گیر تھی کہ بس صبح چار بجے اٹھ جانا ہے اور نہ یہ فکر سوار کہ کاغذات دیکھنے ہیں، ہر ایک پر اپنی رائے یا احکامات

لکھنے ہیں اور فائل درست کرنے ہیں - نہ ہمدرد صحت کے مضامین کو جانچ پڑتال کے بعد قابل اشاعت بنانا تھا - مطب جانے، کسی سے ملاقات کرنے یا دفتر جانے کا بھی سوال نہیں تھا - اپنے معمولات کا نقشہ تو وطن ھی میں رہ گیا تھا - ماسکو میں مصروفیات اپنی مرضی پر منحصر تھیں - اگر مصروفیات پیدا نہ کروں تو ذرا بھی فکر نہ ہو-بالکل آزاد تھا-ایسی آزادی مجھے بہت کم میسر آتی ہے - اس لئے ان تین دنوں کو ایک غیر معمولی نعمت سمجھنے لگا تھا - چنانچہ سوکر ذرا دیر سے اٹھا - طلوع و غروب آفتاب کا کوئی اندازہ نہیں ھوتا اور نہ کوئی بتانے والا تھا - کوشش کی مگر ناکامی ھوئی - نماز فجر قضا ھوگئی- اللہ کا نام لے کر مصلا بچھا لیا - رخ نہ جانے کس جانب تھا - کعبہ شریف کی سمت تو مسجد میں جا کر ھی معلوم ھو سکتی تھی اور وہ یہاں سے دور تھی - اس بار قبلہ نما بھی ساتھ نہیں تھا - ایسی غلطی میں کم کرتا ھوں - میرے سامان سفر میں قبلہ نما لازماً رکھا جاتا ہے - لیکن اس بار روانگی بڑی روا روی میں ھوئی - میری بیٹی سعدیہ بھی جو میری ضروریات کو سمجھتی اور ان کا خیال رکھتی ہے، اس دفعہ بھول گئیں - میری دوا حیاتین ج رہ گئی اور ناک کھولنے کی دوا بھی ساتھ نہیں تھی - حال آں کہ یہ میری بڑی ضرورت کی چیز ہے - جب سے کانوں میں تکلیف ھوئی ہے، میرے معالج کی سخت ھدایت ہے کہ سفر میں جہاز اڑتے وقت اور اترتے وقت ناک بند نہیں ھونی چاھئے - تشخیص یہ ھوئی تھی کہ اصل تکلیف ناک میں ہے اور اس نے کان کو نقصان پہنچایا ہے - سات سال تک اس ھدایت پر عمل کرتا رھا ھوں اور صرف اس سفر میں کوتاھی ھوگئی - خیر' اللہ مالک ہے -

جراحت قلبی

آج کا پروگرام میرے لئے بےحد دلچسپ اور مفید مطلب تھا ۔ انجمن مصنفین کے شعبۂ روابطہ غیر ملکی کی نگران محترمہ مریم سلگانک لے وو نا سے میں نے کہا تھا کہ میں ہارٹ سر جری (جراحت قلبی) دیکھنا چاہتا ہوں ۔ انہوں نے واقعی بڑی توجہ کی اور میرے لئے پروگرام بنا دیا ۔ انجمن نے موٹر بھجوائی مگر وہ وقت پر ہوٹل نہیں پہنچی ۔ اس لئے ہم نے خود ٹیکسی کرلی تاہم وقت مقررہ پر ساڑھے نو بجے وہاں نہ پہنچ سکے ۔ سرجن صاحب میرا انتظار کر کے سرجری میں چلے گئے ۔ تاہم ان سے کسی نہ کسی طرح رابطہ قائم کر ہی لیا ۔ مگر مجھے بڑی شرمندگی ہوئی ۔ حالانکہ انہوں نے سب حال معلوم کر کے اعتراف کرلیا تھا کہ اس ضمن میں کوتاہی میری طرف سے نہیں ہوئی ۔ در اصل شرمندگی کے ساتھ ساتھ مجھے مایوسی بھی تھی ۔

ماسکو میں یہ انسٹی ٹیوٹ آف ہارٹ سرجری مرحوم باکولیف نے قائم کیا تھا ۔ عمارت کے باھران کا مجسمہ بھی لگا ہوا ہے ۔ اس وقت اس ادارے کے ڈائرکٹر اکیڈیمیشین ولادیمیر ایوانوویچ بورا کوفسکی ھیں ۔ ان سے شرف ملاقات حاصل ھوا ۔ وہ بڑے لحیم شحیم انسان ھیں ۔ قد بھی ساڑھے چھے فیٹ سے کم نہیں ہوگا ۔ مستند ماھر امراض قلب ھیں اور روس میں ان کی بڑی شہرت ہے ۔ ان سے ملاقات بڑی سر سری ہوئی ۔ وہ مریضوں کے معائنے میں مصروف تھے اور پھر ان سے وقت بھی مقرر نہیں ہوا تھا ۔

اصل ملاقات جارجیا کے ہارٹ سرجن جناب بکیریا صاحب

سے تھی - ان کو پا لیا - ایک نرس نے ان تک رہنمائی کر دی - یہ انسٹی ٹیوٹ پانچ عمارتوں پر مشتمل ہے - ہم ایک عمارت سے دوسری عمارت تک گئے - ماحول زیادہ صاف نہیں تھا - سڑک اور گلی کے کناروں پر رات کو گری ہوئی برف اب پگھل رہی تھی - صبح ھی سرکاری ملازمین نے اس کو سمیٹ کر کناروں سے لگا دیا تھا تا کہ وہ پگھلتی رہے - لیکن اس سے کیچڑ پیدا ہو گئی تھی - خیر ہم دامن بچاتے ہوئے بکیریا صاحب کے پاس پہنچ گئے - وہ ہمارے منتظر ھی تھے - ان سے تعارف کرایا گیا - بکیریا صاحب اس ادارے کے نائب نگران اعلاھیں اور ان کو جراحت قلب میں مہارت تامہ حاصل ہے - انھوں نے چیمبر سرجری کا طریقہ اختیار کیا ہے - میں اس کی ابتدائی تفصیل بیان نہیں کر سکتا - چونکہ مریض کا ھارٹ اوپن کیا جا چکا تھا اور بکیریا صاحب کو وھاں جانے سے روکنا مناسب نہیں تھا ، اس لئے تفاصیل ان سے معلوم نہ کر سکا - تاھم انھوں نے جرمن زبان میں چھپا ھوا اس موضوع پر اپنا ایک مقالہ میرے مطالعے کے لئے مجھے دیدیا - بکیریا صاحب نے مجھے مخصوص لباس پہنا دیا جو اپریشن کے وقت ھمیشہ پہنا جاتا ہے - موزے پہن لئے اور ٹوپی بھی اوڑھ لی - اب میں ان کے ساتھ اپریشن تھیٹر میں گیا - یہاں میں نے دیکھا کہ ایک گول چیمبر بنا ھوا ہے - وہ آھنی ہے - بس ورٹیکل بائلر کی شکل ہے - اپریشن کے وقت اس چیمبر میں بے اندازہ اوکسیجن گیس ھوتی ہے - اس لئے یہاں بجلی کا کوئی دخل نہیں ہے کہ اس سے آگ پکڑنے کا خطرہ رھتا ہے - اس چیمبر کے لئے ھر چیز باھر ہے - یہ تمام انتظام بکیریا صاحب نے مجھے دکھایا اور سمجھا دیا - چیمبر کے

اندر بس بجلی کا چاقو ہوتا ہے کہ جس سے مقام قلب اور خود قلب چیرا جاتا ہے ۔ انھوں نے بتایا کہ اس چیمبر میں اگر کبھی اکیڈیمیشین بورا کوفسکی آجاتے ہیں تو وہ بیٹھ کر ہی کام کرتے ہیں ۔ میں بکیریا صاحب کے ساتھ کوئی پون گنٹھ رہا اور جراحت قلب کو دیکھ لیا اور سمجھ لیا ۔ دل بہت متاثر ہوا ۔ آج مریض ایک نوجوان بچہ تھا ۔

مجھے یاد آیا کہ اس سے قبل میں نے ۱۹۷۳ء میں ہیوسٹن (امریکا) میں اوپن ہارٹ سرجری دیکھی تھی ۔ تقریباً دو گھنٹے میں نے وہاں صرف کئے تھے ۔ میں نے بکیریا صاحب سے اس کا ذکر کیا ۔ انھوں نے کہا کہ ہماری اس انسٹی ٹیوٹ میں بہت زیادہ تجدد آپ نہیں پائیں گے ۔ یہاں موڈرن آلات بھی نہیں ہیں ۔ تاہم ہم بڑی کامیابی کے ساتھ اب تک ایک سو ساٹھ اپریشن کر چکے ہیں اور ہمارا چیمبر میتھڈ خوب ہے ۔ میں نے بکیریا صاحب کے طریق کار کی تعریف کی ۔ یقیناً وہ اس کے مستحق تھے ۔ میں نے برسبیل تذکرہ ان سے پوچھا : ” کیا آپ نے پاکستان کا کبھی دورہ کیا ہے ؟ “ ان کا جواب نفی میں تھا ۔ البتہ وہ روس سے باہر انگلستان اور امریکا میں رہ چکے تھے ۔ انگریزی خوب اچھی بولتے ہیں مگر جرمن زبان پر زیادہ عبور حاصل ہے ۔ ممکن ہے کہ انھوں نے مہارت جراحت جرمنی میں حاصل کی ہو ۔ میں نے ان سے کہا : ” کیوں نہ آپ پاکستان آئیں اور جراحت قلب کے موضوع پر لیکچرز دیں اور ممکن ہو تو کوئی اپریشن بھی کر دکھائیں ۔ میں آپ کے لئے اپنے ملک میں یہ انتظام کر سکتا ہوں “ ؟ ۔ میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے اس بات کو پسند کیا ہے اور ان کے

دل میں پاکستان آنے کی خواہش ہے ۔ انھوں نے فرمایا ؟ " آپ ہماری وزارت صحت کی معرفت دعوت دیں ۔ میں ضرور پاکستان آؤنگا " ۔

ان سے رخصت ہوتے وقت میرے ذہن نے کام کیا اور مجھے یاد آیا کہ عالمی ادارۂ صحت نے ایک تقابلی جائزے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ سوویت یونین کے بچے دنیا بھر میں سب سے زیادہ تندرست ہوتے ہیں ۔ اس ضمن میں بچوں کی سرجری کے سوویت ماہرین کافی تعریف کے مستحق ہیں ۔ آج سوویت یونین کے ہر بڑے شہر میں یا تو ایک علیحدہ سرجیکل کلینک ہے ، یا پھر ہر ہسپتال میں اس شعبے کا ایک وارڈ ہے ۔ بچوں کی سرجری کے دائرے میں " دولت سکی اسکول " اعلا ترین ادارہ ہے ۔ عالمی ادارۂ صحت نے بطور مثال اپنے ماہنامے میں ایک اپریشن کا بھی ذکر کیا تھا ۔ بچی کا نام ماشا تھا ۔ اسے زچہ خانے سے سیدھا کلینک لایا گیا تھا ، کیونکہ اس میں بہت سے پیدائشی نقائص موجود تھے ۔ ایک نقص یہ تھا کہ اس کی غذا کی نالی بند تھی ۔ زچہ خانے کے ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اپریشن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن کلینک میں موجود پروفیسر استالن لاف دولت سکی نے اپریشن کیا جبکہ ڈاکٹر اولگا پولیا کووا نے اس بچی کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے چھے ماہ تک جد و جہد کی ۔

دولت سکی صرف خود ہی ایک اعلا پائے کے سرجن نہیں ہیں ، بلکہ وہ بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے علم سے دوسروں کو بھی مستفید کرتے ہیں اور کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتے ۔ وہ تخلیقی ذہن رکھنے والے نوجوانوں کی بڑی عزت کرتے ہیں ۔ دوسری طرف

نوجوان ڈاکٹر اپنے سرپرست سے علم حاصل کرتے وقت اپنی اعلا صلاحیت اور استعداد کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس نے دولت سکی اسکول کو جنم دیا تھا جس میں اب ممتاز سرجنوں کی ایک بڑی ٹیم کام کرتی ہے۔

جب بارہ سالہ لوسیارودزے وچ یہاں آتی ہے تو ڈاکٹر اسے ہمیشہ کی طرح دیکھنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ لوسیا اس کلینک میں اور سرجری سوسائٹی کے جلسوں میں گرما گرم گفتگو کا موضوع رہ چکی ہے۔ ایک سال پہلے ڈاکٹر والیری اکوپیان اور ان کی ٹیم نے اس بے جگر لڑکی کا آپریشن کیا تھا۔ اس کے بچنے کے امکانات بہت ہی کم تھے۔ لیکن خدا کی عنایت اور سرجنوں کی صلاحیت نے اسے نئی زندگی عطا کی تھی۔ جگر کی تکالیف اور خون کی متعلقہ رگوں کے نقائص کا علاج آج بھی ایک غیر حل شدہ سرجیکل مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ والیری اکوپیان، جو دولت سکی اسکول کے ذہین نمائندوں میں سے ایک ہیں، اس قسم کے کیسوں سے بچوں کی سرجری کے کلینک کے حالات میں نمٹتے ہیں۔ انھوں نے بعض نادر قسم کے اپریشن بڑی کامیابی کے ساتھ کئے ہیں۔ ان کی عمر زیادہ نہیں ہے تاہم وہ جگر کے بعض پیچیدہ کیسوں کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے بعض ایسے خطرناک اپریشن بھی کئے ہیں جن کی تکمیل میں کئی کئی گھنٹے لگ گئے۔ وہ ہر چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ انھی کے ایک ساتھی الیکسی اوف چلی کوف پہلی مرتبہ بچوں کی سرجری کے وارڈ میں اس وقت آئے کہ جب وہ طالب عام تھے۔ اب سے دس سال پہلے بھی وہ کلینک کے طالب علموں کے سرجری

گروپ کے صدر تھے۔ لیکن اب نوجوان سرجن طالب علموں کو پھیپھڑوں کی سرجری کا درس دیتے اور اپریشن کر کے دکھاتے ہیں۔ طب میں امیدوار کی ڈگری حاصل کرنے والے بہت سے طالب علم اپنے تیس سالہ استاد کے مقابلے میں بسا اوقات زیادہ عمر کے بھی ہوتے ہیں مگر عمر کے اس تفاوت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

کلینک میں علاج اسی وقت سے شروع کردیا جاتا ہے کہ جب مرض پورے طور سے ظاہر ہونے بھی نہیں پاتا۔ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ مرض کو مزید بڑھنے سے روک دیا جائے۔ بڑے بچوں، حتیٰ کہ بالغوں میں بھی بہت سی بیماریاں قطعاً پیدا نہیں ہونگی بشرطیکہ ان چیزوں کا فوراً ہی علاج کردیا جائے جو عہد طفلی میں پہلی نظر میں معمولی اور غیر مضرت رساں معلوم ہوتی ہیں۔ بلاشبہ جتنے جلدی علاج ہوجائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ بچہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جاتا ہے، ویسے ویسے اس کا متاثرہ جسم اپنے نقائص کے مطابق ڈھلتا جاتا ہے اور اپریشن کے بعد اسے پھر نئی صورت حال کا عادی ہونا پڑتا ہے۔ سرجن کے لئے بہترین حکمت عملی یہی ہے کہ وہ فوراً یعنی بچے کے پیدا ہوتے ہی اپنا کام شروع کردے۔ مذکورہ بالا کلینک کے سرجن اب زیادہ سے زیادہ اپریشن کر رہے ہیں۔ اپریشن ایک خصوصی وارڈ میں ان بچوں کے کئے جاتے ہیں، جنہیں زچہ خانوں سے سیدھا یہاں لایا جاتا ہے۔ یہاں طریقہ یہ ہے کہ اپریشن کی میز کو گرم رکھا جاتا ہے اورگرم پانی کی بوتلیں چادروں کے نیچے ترتیب سے لگائی جاتی ہیں تاکہ جسم کی قدرتی حرارت اور خون کی ایک ایک بوند کو بچایا جاسکے۔ ایک بالغ شخص کے جسم سے زیادہ خون کا ضائع ہوجانا زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے لیکن

ایک نوزائیدہ بچے کے معاملے میں خون کا ایک ایک قطرہ قیمتی ہوتا ہے۔ اپریشن کرتے وقت سرجن بچے کے جسم میں اس توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے جو کہ بیماری سے پہلے جسم میں موجود تھا۔ دولت سکی اسکول انسانی زندگی کی حفاظت کرتا ہے اور اگر زندگی کے بچنے کا خفیف ترین امکان بھی موجود ہو تو اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

امراض قلب کے سلسلے میں یہ بات میرے علم میں آئی تو حیرت ہوئی کہ سوویت یونین کے سرجن مصنوعی دل بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور انھیں کامیابی کی امید ہے۔ بعض آلات کے ذریعہ سے دل کو حرکت میں رکھنا تو ممکن ہوچکا ہے مگر یہ بات کہ اصل دل نکال کر مصنوعی دل لگا دیا جائے، عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ ذرا تصور کیجئے، آپ نے دل میں درد محسوس کیا، ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے بتایا کہ آپ کا دل بیکار ہوچکا ہے، اسے فوراً بدل دینا چاہئے۔ آپ کیمسٹ کی دکان پر گئے اور اپنے دل کا سائز بتاکر مصنوعی دل خرید لیا۔ آپ کے سینے سے پرانا دل نکال کر نیا فٹ کردیا اور آپ بھلے چنگے ہوگئے۔

اس صدی کی ساتویں دہائی کے وسط میں جب ڈاکٹر کرسچین برنارڈ نے دل کی منتقلی کا سنسنی خیز کام شروع بھی نہیں کیا تھا، سوویت یونین کے اکیڈیمیشین بورس پترووسکی کی راہنمائی میں والیری شوماکوف نے ایک مشین کا دل ایجاد کرنے کے سلسلے میں سرگرم تحقیقاتی کام شروع کردیا تھا۔ آج وہ اعضا اور عضلات کی منتقلی کے ادارے کے سربراہ ہیں۔ یہ ادارہ کئی طبی تنظیموں اور صنعتی اداروں سے تعاون کرتا ہے۔ شروع میں یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا

کہ مصنوعی دل کس چیز سے بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسے بڑا پائیدار بلکہ سرجنوں کی زبان میں گھسنے ٹوٹنے سے محفوظ ہونا چاہئیے۔ اس لئے کہ دل پر کام کا سب سے بڑا بوجھ پڑتا ہے۔ سارے جسم میں خون پمپ کرنے کے لئے اسے ایک منٹ میں ساٹھ تا اسی مرتبہ سکڑنا اور پھیلنا پڑتا ہے، گویا ایک سال میں کوئی چار کروڑ مرتبہ۔ اس کے پائیدار، مضبوط اور قابل اعتماد ہونے کے علاوہ یہ خیال بھی رکھنا پڑتا ہے کہ جس چیز سے بنایا جائے، اسے انسانی جسم قبول بھی کرلے یعنی جن عضلات سے یہ مس ہو، ان میں سوزش وغیرہ پیدا نہ ہوسکے اور اس کی اندرونی سطح پر خون جمنے نہ پائے۔ خون کی خصوصیت یہ ہے کہ رگ سے باہر نکلتے ہی یہ بڑی تیزی کے ساتھ جم جاتا ہے۔ اگر خون میں یہ خوبی نہ ہوتی تو ہمارے جسم میں معمولی سوئی کے چبھتے ہی خون کا فوارہ نکلنے لگتا اور بند نہ ہوتا۔ یہ پہلو بھی مصنوعی دل کے موجدوں کے لئے ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔ اس ایجاد کے سلسلے میں ڈاکٹر، ریاضی داں، کیمیاداں اور ماہرین طبیعیات نے مل جل کر کام کیا۔ طویل عرصے اور انتھک محنت کے بعد وہ مطلوبہ دل بنانے میں کامیاب ہو گئے جو لمبائی، چوڑائی، وزن اور بناوٹ کے لحاظ سے قدرتی دل جیسا تھا۔ اسے شفاف پلاسٹک سے تیار کیا گیا تھا۔ اندر کی ساری رگیں اور نسیں اوپر ہی سے نظر آتی ہیں۔ ان رگوں اور نسوں کے سرے پر والو بھی ہیں جو پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ایک آزمائشی اسٹینڈ پر تنصیب شدہ ہر دل کو کئی مہینے مسلسل دھڑکتا رکھاجاتا ہے تاکہ اس میں کوئی خامی یا نقص ہو تو علم ہوجائے۔ میں نے اس ضمن میں کئی مریضوں کی کیس ہسٹری کا

مطالعه کیا اور حقیقتاً حیران رہ گیا اور دل ہی دل میں ان محققین و موجدین کی کامیابی پر داد دیتا رہا ۔

دل کو ٹھیک طرح چلانے والا برقی آله (پیس میکر) ایک مرتبه لگانے کے بعد دو ڈھائی سال چلتا رہتا ہے۔ پھر اس کی ننھی سی بیٹری ڈاؤن ہوجاتی ہے ۔ چنانچه دوباره اپریشن کر کے اسے تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ یه دشواری فی الحال باقی ہے ۔ تاہم ایک سرجن نے مزید تجربات کے بعد ایک اور آله ایجاد کیا ہے جو ابھی عام نہیں ہوا ہے ۔ ان کی کوشش سے ریڈیو آئی سوٹوپ کے اصولوں پر کام کرنے والے آلے میں برقی قوت پلوٹینم ۲۳۸ کے ذریعه سے پیدا کی جاتی ہے ۔ پلوٹینم کے ریڈیائی اثرات سے گرمی پیدا کی جاتی ہے جسے ایک تھرمو ایلیمنٹ کے ذریعه سے برقی توانائی میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔ یه ننھاسا ایٹمی بجلی گھر تقریباً پندرہ برس تک چل سکتا ہے ۔ لیکن سوویت سائنسداں اس پر بھی قناعت نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اس آلے کو اسقدر ترقی دینا چاہتے ہیں که اس کا عمل ہمیشگی اختیار کرلے۔ توقع ہے که ایک نه ایک دن انھیں کامیابی ہوگی ۔ انھی سائنسدانوں کا خیال ہے که پلاسٹک کے مصنوعی دل کو مزید ترقی دے کر اس لائق بنایا جائیگا کهآج سے سینکڑوں ہزاروں سال پہلے فوت شده انسانوں میں ، جن کی حنوط شده لاشیں عجائب گھروں میں محفوظ ہیں ، مصنوعی دل لگا کر اور ایٹمی قوت سے ان میں خون کی روانی بحال کر کے زنده کرلیا جائیگا ۔ لیکن اس کامیابی کے لئے ایک طویل عرصه درکار ہے ۔ شاید اس صدی کے ختم ہونے تک یه منصوبه مکمل نه ہوسکے۔

دراصل سوویت یونین میں علاج معالجے کے بہت سے منصوبوں

کو اس لئے پائے تکمیل تک پہنچنے کا موقع ملتا ھے کہ وھاں طبی اداروں اور بیماریوں کی روک تھام کرنے والے مرکزوں کو خاطر خواہ سرکاری اعانت حاصل ھوتی ھے۔ وہ محض اپنی ھی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے بلکہ حکومت کی امداد پر بھی بھروسہ کرتے ھیں۔ اس کا ایک خاص سبب بھی ھے۔ علاج کی سہولتیں شہروں اور دیہاتوں تک یکساں طور پر وسیع ھیں اور اس لئے دائرۂ عمل وسیع تر ھے۔ چنانچہ بہت بڑی آبادی کو تندرست رکھنے کے لئے ھر وقت غور و خوض سے کام لیا جاتا اور بہتری کے نت نئے طریقے سوچے جاتے ھیں۔ پھر یہ نہیں کہ دیہات کے کم ترقی یافتہ لوگوں کے لئے علاج کی سہولتیں برائے نام ھوں۔ وھاں ھر دیہی ھسپتال میں ھر قسم کے سازو سامان سے لیس لیبارٹریاں موجود ھیں جہاں فوری طور پر ضروری تجزیہ کیا جاتا ھے۔ اپریشن کے کمرے ھر جگہ ھیں۔ نیز کشادہ اور آرام دہ وارڈ ھیں۔ ایکسرے اور الیکٹرو کارڈیوگراف کی مشینیں تک ھر جگہ گاؤں میں رکھی گئی ھیں تاکہ کہیں دور جانا نہ پڑے۔ دیہات میں تربیت یافتہ اور تجربہ کار عملہ ھر وقت متعین رھتا ھے، پھر بھی شہر کے زیادہ بڑے فنی ماھرین ان علاقوں کا وقتاً فوقتاً دورہ کرتے اور مفید مشورہ دیتے رھتے ھیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف ھارٹ سرجری سے نکل کر میں بھاگ دوڑ کر کے ساڑھے گیارہ بجے انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز پہنچ گیا۔ یہاں آج کانفرنس میں شامل ھونے والے مندوبین کو گیارہ بجے جمع ھونا تھا۔ میں آیا تو پتہ چلا کہ حاضری بہت کم ھے تاھم ملاقات اور تعارف کا سلسلہ جاری ھے۔ میں بھی ادب کے ساتھ اندر داخل ھوگیا اور اندر آ کر گم ھوگیا۔ مجھے اچانک ایک دیرینہ کرم فرما

بابا جان غفوروف کا خیال آگیا ۔ روس کے اس عظیم ادارے کے وہ ڈائرکٹر تھے۔ گزشتہ بار جب میں ۱۹۷۵ء میں یہاں آیا تھا تو میرا زبردست استقبال کیا گیا تھا ۔ حتیٰ کہ جب امیر خسرو کی بین الاقوامی کنگرس کے سلسلے میں اختتامیہ جلسہ یہاں ہوا تو بابا جان مرحوم نے مجھے اسٹیج پر اپنے قریب بلا لیا تھا اور اس وقت میں واحد مندوب اس اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا اور اس سے بڑا اعزاز یہ تھا کہ میں نے اس جلسے میں حسب خواہش بابا جان اختتامی تقریر کی تھی ۔ انھوں نے بڑے موزوں الفاظ میں حاضرین سے میرا تعارف بھی کرایا تھا ۔

آج کا یہ اجتماع بس ملاقات اور باہمی تعارف کے لئے مخصوص تھا اور اس لئے بھی تھا کہ صدرالدین عینی کے بارے میں کچھ معلومات مندوبین کو فراہم کر دی جائیں ۔ ایک بزرگ جن کا نام معلوم نہ ہو سکا ، خود کو عینی کا شاگرد بتا رہے تھے ۔ کہتے تھے اگرچہ میں خود روسی ہوں تاہم تاجیکستان کے صدرالدین عینی کی عظمت کو الفاظ میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے ۔

مجھے سوا بارہ بجے یہاں سے اٹھنا تھا ۔ میں نے سب سے پہلے اپنی مترجم مس مارگریٹا پاؤلونا کو اٹھایا۔ وہ باہر چلی گئیں۔ میں نے چند منٹ ٹھیرنے کا فیصلہ کیا ۔ شکر ہے کہ تقریر ختم ہوئی اور مجھے ایک گستاخی سے نجات مل گئی ۔ میں بھی اٹھ گیا ۔

ھندستان کے تین مندوبین شرکت کے لئے آئے تھے ۔ جناب ڈاکٹر جعفری صاحب اور ان کی اہلیہ سلطانہ جعفری اور محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ ۔ یہ تینوں اس جگہ موجود تھے ۔ مگر میرے آداب کو انھوں نے نظر انداز کر دیا ۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جعفری

صاحب اور عصمت چغتائی صاحبہ کو یقین نہ آتا تھا کہ میں یہاں کیسے ہوں ۔

ادارۂ علوم شرقیہ

علوم شرقیہ کے مطالعہ سے متعلق یہ ادارہ بہت عرصے سے قائم ہے اور اس کے زیر ایوان تمام مشرقی ممالک کے ادبی ورثوں کا مطالعہ اور تجزیہ بڑے پیمانے پر کیا جاتا رہا ہے ۔ ادارے سے وابستہ کام کرنے والوں میں مورخین ، فلسفی ، ادیب ، شاعر اور نقاد سبھی شامل کئے جاتے ہیں ۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے ، علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات پاکستان کے علاوہ کئی ملکوں میں منائی گئیں ۔ ان میں روس بھی پیش پیش رہا ۔ اس وقت سے پہلے بھی عظیم پاکستانی شاعر اور مفکر کی تخلیقات سوویت یونین میں بہت مقبول رہی ہیں ۔ اس حقیقت کا بین ثبوت یہ ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں اقبال کی نظمیں روسی ، ازبکی ، تاجیکی ، تاتاری اور دوسری زبانوں میں تقریباً تیس بار شائع ہو چکی ہیں ۔ ان کی تخلیقات ماسکو ، تاشقند ، دوشنبہ اور کازان میں کتابی صورت میں اور ممتاز اخبارات و رسائل کے صفحات پر بھی شائع ہوتی رہی ہیں ۔ اس کارخیر میں مستند مترجمین اور ممتاز شعرا نے حصہ لیا جن میں سرگئی سیورت سیف ، سیم یون لپکن ، اورم اور میر شاکر شامل ہیں ۔ یہ سب علوم شرقیہ کے ادارے سے وابستہ ہیں ۔ ایک اور سوویت ماہر علوم شرقیہ نے پاکستانی عوام کی آزادی اور خودمختاری کے حصول کی جنگ میں اور نو آبادیاتی ظلم و تشدد کے خاتمے میں اقبال کے خصوصی کردار کے مطالعہ پر توجہ دی ہے ۔ علوم شرقیہ کے سوویت ماہر نکولائی۔آئی کیئف نے اپنی متعدد کتابوں میں ان

کی تخلیقات میں انسان دوستی کے رجحانات اور فلسفیانہ ورثے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی کتاب ۱۹۵۹ء میں "محمد اقبال، ممتاز مفکر اور شاعر" کے عنوان سے کافی تعداد میں شائع ہوئی تھی۔ آنی کیئف نے اقبال کے فلسفے میں فرد کے مسئلے اور ان کے معاشرتی و سیاسی رجحانات کے تجزئیے پر زیادہ توجہ دی ہے۔ عبداللہ غفاروف اورس اور کاردرووا نے بھی انہی موضوعات کے مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ لیودمیلا پولونسکایا کی کتاب "پاک و ہند کی عوامی فکر میں مسلمانوں کے رجحانات" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بیشتر حصے میں اقبال کے فکری رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نکولائی گلیبوف، نتالیا پریگورنیا، الیکسی سوفو چیئف، غضنفر الیئف، میر شاکر اور علوم شرقیہ کے دوسرے ماہرین نے اقبال کی شاعری اور ان کی عظیم تخلیقی صلاحیتوں کی ترقی اور ارتقا کی تاریخ پر کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ماسکو سے شائع ہونے والی کتاب "جنوبی ایشیا میں فارسی زبان کے ادب کی تاریخ" اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہونے والی "اردو ادب کی تاریخ" میں بھی اقبال، غالب، حالی، نذیر احمد اور راشدالخیری کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۲ء کی ایک کتاب میں نئی نسل کے نوجوان پاکستانی دانشوروں کے حالات زندگی اور تخلیقات پر مقالے لکھے گئے ہیں۔ روسی انسائیکلوپیڈیا اور حوالہ جات کی دوسری کتابوں میں بھی پاکستانی ادیبوں اور شاعروں پر کافی مواد موجود ہے۔ "بانگ درا" کا مکمل ترجمہ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں "پیام مشرق"، "ضرب کلیم"، اور "جاوید نامہ" کی مشہور نظموں کے ترجمے کئے گئے اور کتابی صورت میں شائع کئے گئے۔

سوویت بچے بھی پاکستانی ادب کی چاشنی سے محروم نہیں رہے ۔
یہاں کی بہت سی کہانیوں اور نظموں کے ترجمے ان کے لئے بھی
کرائے گئے جن کے مصور ایڈیشن ہر شہر میں دستیاب ہیں ۔

پروفیسر عثمانوف

مطالعۂ علوم شرقیہ (اورینٹل اسٹڈیز) کا شعبہ اکیڈمی آف
سائنسز کے ماتحت ہے اور اس سے وابستہ پروفیسر عثمانوف صاحب
بڑی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع ہے ۔ وہ
صرف اپنے فرائض منصبی ہی ادا نہیں کرتے بلکہ اس کام میں خاص
دلچسپی بھی لیتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ذاتی دلچسپی کے بغیر
کوئی کام سلیقے کے ساتھ انجام نہیں پاتا ۔ ان سے میری پہلی
ملاقات ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی کہ جب میں امیر خسرو دہلوی
کے جشن میں شرکت کے لئے ماسکو آیا تھا اور جمیل الدین عالی صاحب
بھی میرے ساتھ تھے ۔ اس دوران قیام میں ایک روز ترجمان نے
مجھے بتایا کہ آج دوپہر کو پروفیسر عثمانوف صاحب کے گھر پر
میری دعوت ہے ۔ وہ خود تشریف لائے تھے ۔ مجھسے ملاقات نہ
ہوسکی تو پیغام چھوڑ گئے تھے ۔ چنانچہ میں اپنے مترجم اور عالی
صاحب کو ساتھ لے کر چل پڑا ۔ ان کا گھر جو حکومت کے تعمیر
کردہ ایک فلیٹ میں تھا ، زیادہ دور نہیں تھا ۔ ان کا فلیٹ اور
اس کا انداز دیکھکر مجھے استنبول کے پروفیسر قراحان کا گھر یاد
آگیا ۔ دونوں میں بڑی ہی مماثلت تھی ۔ مکان سے اندازہ ہوا کہ
روس میں پروفیسروں کا مقام واقعی بہت بلند ہے ۔ وہ بڑے اطمینان
سے رہتے ہیں ۔ پروفیسر صاحب کی لائبریری میں مختلف ممالک میں
چھپے ہوئے قران شریف جمع تھے ۔ احادیث کی تمام معروف کتابیں

موجود تھیں - عربی و فارسی ادبیات پر بے اندازہ اچھی کتابیں بھی نظر آئیں - اپنے مطالعے کے جس کمرے میں وہ بیٹھ کر اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں، وہاں جانماز بھی رکھی تھی - اسطرح ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں اندازہ لگانے کا موقع مل گیا -

پروفیسر عثمانوف صاحب کی اہلیہ کا نام خدیجہ ہے - محترمہ نے بہت ہی پر تکلف کھانے تیار کئے تھے - مجھے خلاف معمول دوپہر کے اس کھانے میں شرکت کرنی پڑی - میری کوشش یہ رہی کہ زیادہ میٹھی اشیا سے شغل کروں ، ورنہ ہضم کا نظام خراب ہو جاتا جبکہ گوشت کھانے سے میں نے اجتناب کیا - اس موقع پر عالی صاحب نے فرمایا :

''حکیم صاحب کو تامل اس لئے ہے کہ یہ ذبیحہ ہے یا نہیں،،۔

اس وقت میرے ذہن میں یہ بات ہرگز نہیں تھی - وہ کوئی ہوٹل نہیں، ایک اچھے راسخ العقیدہ مسلمان کا گھر تھا۔ یہ بات زبان پر لانی نہیں چاہئے تھی - میں نے اپنے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے تردید کا اظہار کیا اور فوراً گوشت کھانا شروع کردیا۔ تاکہ عالی صاحب کے جملے کی تردید ہوسکے اور میزبان کو تکلیف نہ ہو - میں نے محسوس کیا کہ پروفیسر صاحب اور محترمہ خدیجہ صاحبہ کو ایک گونہ اطمینان ہوا اور وہ عالی صاحب کے ریمارک کو محض مزاح سمجھ کر مسکرا کر رہ گئے -

کھانے کے بعد پروفیسر عثمانوف صاحب نے ایک لمبی جا نماز بچھادی تھی جس پر کئی اشخاص بیک وقت نماز پڑھ سکتے تھے - انھوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں امامت کروں - مقتدی

وهی ایک تھے ۔ نماز سے فارغ ھوکر میں اپنے میزبان سے علمی باتیں کرتا رھا اور وعدہ کیا کہ میں پاکستان جا کر ان کے ذوق کے مطابق بہت سی کتابیں سفارت خانے کی معرفت بھیجونگا ۔ دوران گفتگو معلوم ھوا کہ انھوں نے ''شاھنامۂ فردوسی،، کی چار جلدیں روسی زبان میں مرتب کی ھیں ۔ میں نے کہا کہ میں ''شاھنامۂ اسلام،، کی ایک جلد آپ کو بھیجونگا ۔ انھیں علوم شرقیہ سے خاص دلچسپی تھی ۔

علوم شرقیہ کے سوویت ماھرین کی کاوشیں ادب وشعر تک محدود نہیں رھیں۔ ان کا دائرہ بہت وسیع رھا ۔ تاریخ کے بارے میں ایک ممتاز کتاب ''پاکستان کے تین آئین'' قابل ذکر ھے ۔ اسے میرے عزیز دوست پروفیسر سی ۔ گونکوفسکی اور و، موسکا لینکو نے مشترکہ طور پر مرتب کیا ھے ۔ اس میں پاکستان کی آئینی تاریخ کا جائزہ لیتے ھوئے دوسرے متعلقہ مسائل پر بھی بحث کی گئی ھے ۔ اس کا دیباچہ میخائیل کاپتسا نے تحریر کیا ھے جو کئی سال تک پاکستان میں سوویت یونین کے سفیر رہ چکے ھیں ۔ وہ سفیر بننے سے پہلے اور اس کے بعد بھی علوم شرقیہ کے ادارے کے سرگرم رکن رھے ھیں ۔ سوویت مستشرق، مقیم ژانو وا نے، جو پاکستان کی خارجہ پالیسی پر اپنے تحقیقی مقالوں کے سبب مشہور ھیں' 'پاکستان' جنوبی ایشیا اور امریکی پالیسی، کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں ۱۹۶۰ء کے بعد پاکستانی امریکی تعلقات کے بارے میں اھم مسائل کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ھے جسکے بعض حصے غور طلب بلکہ متنازعہ فیہ بھی ھوسکتے ھیں ۔ جب بھی ضرورت پڑی ھے، سوویت مستشرقین نے پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں کے

دانشوروں سے رابطے قائم کئے اور ان کی اعانت کا اعتراف کیا ہے۔

بالکل حال کی بات ہے کہ پاکستان کے بارے میں مضامین کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں، جو ان سوویت صحافیوں نے لکھے ہیں جن کو ادارۂ مذکور نے پاکستان میں قیام کے لئے بطور خاص بھیجا تھا۔ ایک مجموعے کا نام "ستروان سمت الراس" ہے جسے و، نا کاریا کوف نے مرتب کیا ہے۔ دوسرے کا نام "ماضی سے بغاوت" ہے جو ا، فلیپوف کے روزنامچوں اور سفر نامے پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں مستشرق خواتین نے بھی حصہ لیا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستانی خواتین کی تنظیم اور ان کی سرگرمیوں کے بارے میں صبیحہ مافاموا کی ایک کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

مستشرقین کے علاوہ اور مصنفین کے نام بھی لئے جاسکتے ہیں جو ادارے سے وابستہ نہ سہی لیکن قابل قدر خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ مثلاً لیود میلا آرستووا کی لکھی ہوئی کتاب "پاکستان کا فنیاتی ذیلی ڈھانچہ" یا تاجیکستان کے نوجوان اسکالر تاخور جباروف کی کتاب "صوبہ سرحد کی معیشت" قابل ذکر اضافے ہیں۔

روسی نیشنل کمیشن برائے یونیسکو

مذکورہ بالا دونوں اداروں میں حاضری دینے کے بعد مادام سولووی اووا صاحبہ نے میرے لئے آج کا جو پروگرام بنایا تھا، اس میں نیشنل کمیشن برائے یونیسکو، روس میں جانا شامل تھا۔ یہ بھی میرے مزاج کے عین مطابق تھا۔ پاکستان کے نیشنل کمیشن برائے یونیسکو سے اپنے تعلق کی بنا پر، نیز کورئر کے اردو ایڈیشن "پیامی"، کے مدیر کی حیثیت سےاور یونیسکو کی سرگرمیوں سے دلچسپی

کی وجہ سے مجھے اس کمیشن کے دفتر میں آنا ہی چاہئے تھا ۔ چنانچہ وہاں پہنچ گیا ۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ اس عمارت کا قدیم نام معلوم ہوجائے جس میں دفتر قائم تھا مگر اس کا صحیح علم کسی کو نہیں تھا۔ میں یہ جانتا تھا کہ اس عمارت کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ جب فرانس کے نپولین بونا پارٹ نے روس پر حملہ کر کے ماسکو پر قبضہ کیا تو وہ اس عمارت میں عارضی طور پر قیام پذیر ہوگیا تھا ۔ اس وقت عمارت کا وہی کمرہ نیشنل کمیشن کے سکریٹری جنرل جناب نکولاس ای مر ذوف صاحب کا کمرہ ہے ۔ نپولین کی وہ خواب گاہ تھا ۔ اس اعتبار سے میں آج ایک تاریخی عمارت اور ایک تاریخی کمرے میں تھا ۔ اگر روسی جنرل کوتوزوف اپنی شکست تسلیم کر کے ماسکو نپولین کے حوالے نہ کرتے تو نپولین یہاں کیسے آتا اور سوتا ۔ کوتوزوف نے ماسکو نپولین کے حوالے کر دینے کا فیصلہ جب ایک جھونپڑی میں بیٹھ کر کیا تھا تو کوئی بھی جنرل اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا ۔ بلکہ وہ کوتوزوف کو پاگل قرار دے رہے تھے ۔ تا ہم حالات نے ثابت کر دیا کہ کوتوزوف نے ماسکو نپولین کے حوالے کرکے اس کو سخت مشکل میں ڈال دیا تھا ۔ جب سردی نے زور پکڑا ، برف باری نے راہوں اور گزرگاہوں کو بند کردیا اور اکل و شرب کی فراہمی مسدود بلکہ ناممکن ہوگئی تو نپولین کو لوٹ جانا پڑا اور جب اس کی فوج اس کے زیر کمان واپس ہو رہی تھی تو کوتوزوف نے اسے جا لیا اور بڑی دردناک اور عبرت انگیز شکست دی ۔ ماسکو روسی فوج کو واپس مل گیا۔ نپولین نے اس مہم میں صرف اتنا کیا کہ اس کمرے میں سو کر

اسے تاریخی بنا گیا - عمارت کی تاریخی حیثیت معلوم نہ ہو تب بھی یہ حقیقت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے -

نیشنل کمیشن برائے یونیسکو کی عمارت پر زبردست پہرہ لگا ہوا تھا - یہ روز کا معمول تھا - اس سرکاری عمارت پر پہرے کا انداز یہی ہے - میں نے ٹھیک بارہ بجے وہاں قدم رکھا - میرے پہنچنے سے پہلے مادام سولووی اووا دروازے پر میرے استقبال کے لئے موجود تھیں - اس ادارے میں ان کی حیثیت ایک نائب کی ہے - نکولاس ای سرنوف ان کے ''باس،، ہیں - تعارف کے بعد ہم تینوں ایک گول میز پر بیٹھ گئے - کوئی آدھ گھنٹے تبادل خیال ہوا - مرنوف صاحب نے روس کے نیشنل کمیشن برائے یونیسکو کے خط و خال کے بارے میں بتایا - اندازہ ہوا کہ اس کے بورڈ میں مصنفین روس کی انجمن کے، پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے اور اکیڈمی آف سائنسز کے نمائندگان یعنی کل بیالیس ارکان شامل ہیں اور اس اعتبار سے یہ بڑا اہم نیشنل کمیشن ہے - اس کا اپنا چھاپے خانہ ہے - مجموعی طور پر اس کمیشن سے ایک ہزار افراد متعلق ہیں اور یونیسکو کے تعاون سے بڑے اہم کام ہو رہے ہیں - میں نے جملہ تفاصیل کو کان کھول کر غور سے مگر بڑی حیرت کے ساتھ سنا - پھر مجھے خیال آیا کہ پاکستان میں نیشنل کمیشن برائے یونیسکو اس لحاظ سے کس درجہ خوابیدہ ہے - میں سوچتا ہوں کہ میری بھاگ دوڑ سے اس میں جو بھی جان آئی ہے ، ہنوز نہ ہونے کے برابر ہے - اسے مزید روح افزائی کی ضرورت ہے - میں نے مرنوف صاحب کو بتایا کہ اب پاکستان کا نیشنل کمیشن برائے یونیسکو متحرک ہے - اس کے بورڈ پر اب وائس چانسلرز ، اکیڈمی آف سائنس اور سائنس فاؤنڈیشن

کے اہم لوگ متعین ہیں - به ایں همه یه همارا نیشنل کمیشن کس درجه غیر فعال هے - اس کا حال لکھتے ہوئے مجھے شرم آتی هے۔

میں نے مرنوف کو ان تین پروجیکٹس کے بارے میں بتایا که جو اس وقت همارے زیرغور ہیں اور ان پر عمل ہونے والا هے - وہ یه ہیں :

(۱) ہسٹری آف سویلائزیشن ان سنٹرل ایشیا ۔

(۲) انٹر نیشنل کنگرس، ہسٹری اینڈ فلاسفی آف سائنس ۔

(۳) انٹر نیشنل چلڈرن کلچرل فیئر ۔

اول الذکر کے بارے میں مرنوف صاحب بخوبی آگاہ تھے ۔ میں نے ان کو بتایا که میری حسب خواهش دوشنبه کی میٹنگ میں یه طے پایا هے که اگلی مشاورتی میٹنگ پاکستان میں منعقد ہوگی - یونیسکو اور همدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے اشتراک عمل سے یه کام اسی سال ہوگا - نمبر ۲ اور نمبر ۳ کے بارے میں بھی میں نے اختصار کے ساتھ بتایا - بلا شبه یه تینوں پروجیکٹس بڑے اہم ہیں - مرنوف صاحب نے بھی ان کی اہمیت کو محسوس کیا اور اچھی طرح سراہا ۔

ریستوراں پراگ میں جناب مرنوف نے لنچ کا انتظام میرے اعزاز میں کیا تھا ۔ وہ ان کے دفتر سے قریب تر هے - هم تینوں ٹہلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے - اچھا ریستوراں هے مگر یہاں دودھ نہیں ملتا۔ میں نے آج مناسب خیال نه کیا که میں اپنا ناشته الگ طلب کروں - بس فیصله کیا که آج پورا لنچ لے لینا چاهیئے - چنانچه ایسا هی کرلیا گیا - کھانا اچھا تھا - لیکن میں عادی نہیں تھا - بس دل کڑا کر کے نوش کرلیا مگر انجام وهی

ہوا جس کی توقع تھی - طبیعت بھاری ہوگئی اور کسل نے گھیر لیا - غنیمت ہے کہ اس کے بعد کوئی علمی پروگرام طے نہیں تھا ، ورنہ اس میں شرکت مشکل ہوجاتی - میرا تو یہ حال تھا کہ جیسے چوہے کو پارا پلا دیا گیا ہو - کھانے پر مرنوف صاحب اور مادام بلبل سے خوب باتیں ہوئیں - ان سے پتہ چلا کہ مادام اولگا رودمیل، نائب مدیر اعلا، کورئر گزشتہ دنوں ماسکو میں تھیں - ان سے یہ بھی معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مدیر اعلا رینے کالوز کی صحت اچھی نہیں رہتی اور وہ شاید بر بنائے خرابیٔ صحت اس سال کے آخر تک مستعفی ہوجائیں - رینے کالوز بہت نفیس انسان ہیں - کاش میں ان کے قریب ہوتا اور اپنی طبی استعداد کو بروئے کار لا کر ان کے کام آتا - ڈاکٹر کافلر صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد یہ خطرہ تھا کہ اب کافلر جیسا انسان نہ آسکے مگر رینے کالوز نے ان کی کمی کو محسوس نہ ہونے دیا - اب دیکھئے کیا ہوتا ہے - بہت اچھا ہو اگر مادام اولگا رودمیل ان کی جگہ مقرر ہوجائیں - شاید ایسا ہی ہوگا -

مندوبین کے اعزاز میں

آج ہی دو بجے کے قریب انجمن مصنفین روس کی جانب سے انھی کی عمارت میں ایک اجتماع کی اطلاع ملی تھی - یہ صدر الدین عینی کے جشن صد سالہ کے مندوبین کے اعزاز میں ہونا تھا - میرا خیال تھا کہ یہ کوئی علمی ادبی تقریب ہوگی مگر معلوم ہوا کہ محض لنچ کا اہتمام تھا - خیر، میں اس میں برائے نام شریک ہوگیا اور یہ دیکھتا رہا کہ مختلف ملک و مزاج کے لوگ کس طرح لذت کام و دہن حاصل کرتے ہیں - جناب فیض

احمد فیض بھی دھلی سے آچکے تھے - افغانستان کے رحیم صاحب اور ترکی کے مندوب بھی موجود تھے - مجموعی طور پر غیر روسی مندو بین کی تعداد سات یا آٹھ تھی - باقی ماسکو کے باشندے تھے جن کا تعلق فارسی زبان سے تھا - ان سمیت کل تعداد پچیس یا چھبیس تھی - دوسرے روز اسی گروپ کو دوشنبہ (تاجیکستان) روانہ ہونا تھا - میں نے محسوس کیا کہ یہ کوئی علمی اجتماع نہیں ھے - محض ایک جشن ھے اور لوگ کھانے پینے کے زیادہ شائق ھیں - ان کی شرکت سے اجتماع کو ایک جشن کی حیثیت اور شان حاصل ہوگئی تھی - ایران سے کوئی نمائندگی نہیں تھی - یہ لنچ بہت بے تکلف تھا - ھر لحاظ سے بے تکلفی پائی جاتی تھی - شراب و کباب کا دور تھا اور سوائے میرے سب ھی ''خوش ذوق،، تھے اور خوب داد عیش دے رہے تھے - خواتین کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بھی شراب و کباب میں دل و جان سے شریک تھیں اور مردوں سے بازی لے جانے کی کوشش کررھی تھیں - محاورے کے مطابق سب مچھلی کی طرح پی رہے تھے -

میں نے اس وقت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ میں اس اجتماع میں کس درجہ ''ان فٹ،، ھوں بلکہ ''مس فٹ،، ھوں - اندازہ ھوا کہ دوشنبہ پہنچ کر ھی میری یہ وحشت دور ھوگی - وھاں اھل علم ملینگے - خصوصاً پیارے دوست محمد عاصموف صاحب جن کا مقام بڑا علمی ھے اور جو بہت ھی سنجیدہ و متین انسان ھیں، اپنی معیت سے لطف پہنچائیں گے- ان کے رفیق اور میرے دوست مرزا یوف صاحب تو اللہ کو پیارے ھوگئے - وہ پاکستان آکر میرے مہمان رہے تھے -

شام کے ٹھیک پانچ بجے پروفیسر گونکوفسکی صاحب تشریف لے آئے - روس کی یہ بڑی اہم شخصیت ہیں ، اور ان کو مطالعہٗ پاکستان میں درجہٗ تخصص حاصل ہے - پاکستان پر ایک آتھریٹی کی حیثیت سے وہ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں - مجھے ذاتی طور پر ان کے انداز فکر سے اتفاق نہیں ہے - میرا تاثر یہ ہے کہ یہ آج بھی موجودہ آدھے پاکستان کو چار قومیتیں قرار دیتے ہیں اور ان کی رائے میں ان کو چار ملک بن جانا چاہئے - ان کو پاکستان کا ہمدرد قرار دینا مشکل ہے - البیرونی کنگرس میں بابا جان غفوروف شرکت کرنے والے تھے - انھی کو دعوت دی گئی تھی - مگر آگئے گونکوفسکی صاحب - مجھے اس موقع پر ان سے پہلی بار تعارف حاصل ہوا تھا - میں نے ان سے دوستی کا فیصلہ کیا اور میں نے ان سے قریب ہوکر ہمیشہ کوشش کی کہ وہ پاکستان کے بارے میں اپنے نقطہٗ فکر میں تبدیلی پیدا کردیں - میرا موقف یہ تھا کہ یہ کوشش اس کے مقابلے میں صحیح تر ہے کہ گونکوفسکی کو غیر ہمدرد بنائے رکھا جائے اور اس طرح ان کی پاکستان کے مفاد سے عدم دل چسپی میں اضافہ کیا جائے - میں نے اسی مقصد عظیم کے تحت ان سے دوستی کی اور میں اس دوستی کو نبھاتا رہا - اسی دوستی کا اثر و نتیجہ ہے کہ وہ آج ماسکو میں مجھسے ملنے آگئے ، حالانکہ یہاں اپنے ملک میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور لوگ ان کو ایک اہم انسان جانتے ہیں اور حقیقتاً وہ ہیں بھی بہت بلند - پاکستان کیلئے نہ سہی ، اپنے ملک کے مفاد کیلئے ان کی خدمات قابل تعریف سمجھی جاتی ہیں - جب لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ مجھ سے ملنے آرہے ہیں تو سب کو حیرت ہوئی اور

پھروہ جس گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے ملے وہ اور بھی حیرت انگیز بات تھی - ۱۹۵۷ء میں جب میں ماسکو آیا تھا تو میں نے ڈائری میں حسب ذیل تاثرات لکھے تھے :

"بابا جان غفوروف صاحب تاجیکستانی ہیں، روسی نہیں ہیں - میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ پروفیسر گونکوفسکی ان سے قریب نہیں ہیں - شاید بابا جان کی جگہ ان کو لینی ہے اور یہ اس کیلئے خواہاں نظر آتے ہیں - اگر انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کا منشاء متعین ہے تو اس جگہ کی صدارت کے لئے غیر روسی ہی ہونا چاہئے - گونکوفسکی صاحب کا میری رائے میں کوئی چانس نہیں ہے۔ لیکن چونکہ گونکوفسکی صاحب مستشرق کی حیثیت سے بھی ابھر رہے ہیں، اس لئے کم امکان موجود ہے کہ وہ ان کی جگہ لینگے لیکن میرے نزدیک پروفیسر محمد عاصموف صاحب سے بہتر کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوسکتا - بابا جان غفوروف صاحب کی صحت جواب دے رہی ہے - ان کے گردوں میں ضعف ہے - اب ان کی اہلیہ بھی علیل ہوکر ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوچکی ہیں - بابا جان کی ایک ہی لڑکی ہے جو ان کے پاس نہیں ہے - اب گھر پر یہ تنہا ہیں - میں نے بڑی کوشش کی کہ میں ان کے گھر پر حاضر ہوجاؤں مگر انہوں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا -

آج پروفیسر گونکوفسکی کے ساتھ ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر سرگے بھی آئے تھے - گذشتہ بار میرے یہاں آنے پر طالب علم سرگے میرے لئے ترجمانی کے فرائض انجام دینے پر مامور کئے گئے تھے - اب تین سال میں وہ فارغ التحصیل ہوکر ڈاکٹر ہوگئے تھے - ان کی

ایک کتاب اقتصادیات پاکستان پر شائع ہوئی ہے - انہوں نے اپنے ایک خط کے ساتھ ایک جلد مجھے پاکستان بھجوائی تھی اور مجھے اطلاع دی تھی کہ اب میں ڈاکٹر ہوگیا ہوں - انہوں نے اقتصادیات میں پی ایچ ڈی کیا ہے - میں نے ان کو فوراً مبارک باد بھیجی تھی - اندازہ یہ ہے کہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ یعنی تھیسس یہی کتاب ہے - میں نے پروفیسر گونکوفسکی صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ ڈاکٹر سرگے کو وہ ایک ڈیڑھ ماہ کیلئے پاکستان بھجوادیں تاکہ پاکستان کی اقتصادیات کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا ان کو موقع مل جائے اور وہ اپنی کتاب کے اگلے ایڈیشن میں مناسب رد و بدل کرلیں - میری رائے سے انہوں نے اتفاق کیا اور شکریہ بھی ادا کیا - لیکن خود مجھ ہی سے درخواست کی کہ میں ایک باقاعدہ خط لکھدوں - میں نے مشورہ دیا کہ اس مقصد کیلئے اسی سال دسمبر کا یا اگلے سال جنوری کا مہینہ مناسب رہے گا -

پاکستان کے حالات پر

پروفیسر گونکوفسکی صاحب نے پاکستان کے حالات حاضرہ کے بارے میں سوال کیا - یہ سوال غیر متوقع تھا - انہوں نے کہا کہ وہ تین ماہ کنیڈا رہ کر آئے ہیں - جہاں وہ اسلامک سنٹر کے مہمان تھے - پروفیسر کینٹ ول اسمتھ ان کے میزبان تھے اور پروفیسر چارلس بھی کہ جو آجکل اس کے ڈائرکٹر ہیں - پروفیسر گونکوفسکی صاحب نے بتایا کہ اسمتھ صاحب کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے ، اس میں ایک اہم باب ''پاکستان میں اسلام،، پر ہے - یہ کتاب مجھے اب تک نہیں ملی ہے - اسمتھ صاحب پاکستان میں میرے مہمان رہ چکے ہیں اور شام ہمدرد کی تقریب میں لیکچر

بھی دے چکے ہیں۔

پاکستان کے بارے میں سوال کو میں گھما کر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ان کو جو بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) فوجی انقلاب بر وقت تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خانہ جنگی ہوتی۔

(۲) بھٹو صاحب نے سب سے شدید غلطی یہ کی کہ انہوں نے لوگوں کو بے عزت کرنے کی پالیسی اختیار کی، جو بہر حال غلط تھی۔ میں نے بتایا کہ خود مجھے انہوں نے زبردستی سیاست میں گھسیٹ کر مجھے شکست دلوانے کا انتظام بھی کیا۔ پروفیسر کو اس پر حیرت ہوئی مگر میں نے اس پر پورا زور دیکر یہ حقیقت گونکوفسکی صاحب کے ذہن نشین کرادی ہے۔ وہ گزشتہ مارچ میں میرے انتخابات میں حصہ لینے کے بارے میں خوب واقف تھے۔

(۳) میں نے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب کو ہم بہت اچھا انسان قرار دیتے ہیں اور اس بات کے حامی ہیں کہ قومی حکومت ان کی نگرانی میں قائم ہو جائے اور وہ کم از کم تین چار سال تعمیر پر توجہ دے۔

(۴) میں نے ان کو بتایا کہ بھٹو صاحب نے سیاسی اغراض کے لئے لیبر پالیسی ایسی بنائی ہے کہ اب پوری صنعت ملکی مفلوج ہے اور پروڈکشن آدھی سے بھی کم ہے۔ میں نے پروفیسر صاحب کو ماسکو میں

جگہ جگہ آویزاں بورڈوں کا حوالہ دیا جس میں
مزدور عہد کرتا ہے کہ میں مصنوعات ملکی میں روسی
معیارات بلند کروں گا ۔

(۵) پاکستان ساری اقوام و ملل کی دوستی کا خواہاں ہے۔
اقوام و ملل کو بھی پاکستان کا احترام کرنا چاہئے
کہ جو بد قسمتی سے نہیں ہے ۔

پروفیسر گونکوفسکی کی میں عزت کرتا ہوں اور ان کا احترام بھی دل سے کرتا ہوں ۔ میں ان کو پاکستان کا دوست دیکھنا چاہتا ہوں اور ان کے دل میں پاکستان اور اہل پاکستان کی محبت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ ان کو جو محبت اور تعلق میری ذات سے ہے' میں چاہتا ہوں کہ وہ ایسی ھی محبت میرے وطن کے ہر فرد سے کریں ۔ پاکستان اور روس کے مابین بہتر تعلقات کی بنیاد خلوص و دوستی کو بننا چاہئے اور سیاست سے گریز کرنا چاہئے ۔ سیاسیات حاضرہ انسانوں کو بے مروت اور خود غرض بنا رہی ہے ، اور عالمی نزاع پیدا کر رہی ہے۔ میں پاکستان اور روس دوستی کا آرزومند ہوں مگر قطعی طور پر انسانیت اور محبت و خلوص کی بنیادوں پر اور ایسا میری رائے میں ممکن ہے ۔

ایک گھنٹے کی یہ ملاقات اچھی رہی ۔ میں نے پروفیسر گونکوفسکی صاحب سے کہا کہ اگست ۱۹۷۸ء کی ۲۶ تاریخ کو میں اور سعدیہ اور آپ کی شاگرد مسز ڈی سلوا دو دن کے لئے ماسکو آئیں گے ۔ پروفیسر صاحب نے زور دیکر کہا کہ ھم ان کے گھر قیام کریں ۔ میں نے شکریہ ادا کردیا ہے اور ڈاکٹر سرگے کے لئے کہ دیا ہے کہ ان کو تیار کردیں ۔ یہ میرے ساتھ میرے گھر

قیام کرینگے ۔ میں ان کو اپنے بیٹے کی طرح رکھوں گا ۔ اور چونکہ میرے ھاں بیٹا نہیں ھے ، اس لئے شاید میں ان کو پاکستان میں روک لوں ۔

نیشنل کمیشن برائے یونیسکو نے آج اہتمام کیا ھے کہ میں روسی شہرۂ آفاق سرکس دیکھوں ۔ کمیشن کی جانب سے جناب انا تونی صاحب آئے تھے ۔ ان کے ساتھ سرکس دیکھنے گیا ۔ سات بجے سے رات پونے دس بجے تک پروگرام تھا ۔ بڑا دلچسپ پروگرام تھا ۔ ۱۹۷۰ء میں بھی میں نے یہاں کا سرکس دیکھا تھا ۔ یہ لوگ ترقی کرتے جارہے ھیں۔ نئے نئے پروگرام بناتے رہتے ھیں۔ یہی وجہ ھے کہ جب بھی آؤ ، ھال بھرا ھوا ملیگا اور کبھی خالی نہیں ھوتا ۔ آج میں نے پھر یہ بات نوٹ کی کہ سرکس اور تماشے کے دوران تعمیر وطن کی بات بڑے سلیقے سے آجاتی ھے ۔ سوا دس بجے میں ھوٹل واپس آ گیا ۔

میں نے پروفیسر گونکوفسکی صاحب سے سوال کیا تھا :

’’ میں ۱۹۷۰ء میں جب آیا تھا تو میں نے ماسکو میں ایک بات شدت کے ساتھ محسوس کی تھی کہ لوگ بڑے سنجیدہ رہتے ھیں ۔ میں چہروں پر مسکراھٹ کو ترس گیا تھا ۔ مگر اب ۱۹۷۸ء میں وہ بات نہیں ھے ۔ لوگ زیادہ خوش نظر آتے ھیں ۔ اس کی کیا وجہ ھے ؟ ‘‘

انہوں نے بتایا کہ اب حالات بدلتے جارہے ھیں ۔ لوگ اب تعمیری جد و جہد کے بعد خود کو ری لیکس (Relax) محسوس کرتے ھیں ۔ خوش حالی میں اضافہ ھورھا ھے ۔ انہوں نے کہا :

’’ ذرا ماسکو سے باھر جا کر دیکھئے کہ اب لوگ کیسے

مکانوں میں رہتے ہیں۔ گزشتہ تین سالوں میں لوگوں کے رہن سہن میں فرق آگیا ہے بلکہ انقلاب آ گیا ہے۔ موجودہ حالات سے لوگ اب زیادہ خوش ہیں،،۔

ماسکو سے دوشنبہ

اب موجودہ سفر کی دوسری منزل تک پہنچنا تھا۔ یعنی ماسکو سے دوشنبہ (تاجیکستان) جانے کا پروگرام تھا۔ یہ طے ہوگیا تھا کہ تمام مندوبین صبح نوبجے جمع ہوجائیں گے اور پھر سب موٹریں ایک ساتھ روانہ ہونگی تاکہ ایک ہی وقت میں منزل مقصود پر پہنچ سکیں۔ میں بہر نوع وقت مقررہ پر ہوٹل یوکرائن کے وسیع ہال میں آگیا جہاں واقعتاً ہر وقت ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ ہزاروں آدمی مختلف پروازوں سے روزانہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہوٹل بہت بڑا ہے۔ اس کی گیارہ منزلیں ہیں جن میں رہنے کے ہزاروں آراستہ کمرے ہیں۔ لفٹ صرف چھ لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے دو تین کام نہیں کرتے۔ لیکن باقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ذرا انتظار کرنا نہیں پڑتا۔ سب خود کار ہیں۔ صرف دو لفٹ گیارھویں یعنی آخری منزل تک جانے کے لئے مخصوص ہیں۔ باقی بیچ ہی میں رکتے اور پھر نیچے اتر آتے ہیں۔ ان کو چلانے کے لئے ہوٹل کا اپنا جنریٹر ہے۔ اس لئے کبھی کسی کے فیل ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ متبادل انتظام کے طور پر بجلی کی عام لائن سے بھی حسب ضرورت مدد لی جاسکتی ہے۔ البتہ میرا تجربہ یہ ہے کہ ایسے بڑے ہوٹلوں میں نیچے کی پہلی یا دوسری منزل میں قیام کرنا بہتر ہے تاکہ اگر بفرض محال کبھی لفٹ میں جگہ نہ ملے یا وہ چلنے سے معذور ہوں تو سیڑھیوں کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بہ صورت اوپر

کی منزل میں پیش آئے تو بڑا وقت اترنے چڑھنے ہی میں صرف ہوجائے۔

ہم ہوٹل سے ساڑھے نو بجے کے بعد ہی روانہ ہوئے۔ ہوٹل سے ہوائی میدان کا راستہ صرف پون گھنٹے کا ہے۔ اس مختصر مدت میں میں نے خاص طور پر آج مضافات ماسکو پر نظر ڈالی۔ واقعی گزشتہ روز پروفیسر گونکوفسکی صاحب ٹھیک ہی کہ رہے تھے کہ مضافات میں اتنے رہائشی فلیٹ بنے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ آٹھ آٹھ دس دس منزلوں کے پلازا ہیں۔ سب ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت قطار اندر قطار تعمیر ہوئے ہیں۔ ماسکو سے ہوائی میدان تک بالائی سڑکوں کے علاوہ زمین دوز راستے (میٹرو) بھی ہیں جن کے ذریعہ سے بڑی عمارتوں کو بھی ایک دوسرے سے ملادیا گیا ہے۔ زمین کے نیچے ٹرینوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ لوگوں کو ماسکو سے آنے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ وسیع علاقے میں زیادہ تر محنت کش طبقے کے عوام رہتے ہیں لیکن بناوٹ اور سجاوٹ دونوں اعتبار سے عام عمارتوں سے کسی طرح بھی کم تر درجے کی چیز نہیں ہیں۔

مجھے معاً اپنا وطن یاد آ گیا۔ کراچی پہلے بہت چھوٹا شہر تھا۔ لیکن تعمیری منصوبہ بندیاں تیز تر رہیں اور شہر چاروں طرف پھیلتا چلاگیا۔ ہر طرف بلند و بالا عمارتیں تعمیر ہورہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے روس اور چین سے بات اخذ کی اور غور و فکر کے بغیر پاکستان میں اس پر عمل شروع کردیا۔ میری رائے یہ ہے کہ بالخصوص کراچی میں ان بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر نے دو بالکل بدیہی مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ ایک یہ کہ

تمام سرمایه ان عمارات میں جاکر لگ گیا ہے اور صنعتوں کے فروغ میں کوتاہی ہورہی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں سرمائے کا یہ انجماد اور ''کالی رقم'' کا اس طرح ''سفید'' ہوجانا اچھی بات نہیں ہے۔ تمام صنعت کار عمارات سازی کی صنعت میں رقم لگا بیٹھے ہیں اور مسلسل لگا رہے ہیں جس کا حاصل فوراً کچھ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ حکومت سابق کے ذہن میں یہ بات ہوکہ وہ بالآخر تمام عمارات کو قومی ملکیت میں لے لیگی۔ اگر ایسا تھا تو یہ فکر کی ناہمواری کے ہم معنی کہا جاسکتا ہے۔ عمارتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا مرحلہ جس وقت آئیگا اس وقت تو صنعت پاکستان مفلوج ہوکر رہ جائیگی۔ کیونکہ ان مکانات میں دیہات کے رہنے والے آکر آباد ہوتے جارہے ہیں۔ اس طرح ہماری زراعت کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ ایک دوسرا واضح نقصان یہ ہے کہ گزشتہ پانچ سال میں مزدور کا سارا طبقہ عمارتوں کی تعمیر میں لگ گیا ہے اور صنعت و حرفت کو بڑی دشواری درپیش ہے، جبکہ کار آمد ذہن پاکستان سے باہر جارہے ہیں اور بلا روک ٹوک یہ سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ صنعت و حرفت کو ایسے لوگ میسر آرہے ہیں جو نہ تو تجربہ کار ہیں اور نہ ناقص اور غیر اسلامی لیبر قوانین کی وجہ سے وہ پروڈکشن بڑھانا اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

روس کا یہ تجربہ سرکاری ہے۔ یہ عمارات سرکاری ہیں اور ان میں آبادی منظم طور پر ہورہی ہے۔ یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ اجازت و منشاء اور منصوبہ بندی کے بغیر آبادیاں دیہات سے شہروں میں منتقل ہوجائیں۔ یہاں روس میں تو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے پر بھی پابندی ہے اور ہوٹلوں میں ٹھیرنے کے لئے سرکاری

اجازت نامہ درکار ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز اور ریل کے ٹکٹ بھی اجازت لے کر ہی خریدے جاسکتے ہیں۔

دسواں پنجسالہ منصوبہ

سوویت یونین کے دسویں پنجسالہ منصوبے پر مجموعی طور پر ایک کھرب بیس ارب روبل خرچ ہونگے۔ اس رقم کا دو تہائی حصہ ان منصوبوں پر صرف ہوگا جو پچھلے سال شروع ہوئے ہیں۔ اس کے مطابق تعمیراتی کاموں کی رفتار بہت بڑھ رہی ہے۔ شہروں کے لئے جو ماسٹر پلان تیار کئے گئے ہیں۔ ان کے بموجب ہر روز سارے ملک میں تین سو فلیٹ مکمل ہوکر رہنے کے قابل بن جاتے ہیں۔ ایک کام ۱۹۸۰ء تک چلتا رہیگا۔ ہر کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ایک ایک اینٹ چن کر دیواریں اٹھائی جائیں اور تسلوں میں گارا بھر کر چھت پاٹی جائے۔ اب تو نئی بستیوں یا رہائشی علاقوں میں تعمیراتی منصوبے ایک فیکٹری کا سا منظر پیش کرتے ہیں۔ مکان تعمیر کرنے والے کارخانے مطلوبہ پیمائش کے مطابق بنی بنائی دیواریں اور مکانوں کے پورے پورے حصے فراہم کرتے ہیں۔ بھاری کرینوں ہی کے ذریعے سے صیحیح جگہ ان کو نصب کردیا جاتا ہے چنانچہ عمارتوں کے حصے تعمیر کرنے والی فیکٹریاں زیادہ تر ان علاقوں میں واقع ہیں جہاں بڑے پیمانے پر صنعتی اور زرعی ترقی کا کام جاری ہے۔ مثلاً سائبریا اور روسی وفاق کے غیر سیاہ مٹی والے علاقے میں گیارہ کروڑ بیس لاکھ مربع میٹر رہائشی جگہ کے لئے مقرر کئے گئے ہیں جبکہ ۱۹۷۵ء میں دس کروڑ تیرہ لاکھ مربع میٹر میں رہائشی تعمیرات ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سال مزید ایک کروڑ

افراد نئے اور زیادہ آرام دہ فلیٹوں میں منتقل ہوجائیں گے۔ اب زیادہ سے زیادہ مکان معیاری ڈیزائنوں کے مطابق بن رہے ہیں جن میں آسائش اور آرائش کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پرانے قسم کے مکانوں کی بہ نسبت ان پر زیادہ لاگت آتی ہے لیکن سوویت یونین میں شہریوں پر اس کا مطلق بار نہیں پڑتا، اس لئے کہ پچھلے بیس تیس سال میں ملک بھر میں مکانات کے کرایوں میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

اس وقت یونین میں مکان کا اوسط کرایہ جس میں بجلی، پانی، گیس، سردیوں میں مکان گرم رکھنے اور غلیظ پانی کی نکاسی کا اہتمام شامل ہے، کنبے کے بجٹ کے پانچ یا چھ فی صد سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۸ء میں یکساں قسم کے مکانوں کے جو کرائے مقرر کئے گئے تھے ان میں اضافہ نہیں ہوا ہے جبکہ اجرتیں اور آمدنیاں اس وقت کے مقابلے میں پانچ گنی ہو چکی ہیں اور دوسری طرف مکانات تمام جدید ترین سہولتوں سے آراستہ ہونے لگے ہیں۔ اس ضمن میں حکومت کو جو نقصان ہوتا ہے اسے برداشت کر لیا جاتا ہے۔

سوویت یونین کے جملہ مکانات تین حصوں میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ ان میں ایک قسم نجی ملکیت کے مکانوں کی ہے جو عام طور پر چھوٹے قصبوں یا قصباتی بستیوں اور دیہات میں واقع ہیں۔ ان میں کسان، استاد، ڈاکٹر اور زرعی معیشت سے متعلق لوگ رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو کوئی کرایہ دینا نہیں پڑتا۔ البتہ مکانوں کی مرمت اور سفیدی وغیرہ خود کرانی پڑتی ہے۔ شہروں میں رہنے والوں کی اکثریت جن مکانوں میں رہتی ہے، وہ

ریاستی اقتدار کے اداروں یا کارخانوں کی ملکیت ہوتے ہیں ۔ تاہم تعمیر ہونے والے ہر ایک سو میں سے اسی حکومت نے بنوائے ہیں اور لوگوں کو مفت دیدئیے ہیں ۔ تیسری قسم سرکاری فلیٹوں کی ہے جو زندگی بھر کے لئے کرائے پر دیئے جاتے ہیں ۔ یعنی کوئی شخص یا تو اپنی مرضی سے فلیٹ خالی کرتا ہے یا اتفاقی صورتوں میں عدالتی حکم کے تحت اسے خالی کرنا پڑتا ہے ۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب اس کے اطوار عام نظم و نسق کے مانے ہوئے اصولوں کے بر عکس ہو جائیں۔

پچھلے دس سال کے دوران میں سوویت یونین میں ایک کروڑ دس لاکھ سے زیادہ افراد نئے سرکاری فلیٹوں میں منتقل ہوئے ہیں ۔ دنیا کے کسی اور ملک میں جدیدترین سہولتوں کے ساتھ مکانات کا تناسب اتنا بڑا نہیں ملتا ۔ یہاں نوے فی صد مکانات نل ، مکانات گرم رکھنے کے آلات ، گندے پانی کی نکاسی کے انتظام ، بجلی اور جدید وضع کے غسل خانوں سے مزین ہیں ۔

گھروں میں گیس اور بجلی پہنچانے کا کام مکانات کی تعمیر سے دوگنی رفتار سے کیا جاتا ہے ۔ ہر سال کوئی پچاس لاکھ مکانوں میں گیس پہنچ جاتی ہے ۔ بجلی سے کوئی مکان محروم نہیں رہتا ۔ سوویت یونین میں ایک اوسط کنبہ تین یا چار افراد پر مشتمل ہوتا ہے ۔ کیونکہ لڑکی کی شادی ہوتے ہی وہ اپنا گھر بار الگ کر لیتی ہے ۔ ہر گھر میں ایک ٹائلٹ اور ایک غسلخانہ ہوتا ہے ۔ چار افراد کا ایک خاندان، جو عموماً میاں بیوی اور دو بچوں پر مشتمل ہوتا ہے ، تین کمروں کے فلیٹ کا کرایہ پندرہ روبل بیس کوپک ادا کرتا ہے ۔ اس میں سات روبل، آٹھ کوپک اصل

کرایه ، دو روبل تیراسی کوپک پانی کی اجرت، دو روبل سیورج کا خرچ ، ایک روبل سوله کوپک بجلی کا خرچ اور پچاس کوپک پلگ لگا کر ریڈیو پروگرام سننے کا معاوضه شامل هے ۔ دو روبل اڑتالیس کوپک گرم پانی کے اور ایک روبل پندره کوپک ٹیلے وژن کے مشترک اینٹینا کے هوتے هیں ۔ مزید دو روبل ادا کئے جائیں تو پورا مکان گرم رکھا جا سکتا هے ۔ اس میں قدرتی برف هٹانے کا معاوضه شامل هوتا هے ۔

پچھلے سال سوویت یونین میں ایک فرد کی اوسط آمدنی ڈیڑھ سو روبل تھی ۔ اگر کسی کنبے کے دو افراد کمانے والے هوں اور ان کی آمدنی تین سو روبل ماهوار هو تو اس رقم کا صرف چھے فی صد مکان کا کرایه لیا جاتا هے ۔ تنخواہ کا حساب مدنظر نه رکھا جائے تو کرائے کی زیادہ سے زیادہ شرح ۱۳،۲ کوپک فی مربع میٹر ماهانه هوتی هے ۔ پیمائش صرف کمروں کی هوتی هے ۔ باورچی خانه ، غسل خانه وغیرہ محسوب نهیں کئے جاتے ۔ اس کا مطلب یه هوا که یہاں هر خاندان اپنی آمدنی سے قطع نظر ، آرام دہ فلیٹ میں آسانی سے رہ سکتا هے ۔ یوں سمجھیے که مکان کی مرمت پر جو خرچ هوتا هے ، اس کا صرف ایک تہائی بطور کرایه لیا جاتا هے ۔ باقی حکومت ادا کرتی هے ۔ گویا اس مدت میں اسے هر سال پانچ ارب روبل خرچ کرنے پڑتے هیں ۔ صاف مطلب یه هے که حکومت لوگوں کو فلیٹ کاروباری طور پر نهیں بلکه ایک سماجی خدمت کے طور پر فراهم کرتی هے ۔

حکومت کے علاوہ امداد باهمی کی انجمنیں بھی فلیٹ بناتی هیں ۔ وہ ان لوگوں کے لئے هوتے هیں جو عام معیاری فلیٹوں سے

زیادہ بڑے مکانوں میں رہنا چاہتے ہیں - جتنے نئے فلیٹ تعمیر ہوتے ہیں، ان میں سے سات فی صد امداد باہمی کی انجمنوں کے ہوتے ہیں - ان کے لئے حکومت قرضہ دیتی ہے - ان کا نقشہ اور ڈیزائن بھی سرکاری طور پر تیار کیا جاتا ہے - انجمنوں کو زمین بھی مفت ملتی ہے - یہاں ساری زمین حکومت کی ملکیت سمجھی جاتی ہے - اس لئے افراد ان کی خرید و فروخت آپس میں نہیں کر سکتے- ایسے مکان لینے کے لئے ہر شخص کو تیس سے چالیس فی صد رقم تعمیراتی اخراجات کے طور پر ادا کرنی پڑتی ہے - باقی رقم حکومت کے قرضے سے فراہم کی جاتی ہے - یہ قرضہ بیس سال میں قسطوں کی شکل میں واپس کیا جاتا ہے - اس پر سود کی شرح صرف ایک فی صد ہوتی ہے - رقم ادا ہو جانے کے بعد مکان اس کی ملکیت سمجھا جاتا ہے ، پھر بھی وہ اسے فروخت نہیں کر سکتا بلکہ اس کی اولاد اسے استعمال کرتی ہے - بعض علاقوں میں جہاں عام طور سے لوگ رہنا پسند نہیں کرتے ، حکومت تعمیر کے اخراجات کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ خود ادا کر دیتی ہے - ایسے انتیس علاقے خود مختار جمہوریتوں میں پھیلے ہوئے ہیں -

نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ

تمام مندوبین کی موٹر کاریں صاف ستھری اور ہموار سڑک پر تیزی سے دوڑتی چلی جارہی تھیں کہ پروگرام کے مطابق انہیں ایک جگہ روک لیا گیا - وہاں نیشنل کینسر انسٹی ٹیوٹ کی عمارت زیر تعمیر تھی - سب اراکین کے لئے وہ دلچسپی کی چیز نہیں تھی لیکن میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا - میں نے اپنے وطن میں سرطان کے خلاف جو مہم چلا رکھی ہے اس اعتبار سے اسے دیکھکر اطمینان

ہوا کہ یہاں کی حکومت بھی سرطان کو ایک موذی مرض سمجھ کر اس کے تدارک کے لئے کوشاں ہے ۔ واقعی بہت عظیم الشان عمارت تعمیر ہورہی تھی جو اپنی آخری منزل میں تھی ۔ بتایا گیا کہ سرطان کی تحقیق کے لئے یہ دنیا کی سب سے بڑی تجربہ گاہ ہوگی ۔ کل اخراجات کا تخمینہ کم و بیش دس کروڑ روبل لگایا گیا ہے ۔

ہوائی میدان پر خصوصی انتظامات کئے گئے تھے ۔ ہمیں کوئی زحمت نہ ہوئی ۔ بس ہوائی جہاز میں جا کر بیٹھ گئے ۔ سامان بھی رکھ دیا گیا ۔ گزشتہ بار جب میں یہاں آیا تھا تو دو پنکھوں والے جہاز میں سفر کرایا گیا تھا ۔ اب بھی وہی دو پنکھوں والا جہاز میدان میں لایا گیا تھا ۔ ماسکو سے دوشنبہ تک سفر پانچ گھنٹے کا ہے ۔ اندازہ ہوا کہ اس راستے پر بوئنگ نہ چلانے کی کوئی خاص فنی وجہ ہوگی ۔ آگے پیچھے دو جہاز چلائے گئے ۔ ان دو کے بجائے ایک بڑا جہاز بھی آ سکتا تھا ۔ دو پنکھوں والا جہاز اس دور میں اتنے طویل سفر کے لئے آرام دہ ثابت نہیں ہوتا ۔ اس لئے ہوائی کمپنیوں کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے ۔ چھوٹے جہاز کی آواز بھی اب قابل برداشت نہیں رہی ۔ تا ہم میں چھوٹے بڑے جہازوں میں بیٹھنے کا اس درجہ عادی ہوگیا ہوں کہ میں نے یہ سفر پورے اطمینان سے طے کیا اور بہت سا تحریری کام چار گھنٹے میں مکمل ہوگیا ۔

ماسکو اور دوشنبہ کے درمیان وقت کا فرق تین گھنٹے ہے ۔ ماسکو وقت کے مطابق جہاز پونے سات بجے آیا ۔ دوشنبہ میں وقت پونے دس بجے تھا ۔ دوشنبہ اور پاکستان میں صرف ایک گھنٹے کا فرق ہے ۔ پاکستان میں جب بارہ بجتے ہیں تو دوشنبہ میں ایک بجتا

ہے ۔ دونوں کے عرض بلد میں تھوڑا ھی سا فرق ہے۔

غرض یہ کہ پانچ گھنٹے کی پرواز کے بعد دو انجنوں والا ہوائی جہاز ہوائی میدان پر بڑے آرام سے اترا ۔ ھم نے جھانک کر دیکھا کہ عمارت میں لوگوں کا بڑا اجتماع ہے اور نہایت تیز طاقت کی متعدد بتیاں لگی ہوئی ھیں ۔ اور ہوائی میدان بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ ہوائی جہاز کا دروازہ کھلا تو بین باجے کی آوازیں آئیں جس کا انتظام زینے کے قریب ھی کیا گیا تھا ۔ بینڈ بجانے والے اپنے مخصوص لباس میں سج رہے تھے ۔ مجھے اندازہ ھوگیا کہ یہ ھمارے استقبال کی روایتی شان ہے کہ جو تاجیکستان سے مخصوص ہے ۔

ہوائی جہاز سے باھر نکلا تو ٹیلے وژن کے کیمرہ مین چاروں طرف موجود تھے ۔ وہ اس استقبال کی منظر کشی ھر پہلو سے کرنے میں مصروف تھے ۔ چاروں طرف سفید کپڑوں اور سرخ ٹائیوں میں خوبصورت اور صحت مند بچیاں ھاتھوں میں پھول لئے کھڑی تھیں اور خوشی سے اپنے پھولوں جیسے ھاتھ ہلا ہلا کر مندوبین کا استقبال کر رھی تھیں ۔ ان کی تعداد پچاس سے کم نہیں تھی۔

عاصموف سے تجدید ملاقات

میں ابھی جہاز کی سیڑھیوں پر تھا کہ پروفیسر محمدعاصموف نے مجھے دیکھ لیا اور دوڑ کر قریب آگئے ۔ فرط مسرت سے انھوں نے مجھے بھینچ لیا ۔ میں نے بھی ان کو اپنے آغوش میں دبا لیا اور پیار کیا ۔ پروفیسر محمد عاصموف نہایت نفیس انسان ھیں ۔ ان سے شرف ملاقات قدیم ہے ۔ میں درحقیقت ان سے محبت کرتا ھوں ۔ وہ بڑے عالم فاضل انسان ھیں ۔ تاجیک اکیڈمی آف سائنسز کے صدر ھیں ۔ زندہ دل اور فرشتہ صفت ۔ انھوں نے میرے ھاتھ کا بیگ

ے کر میرا بوجھ ھلکا کر دیا ۔ مگر میں نے ان کی اس زحمت کو گوارا نہ کیا اور بیگ واپس ے لینا چاھا ۔ اس کشمکش میں انھی کے اشارے پر ان کے دوسرے ساتھی نے بیگ ے لیا تا کہ وہ ان کے پاس رھے نہ میرے پاس ۔ میں ان ساتھی کو بھی جانتا تھا ۔ ۱۹۷۰ء میں جب میں روس آیا تو وہ میرے مترجم اور مشیر رھے تھے ۔

پروفیسر عاصموف صاحب کی کرم فرمائیاں بڑی دیرینہ ھیں ۔ مجھ پر ھمیشہ ان کی نظر عنایت رھی ھے ۔ ۱۹۷۰ء میں جب میں امیر خسرو رح دھلوی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ماسکو آیا تو ایک جلسۂ عام دوشنبہ میں شام کے چار بجے ھونے والا تھا ۔ میں اور سارے وفود وقت مقررہ پر جلسہ گاہ میں پہنچ گئے ۔ وھاں تاجیکستان کے وزیر اعظم صاحب اور وزیر تعلیم موجود تھے ۔ ان سے ملاقاتوں کا شرف حاصل ھوا ۔ وہ دونوں خندہ پیشانی سے ملے ۔ اس کے بعد ھم اندر اسٹیج تک گئے ۔ وفود کو اسٹیج پر بٹھایا گیا تھا ۔ وزیر اعظم صاحب کے جانے کے بعد وزیر تعلیم نے جلسے کی تمام کاروائی سر انجام دی ۔ ان کے دائیں جانب ھندستانی مندوب بیٹھے تھے ۔ میں نے پروفیسر عاصموف صاحب کا اشارہ نہیں سمجھا ۔ وہ مجھے صدر کے دائیں جانب بٹھانا چاھتے تھے ۔ اس موقع پر میں نے جمیل الدین عالی صاحب کی بے چینی کو پوری طرح محسوس کیا اور عاصموف صاحب سے درخواست کی کہ پاکستان کی جانب سے میرے بجائے عالی صاحب کو خطاب کا موقع دیا جائے ۔ میرے اس فیصلے سے عاصموف صاحب کو اتفاق رائے نہیں تھا ۔ مگر انھوں نے میری درخواست کو بادل ناخواستہ قبول کر لیا ۔ میں نہیں چاھتا تھا کہ عالی صاحب کو ذرا بھی کمتری کا کوئی احساس میری وجہ سے ھو ۔

میں عالی صاحب کی دل سے قدر کرتا ہوں - وزیر تعلیم صاحب نے حاضرین سے میرا تعارف اہمیت کے ساتھ کرایا اور پھر خود عالی صاحب نے اپنے خطاب میں میرے بارے میں اہمیت کے ساتھ کلمات خیر فرمائے - اسی طرح پروگرام ختم ہونے کے بعد ہم سرکاری مہمان خانے کے ضیافت ہال میں پہنچے تھے تو جناب محمد عاصموف صاحب نے مجھے اپنے بائیں طرف بٹھایا - ان کے دائیں جانب ہندستان کے شکلا صاحب تھے - سامنے وزیر تعلیم تھے اور ان کے دائیں بائیں عراق و ایران کے نمائندوں کو جگہ دی گئی تھی - یہ عزت افزائی عاصموف صاحب کی وجہ سے تھی جو مجھ پر بے حد مہربان تھے - وہ موجودہ دورے میں بھی مہربان رہے -

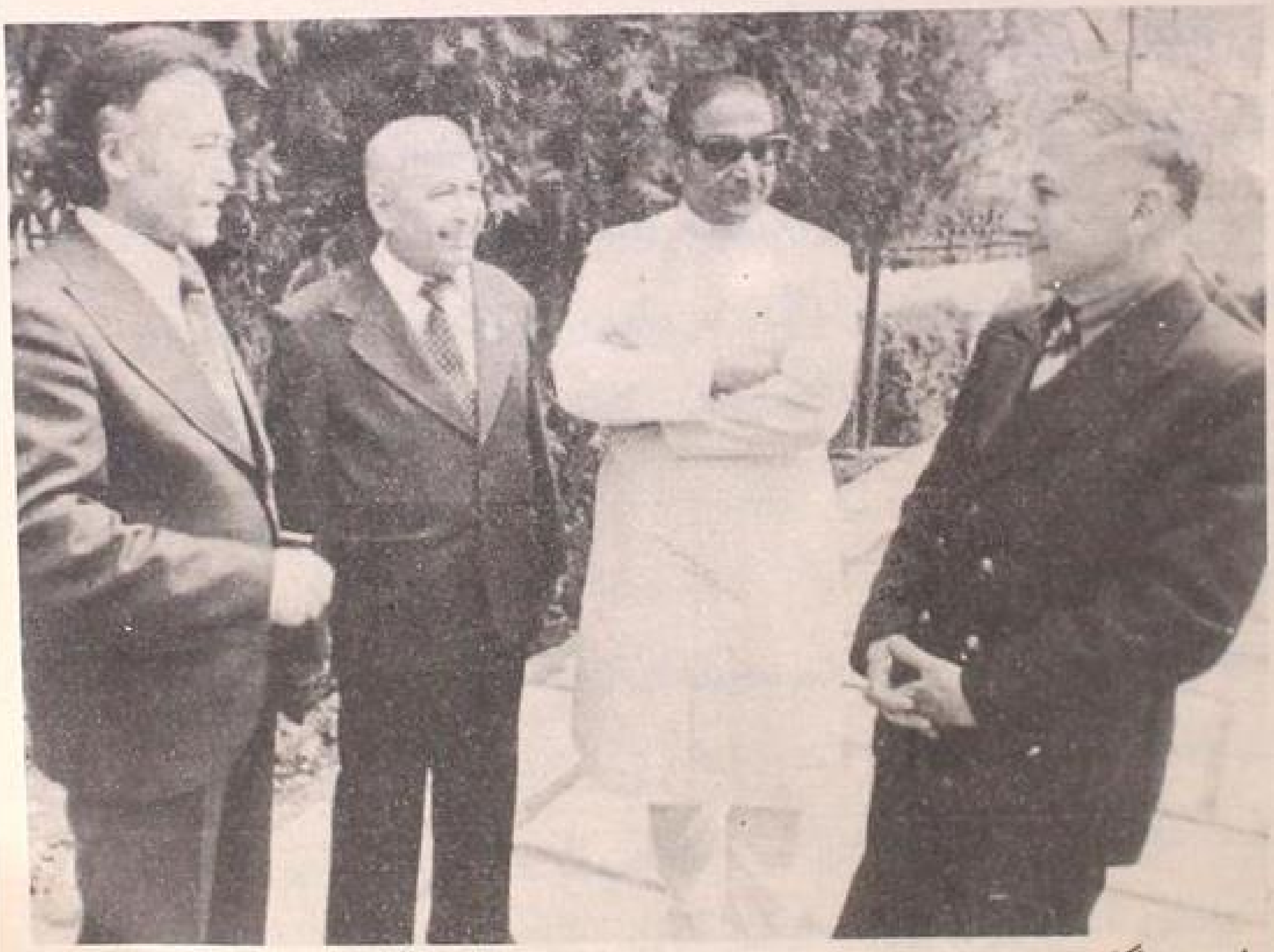
اب پروفیسر عاصموف صاحب نے عمارت کی جانب راہنمائی کی - بچیوں نے جو منتظر تھیں، تمام مندوبین کو گل دستے پیش کئے - ساز بج رہا تھا اور سچ پوچھئے تو ایک شادی کا سا منظر تھا - ہر ہاتھ پر پھولوں کے ہار لپٹے ہوئے تھے اور پھول سے بچوں کی مسکراہٹوں نے ساز کو سوز و گذار بخشا تھا اور انھیں حسن و رعنائی عطا کی تھی -

ڈاکٹر غفاروف سے شرف ملاقات

ماسکو میں مس مارگریٹا پاؤلونا میری مترجم تھیں اور اب میں استاد محترم جناب ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف کی رہنمائی میں ہوں - استاد غفاروف صاحب اکیڈمی آف سائنسز میں انسٹی ٹیوٹ اورینٹل میں صدر شعبۂ ہند و پاکستان ہیں - یہ میرے لئے وجہ شرف و اعزاز ہے کہ مجھے ان استاد عالی مقام کا قرب حاصل ہو گیا اور دوشنبہ میں جب تک رہنا ہوگا، وہ میرے ساتھ ہی رہینگے -



حکیم محمد سعید اور پروفیسر عبداللہ جان غفاروف ، خلوص و انس کے عالم میں ۔



نمائش گاہ عینی ، دوشنبہ ، تاجیکستان ۔ کمال عینی ، فرزند صدرالدین عینی ، حکیم محمد سعید ، پروفیسر عبداللہ غفاروف اور ایک پروفیسر ۔

میرے لئے ایک کار کا انتظام تھا - میں تو جناب فیض صاحب کے ساتھ بیٹھ رہا تھا مگر بتایا گیا کہ میرے اور ان کے لئے علحدہ علحدہ کاریں ہیں-

استاد بزرگ کی رہنمائی میں مہمان خانے تک پہنچا - یہ وہی مہمان خانہ تھا کہ جہاں ۱۹۷۵ء میں بھی مجھے ٹھیرایا گیا تھا - بڑی شاندار عمارت ہے - ایک وسیع و عریض باغ ملحق ہے اور اس باغ میں یہ مہمان خانہ تعمیر کیا گیا ہے - الگ الگ کئی حصے ہیں - مجھے مین بلڈنگ میں جگہ دی گئی - فیض صاحب بھی اسی میں ٹھیرائے گئے اور ہندستانی وفد بھی، جس میں سردار جعفری، ان کی بیگم صاحبہ اور محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ شامل تھیں -

سردار جعفری صاحب کو انگریزی مترجم ملیں جو ماسکو سے ساتھ آئی تھیں - میری ماسکو والی مترجم جناب فیض صاحب کے حوالے کی گئیں - ڈاکٹر منیرہ' جو اکیڈمی آف سائنسز میں اسکالر ہیں اور میرے مرحوم دوست پروفیسر مرزایوف کی شاگرد رشید، محترمہ عصمت چغتائی کی دیکھ بھال پر مامور کی گئیں میری خوش بختی یہ تھی کہ مجھے استاد عبداللہ جان صاحب محترم کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوا-

شاندار مہمان خانے میں

مہمان خانے میں میرا کمرہ ایسا شاندار تھا کہ اس میں سوتے ہوئے تامل ہو رہا تھا - بستر اتنا زرق برق تھا کہ اس پر لیٹتے ہوئے دکھ ہونے لگا کہ اس میں سلوٹیں پڑ جائینگی - ریڈیو گرام بھی رکھا تھا اور ٹیلے وژن بھی - ایک طرف بے شمار تولئے لٹک

رہے تھے ۔ جوتے پر چمک پیدا کرنے کے لئے ہمہ رنگ کے پالش معہ برش موجود تھے ۔ غسل خانے میں صابن اور ٹوتھ پیسٹ تک رکھا ہوا تھا ۔ ٹیلے فون بھی تھا جس کا نمبر ۴-۱۴-۴۴ تھا۔

اس مہمان خانے کے ضمن میں یہ بڑا دلچسپ اور دل خوش کن تجربہ کہا جا سکتا ہے کہ سارے کمروں میں کنڈی تالے کا کوئی تکلف نہیں ہے ۔ رات کو کمرہ بند کرنے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے ۔ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ یہ بات صرف سرکاری مہمان خانے سے تعلق رکھتی ہے ۔ یا سارے شہر میں یہی دستور ہے۔ پتہ چلا کہ یہاں کا نظام سخت ہے اور چوری چکاری کا کوئی خطرہ نہیں ہے ۔ تائید اس بات سے ہوئی کہ ہم یہاں کے سب سے بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں گئے تو وہاں دکانوں تک پر کوئی تالہ نہیں تھا ۔ پردہ ڈال دیا اور بس دکان بند ہوگئی ۔ میں نے سعودی عرب اور یہاں کے حالات کا موازنہ کیا ۔ سعودی عرب کا حال بہر نوع بہتر ہے ۔ مگر تاجیکستان میں یہ اہتمام دیکھ کر بڑا ہی اطمینان ہوا۔

دل چاہا کہ میں اپنی عادت اور اوقات کے مطابق زمین پر سو رہوں مگر خیال آیا کہ کہیں یہ نامناسب نہ ہو ۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ استاد عبداللہ جان نے بلایا کہ کھانا حاضر ہے ۔ میں چاہتا تھا کہ فیض صاحب کے ساتھ چلوں مگر پتہ چلا کہ وہ اور سردار جعفری صاحب ایک گھنٹے بعد کھانا تناول فرمائیں گے ۔ میں ان دونوں کے ذوق و شوق سے واقف ہوں ۔ میں نے تاخیر سے کھانا کھانے کی وجہ سمجھ لی اور تنہا چلا گیا ۔ وہاں دوسرے مندوبین بیٹھ چکے تھے ۔ میں نے دہی کے دو گلاس اور دو سیب اور ذرا سی نان نوش جان کی ۔ کبابوں کا انتظار کیا مگر میری باری

نہ آئی - بہر نوع میں نے جتنا کھایا تھا وہ میرے لئے کافی تھا -

میں کمرے میں واپس آگیا اور یہاں آ کر گھڑی دیکھی تو تقریباً بارہ بجے تھے - میں نے کپڑے تبدیل کئے، وضو کیا اور نماز عشاء ادا کر کے سجدہ شکر ادا کیا۔

دوشنبہ

دوشنبہ جو جمہوریہ تاجیکستان کا صدر مقام ہے، فروغ صنعت و حرفت کے اعتبار سے بہت مشہور ہے - یہاں سوتی اور اونی کپڑے کے کئی کارخانے ہیں - ایک سلک ملز ہے - جوتے بنانے کی فیکٹری ہے، جہاں فوجی جوتے بھی تیار ہوتے ہیں- سیمنٹ بنانے کا کارخانہ ہے جو روزانہ کئی ہزار ٹن سیمنٹ تیار کرتا ہے - بناسپتی تیل بنانے کا کارخانہ بھی قائم ہے - ظاہر ہے کہ یہ سب صنعتیں اسی شہر کے لئے مخصوص نہیں ہیں بلکہ یہاں کی مصنوعات دوسرے شہروں، علاقوں بلکہ غیر ملکوں کو بھی بھیجی جاتی ہیں- دریائے درزوب کے کنارے پن بجلی بنانے کا ایک بڑا پلانٹ لگا ہوا ہے جو شہر کو روشن رکھتا اور جملہ مشینوں کو حرکت میں لاتا ہے - قدرتی گیس بھی دریافت ہو چکی ہے - اس کی پائپ لائنیں سارے شہر میں پھیلی ہوئی ہیں - ایک جانب پہاڑی علاقہ ہے جس کی ڈھلانوں پر مکانات بنے ہوئے ہیں - وہاں بھی خوب روشنی ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاروں بھرے آسمان کا ایک حصہ جھک کر زمین سے ہم آغوش ہو رہا ہے۔

تاجیکی مسلمان

تاجیکی باشندوں کی اکثریت خوش مزاج ہے - ان میں مسلمانوں کی صحیح خصوصیات واقعی موجود ہیں جبکہ ہم پاکستانیوں

نے واقعی ان خصوصیات سے محرومی کا اعلان کر رکھا ہے ۔ مساجد ہیں، لوگ روزے بھی رکھتے ہیں، مگر نمازیوں اور روزہ داروں کی تعداد کم سے کم تر ہو رہی ہے ۔ نوجوانوں میں اسلام کو زیادہ درجۂ قبول حاصل نہیں ہے ۔ یہ بات صحیح ہے کہ اگر باپ مسلمان ہے تو بیٹا دھریا بن رہا ہے ۔ مسلمانوں کی پانچوں ریاستیں روس کے زیر نگیں ہیں اور انتظام یہ ہے کہ ایک ریاست کا مسلمان دوسری ریاست میں اجازت نامے کے بغیر نہیں جا سکتا ۔ اجازت حاصل کرنی عملاً مشکل ہے ۔ اس لئے پانچوں ریاستوں کے مسلمان نہ تو متحد ہو سکتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کے بارے میں ان کو علم ہے ۔ لہذا ان کی کوئی مشترک منزل نہیں ہے ۔ آبادی بڑی تیزی کے ساتھ روس کے اثرات قبول کررہی ہے ۔ روسیوں کو لا لا کر ان علاقوں میں تنظیم کے ساتھ آباد کیا جا رہا ہے اور اس طرح اسلامی اثرات غیر محسوس طور پر ختم ہو رہے ہیں ۔ چین روس پر یہی تو الزام لگاتا ہے کہ اس نے مسلمان ریاستوں کو کالونی بنا دیا ہے ۔ مگر خود چین میں بھی مسلمانوں کے ساتھ یہی ہوا ہے ۔

به ایں همه روس اپنی عظیم مسلم اقلیت سے صرف نظر نہیں کرتا ہے ۔ وہ ان کے جذبات کا احترام کرتا ہے اور علمی میدان میں اسلامیت کے کارناموں کا قدردان ہے ۔ سنٹرل ایشیا کے مسلم صاحبان حکمت کے علمی کاموں کو زیادہ سے زیادہ روسی زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے اور مسلم اکابر کے علمی جشن منانے میں وہاں کوئی کوتاہی نہیں ہو رہی ہے اور آثار اسلاف کے تحفظات کا سامان بھی ہورہا ہے ۔ اس کے شانہ به شانہ روس کی لا مذہب پالیسی بھی جاری و ساری ہے جسے وہ مسلم

اقلیت پر تھوپ دینے کی پالیسی سے گریزاں ہے ۔ تا ہم نظام تعلیم میں یکسر تبدیلی بالآخر قدیم نظریۂ اسلام کو مغلوب کر رہی ہے۔ فارسی زبان روسی رسم الخط میں اب لکھی جا رہی ہے اور اس میں تدریج کے ساتھ روسی الفاظ داخل ہو رہے ہیں جس کے نتیجے میں میری رائے یہ ہے کہ اگلے ۲۰، ۲۵ سال میں ہر مسلم ریاست سے اس کی مادری زبان ختم ہوکر صرف روسی زبان باقی رہ جائے گی۔

مختلف انداز فکر

۱۹۷۵ء میں جشن امیر خسرو دھلوی کے موقع پر بابا جان غفوروف صاحب نے اپنی تقریر میں تین بار اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا لفظ استعمال کیا تھا ۔ جبکہ ہمارے جمیل الدین عالی صاحب پاکستان کو ایک سوشلسٹ مملکت ثابت کرنے کے در پے تھے اور خود میزبان ہم کو اسلامی کہ رہے تھے ۔ اس مزاج کو سمجھنے کے لئے فکر و عقل کی ضرورت ہوا کرتی ہے ۔ میں نے اپنے اس سفر میں ایک بار بھی شکست کا اعتراف نہیں کیا تھا ۔ اس کے برعکس میں نے اپنے عمل سے (یعنی روزہ و نماز کی پابندی سے) پاکستانیوں کو خالص مسلمان ثابت کرنے کی سعی کی تھی ۔ میں نے روزہ اور نماز کی واضح پابندی اور اظہار کا اہتمام کیا تھا تا کہ روسی حضرات کو یہ احساس ہو کہ پاکستان میں معتبر و معروف لوگ مذہب اسلام کی حمایت برملا کرتے ہیں اور یہ کہ اسلام کے اصولوں پر عمل بھی کرتے ہیں۔

بابا جان غفوروف صاحب مجھ سے اس درجہ متاثر تھے کہ اجلاس کے اختتامی لمحات میں مجھ سے فرمایا کہ آخر میں آپ کو تقریر کرنی ہے ۔ میں نے کہا کہ سفیر پاکستان کی تقریر کے بعد

میری کیا ضرورت ہے مگر ان کا اصرار تھا کہ تقریر ہوگی - انہوں نے اپنے خطاب میں کئی بار میرا ذکر کیا اور میری علمی خدمات کو سراہا تھا -

١٩٧٥ء کے شروع میں بابا جان غفوروف صاحب پاکستان آئے تھے - انہوں نے مجھ سے اس بار رابطۂ خصوصی قائم کیا - گو ١٩٧٣ء میں جب یونیسکو میں میں نے ان کے ساتھ خصوصی دعوت پر سنٹرل ایشیا اسٹڈی ڈویژن میں تین دن کام کیا تھا تو اس وقت بھی انہوں نے بڑی خصوصیت برتی تھی - پھر پاکستان میں ان کے خصوصیت برتنے کا تو یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم بھٹو صاحب اور اس وقت کے وزیر تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب سے میرے بارے میں بات کر کے امیر خسرو نیشنل کمیٹی از سرنو تشکیل دلوائی اور اس میں میرا نام شریک کیا - پھر انہوں نے تاریخ کانفرنس (منعقدہ اسلام آباد) میں خطاب کرتے ہوئے پانچ بار میرا ذکر کیا اور پاکستانی سامعین نے حیرانی کے ساتھ شام کو جب میں کراچی سے اسلام آباد پہنچا، تو اس صورت حال کا ذکر کیا - اس کے بعد پورے دورے میں انہوں نے مجھے اہمیت دی - میں نے بھی ان کے لئے ایسا ہی برتاؤ کیا تھا اور ان کی مدارات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی -

مجھے یقین ہے کہ ان کو پورا اندازہ ہے کہ میں پاکستان کے عوام میں بہت مقبول ہوں - وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں علمی کاموں میں پیش پیش ہوں اور رائے عامہ پر اثر انداز ہوں - خود بابا جان صاحب کو مجھ سے تعلق خاطر بھی ہے - وہ خود ایک اچھے مسلمان ہیں اور شرین النفس ہیں - روس میں ان

کا علمی مقام بلند ہے۔ نیز وہ ایک وزیر کے عہدے کے برابر حکومت میں اثر انداز ہیں ۔ علمی دنیا میں باہر جا کر روس کی نمائندگی ان کی ذمہ داری ہے ۔ یونیسکو میں بھی وہ قوی اثرات رکھتے ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں وہ مصر تھے کہ کنگرس آف اورینٹالسٹس کا جلسہ ۱۹۷٦ء میں ماسکو میں ہونا چاہئے ۔ وہ اس کے حق میں تقریر کرنے اسٹیج پر چڑھ گئے ۔ منتظمین نے لاؤڈ اسپیکر کا تار کاٹ دیا مگر ان کے حامی بکثرت وہاں موجود تھے اور ہاؤس کو ان کا خطاب بالآخر سننا ہی پڑا ۔ اس طرح روس کا موقف منوا لیا گیا۔

باز گشت

ذکر اس بات کا تھا کہ تاجیکی باشندے کس مزاج کے ہیں لیکن سلسلہ٬ خیال کہاں سے کہاں لے گیا اور میں خواہ مخواہ سیاسی الجھنوں میں پڑگیا

جمہوریہ بننے اور سوویت یونین میں ایک ریاست کی حیثیت سے شامل ہونے سے پہلے تاجیکستان زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا اور خاص طور سے دو شنبہ ایک معمولی گاؤں تھا ۔ اب تاجیک جمہوریہ کی آبادی بتیس لاکھ ہے۔ رقبہ ایک لاکھ تینتالیس ہزار ایک سو مربع کلومیٹر ہے ۔ دو شنبہ کی زیادہ آبادی کاریگروں اور مزدوروں پر مشتمل ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہاں اعلا تعلیمیافتہ لوگوں کی کمی ہے ۔ تاجیکستان اکیڈمی آف سائنسز کا صدر دفتر اسی شہر میں ہے جہاں سائنسی تجربات کے علاوہ ادبی تخلیقات کا کام بھی ہر وقت ہوتا رہتا ہے ۔ مختلف موضوعات کی کتابوں کا خاص انتظام ہے ۔ غیر ملکی اور روسی مضنفین کے شاہکاروں کے ترجمے تاجیکی زبان میں کئے جاتے ہیں ۔ اب تک پشکن، گورکی، شیکسپئر،

بلزاک اور علامه اقبال کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں - ادارے کے اولین سربراہ مشہور شاعر اور لینن انعام یافته ادیب مرزا ترسون زاده تھے - وہ اپنی ادب نوازی کی وجه سے ایشیا بھر میں مقبول تھے - تقسیم برصغیر سے ایک سال قبل وہ ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کے لئے دھلی آئے تھے - اس وقت ان سے سرسری ملاقات ہوئی تھی لیکن اس سرسری ملاقات ھی کا گہرا نقش میرے دل و دماغ پر اب تک موجود ہے۔

دو شنبه روئی کی پیداوار کے لئے مشہور ہے - لاکھوں ایکڑ زمین پر اس کی کاشت ہوتی ہے - پہاڑیاں پسته، بادام، خوبانی اور اخروٹ کے درختوں سے ڈھکی رہتی ہیں - ڈھلانوں پر سبزہ بے قیاس ہے - اس لئے عمده نسل کے گھوڑے پرورش پاتے ہیں - بھیڑ بکریوں کی بھی چرا گاھیں ہیں - مرغ بانی کا کاروبار بڑے پیمانے پر ہوتا ہے - اس ضمن کی کوئی چیز باھر سے منگانی نہیں پڑتی بلکه بھیجی جاتی ہے -

تاجیکستان میں تعلیمی سرگرمیاں

دوشنبه یونیورسٹی میں ماہرین طبقات الارض ، ماہرین طبیعیات و لسانیات، مورخین اور ارباب قانون کی تعلیم و تربیت کا خاص اهتمام ہے۔ یونیورسٹی کے ریکٹر ڈاکٹر سولیخ راجا بوف پہلے تاجیکی باشندے ہیں جو مغربی درسگاھوں سے ڈاکٹر آف هسٹاریکل سائنسز کی سند لے کر آئے تھے - ان کے دو بھائی بھی شعبۂ تعلیم سے وابسته اور اعلا عہدوں پر فائز ہیں - ان کی بہنیں بھی اسی منزل میں گامزن ہیں -

انقلاب سے پہلے تاجیکستان کے ہر دو سو باشندوں میں

سے صرف ایک فرد تعلیم یافتہ تھا ۔ اس وقت امیر بخارا کا اس علاقے پر بھی تسلط تھا ۔ اب جمہوریہ میں ناخواندگی کا نام و نشان تک نہیں ہے ۔ شیرخوارگی کی منزل سے نکلتے ہی ہر بچے کو لازمی طور پر کنڈر گارٹن کی قسم کی سرکاری درسگاہوں میں داخل کردیا جاتا ہے اور فارغ التحصیل ہونے تک اسے دوسری کسی نہ کسی درسگاہ سے وابستہ رہنا پڑتا ہے ۔ تعلیم و تربیت ماں باپ کے نہیں ، حکومت کے فرائض میں شامل ہے ۔ صرف اسی جمہوریہ میں نہیں بلکہ سوویت یونین کی ہر جمہوریہ کا یہی حال ہے ۔

ہوا کی سائیں سائیں نے لوری کا کام دیا ، میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور تاجیکستان کی خوشحالی کا تصور ذہن میں لئے میں اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور نماز فجر کے وقت تک بے خبر سوتا رہا ۔ ہوا کے دوش پر بہت دور سے مجھے اللہ اکبر کی صدا سنائی دی ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قریب کوئی خانۂ خدا نہیں تھا ۔ لہذا میں نے فریضۂ نماز و تسبیح مہمان خانے کے کمرے ہی میں ادا کیا ۔

کانفرنس کے ابتدائی مراحل

پروگرام کے مطابق آج یعنی ١٠ اپریل بروز ہفتہ صدرالدین عینی کے جشن صد سالہ کا آغاز ہونا تھا ۔ منتظمین متحرک تھے ۔ ہر شخص کو یہ فکر بھی تھی کہ کوئی کوتاہی نہ ہو جائے ۔ محترم محمد عاصموف مجلس انتظامیہ کے صدر تھے مگر وہ حسب معمول بہت مطمئن تھے ۔ یہ ان کی عادت ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر کام بہ حسن و خوبی انجام پذیر ہوگا اور یہ حقیقت ہے کہ

ایسا ہوتا ہے - کبھی کسی قسم کی پشیمانی نہیں ہوئی - ان کے حرکات و سکنات متوازن تھے - ہر چند کہ وہ بڑی با اثر شخصیت ہیں اور اپنے علمی مرتبے کی بنا پر معززین میں شمار ہوتے ہیں، تاہم وہ ہر چھوٹے بڑے کا احترام کرتے ہیں - شب گزشتہ کہ جب ماسکو سے چند بڑے اس جشن میں شرکت کے لئے پہنچے تو میں نے ان کو ذرا متغیر دیکھا تھا - وہ ان کے مناسب قیام کے لئے تگ و دو کر رہے تھے - ایسی ہنگامی پریشانیوں کا وہ بہت کم اثر لیتے ہیں -

صبح وہ میرے کمرے میں آئے تو میرے مطبوعہ مقالے کی کاپی ان کے ہاتھ میں تھی - انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا :

''من مقالۂ جناب عالی دزدیدہ ام،،

میں نے سوال کیا :

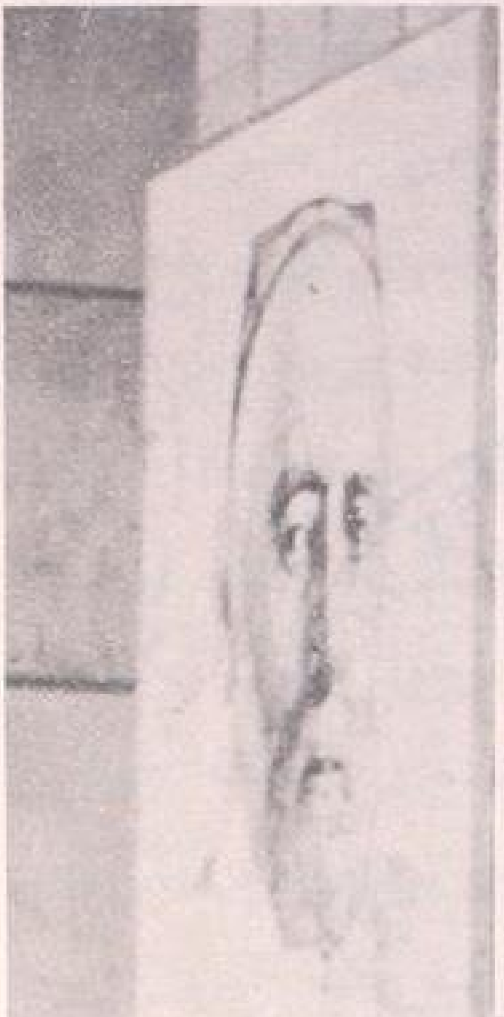
''از کجا جناب عالی ؟،،

جواب ملا : ''خانم مریم سلگانگ بکمال عنایت و لطف و مروت مرا دادہ اند،،

اکیڈیمیشین عاصموف نے مقالۂ مطبوعہ کے بارے میں میرا شکریہ ادا کیا اور رسماً مجھ سے اجازت لے کر روانہ ہوگئے - ظاہر ہے کہ چھپے ہوئے مقالے سے ان کی ایک پریشانی کم ہو گئی - وہ یہ کہ انھیں ٹائپ کرانے کی زحمت نہیں ہوئی - دوسرے مندوبین کے مقالے ٹائپ کرا کے بڑی تعداد میں کاپیاں تیار کرنی پڑیں تاکہ تمام شرکائے اجلاس میں تقسیم کی جا سکیں - اپنے زیر اہتمام کانفرنسوں میں مجھے ایسی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے - اسلئے



کنگرس عالمی صدرالدین عینی۔
یوم افتتاح پر جناب صدر علمائے
عالمی مندوبین اور اہل فضل و
کمال سے مخاطب ہیں۔



پروفیسر محمد عاصموف صدر
تاجیکستان اکیڈمی آف سائنسز،
کنگرس عالمی صدر الدین عینی
سے مخاطب ہیں۔



میں کم سے کم اپنا مقالہ کراچی سے چھپوا کر لے آیا تھا۔

ایسی کانفرنسوں میں ایک اور بڑا مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مندوبین کو ان کے کمروں سے نکال کر موٹروں میں بٹھایا جائے تا کہ اجتماع میں وقت کی پابندی ہو سکے۔ یہ ایک بڑا کٹھن کام ہے۔ جس پر گزر چکی ہو وہی جانتا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ مغربی علماء پابندیٔ وقت کا زیادہ خیال کرتے ہیں۔ مگر ایشیائی اور افریقی علماء مزاجاً خود بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں اور منتظمین سے زیادہ توجہ کے خواہاں ہوتے ہیں۔ کچھ ہی عرصے پہلے پاکستان میں ایک بڑی عالمی کنگرس کا انتظام و انصرام میری خوشگوار ذمہ داری تھی۔ اس میں دنیائے عرب کے دو بڑے میرے مہمان تھے اور ان دونوں میں احساس برتری موجود تھا۔ ایک کا احساس برتری یہ تھا کہ وہ دنیائے علم کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ اور یہ بات صحیح بھی تھی۔ دوسرے کا احساس برتری یہ تھا کہ وہ بلند مرتبہ امام دین تھے۔ ان دونوں کو بیک وقت کمروں سے لا کر موٹروں میں بٹھانا سب سے بڑا مسئلہ تھا اور میں دو دن تک اس جتن میں لگا رہا کہ ان دونوں میں کوئی اختلافی مسئلہ پیدا نہ ہونے پائے اور خیریت سے یہ اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہو جائیں۔

شب گزشتہ میرے کمرے میں میرا بیگ آگیا تھا۔ یہ کنگرس بیگ خاصا وزنی تھا۔ میں نے صبح روانگی کے وقت اس کا جائزہ لیا۔ اس میں کئی کتابیں ”حدیتہً“ موجود تھیں۔ کانسی کا بنا ہوا صدرالدین عینی بیج تھا اور منجملہ دوسری چیزوں کے پروگرام کی ایک مطبوعہ کاپی بھی رکھی تھی۔ پروگرام کا بڑا حصہ روسی زبان میں تھا جسے میں پڑھ نہ سکا۔

قومی زبان کا احترام

پاکستان کے سوا تمام ملکوں کی یہ وضعداری ہے کہ ان کے لوگ اپنی قومی زبان کا احترام کرتے ہیں۔ زیادہ تر اسی میں تقریر کرتے اور لکھتے ہیں۔ ہم پاکستانی اپنی قومی زبان کو نظر انداز کر کے انگریزی زبان میں، جو عہد غلامی کی نشانی ہے اور اب تک ورثہ میں شامل ہے، اظہار خیال کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ تاجیکستانی زبان بھی ذرا سے فرق و امتیاز کے ساتھ فارسی ہے مگر گزشتہ کئی سالوں سے فارسی رسم الخط ترک کیا جارہا ہے اور فارسی زبان روسی رسم الخط میں لکھی جارہی ہے۔ رسم الخط کی یہ تبدیلی بڑے دوررس نتائج کی حامل ہوسکتی ہے۔ اندازہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ آج سے کوئی پچیس سال بعد فارسی کی جگہ روسی زبان لے لیگی کیونکہ موجودہ فارسی میں روسی الفاظ اور محاورے داخل ہورہے ہیں اور خالص کلاسیکی فارسی ختم ہورہی ہے۔ تاجیکستان سے شائع ہونے والے اخبارات میں سے بعض کی زبان فارسی ہے مگر فارسی رسم الخط میں کوئی اخبار شائع نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ ایسی تقریبات میں جیسی کہ یہ تقریب عینی ہے، اس کے پروگرام پر گو فارسی زبان غالب ہے مگر پروگرام تک فارسی رسم الخط میں نہیں ہے۔ تاجیکستان میں اب تعلیم بھی بڑی تیزی سے بدل رہی ہے جو آنے والی نسلوں پر اثر انداز ہوگی۔ ذریعۂ تعلیم اب روسی زبان ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں فارسی جاننے والے ختم ہوجائیں گے اور تاجیکستان کی زبان بھی روسی زبان ہوجائے گی۔ مصطفیٰ کمال نے بھی ترکی میں یہی کیا تھا۔ رسم الخط تبدیل کردیا۔ ترکی کے نئے رسم الخط کے وہی موجد ہیں۔ آج صورت حال یہ ہے

کہ ترکی میں عربی اور فارسی رسم الخط کی کتابیں کوڑیوں کے مول بک رہی ہیں ۔ کباڑیوں کی دکانیں ان سے بھری پڑی ہیں ۔ کوئی خریدنے والا نہیں ہے ۔ موجودہ ترکی میں ان کو پڑھنے اور سمجھنے والے ناپید ہیں ۔ عربوں نے ترکوں کے ساتھ جو سلوک کیا یہ اس کا رد عمل ہے جس کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ ترکی سے عربی رسم الخط تک کو خیرباد کہ دیا گیا ۔ روس میں بھی رد عمل کی کیفیت موجود ہے ۔ مگر یہاں مسئلہ یہ ہے کہ لامذہب و لادین مملکت ہے ۔ یہاں ہر مذہب کو ختم کردینا فطری عمل ہے الا یہ کہ وہ وقت آئے کہ موجودہ لامذہبیت سے لوگ عاجز و تنگ آجائیں ، اور پھر کسی دین و مذہب میں تلاش حق کریں ۔ روس میں انفرادی دین پر کوئی پابندی نہیں ہے ۔ لوگ صوم و صلواۃ میں آزاد ہیں ۔ تاہم جس فضا میں وہ سانس لیتے ہیں ، وہ دین و مذہب کی نشو و نما کیلئے سازگار نہیں ہے ۔ صرف رسمی طور پر آزادی ہے ۔ اب سے کچھ عرصے پہلے یہ بات نہیں تھی ۔ چنانچہ لبنان کے مفتی اعظم شیخ حسن خالد نے روس کا دورہ کرنے کے بعد ایک کتاب لکھی جس کا نام ہے ''پہلا سفر،، ۔ اس میں اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ سوویت یونین میں مذہبی آزادی ہے اور ان کے خیال میں یہ لینن کی اس پالیسی پر عمل درآمد کا نتیجہ ہے جس کے تحت یونین میں قومی اور مذہبی پابندیوں کو دور کیا گیا ہے ۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ صورت حال کیا تھی اور سوویت حکومت کے بانی نے کیا کردار ادا کیا ۔

لینن اور مسلمان

اکتوبر کے عظیم اشتراکی انقلاب کے بعد ''روس اور مشرق کے تمام محنت کش مسلمانوں کے نام،، ایک اپیل شائع کی گئی۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا:

''آج سے آپ کے عقائد اور رسم و رواج، آپ کے قومی اور مذہبی ادارے سب کے سب آزاد اور قابل حرمت ھیں۔ اپنی قومی زندگی آزادی سے اور بلا کسی رکاوٹ کے گزارئیے۔ یہ آپ کا حق ھے،،۔

اس اپیل کی اھمیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک یہ معلوم نہ ھو کہ زار شاھی روس میں مذھب کی حالت کیا تھی۔ عیسائی مذھب حکومت کا سرکاری مذھب تھا اور باقی دوسرے مذاھب، جن کی تعداد دس تھی، اور جن میں اسلام بھی شامل تھا، محکوم حیثیت کے حامل تھے۔ اس اپیل میں جو سوویت حکومت نے مسلمانوں سے کی، عیسائی مذھب کی برتری کو ختم کردیا اور اس برتری کے سبب دوسرے مذاھب پر جو پابندیاں عائد تھیں، انھیں دور کردیا۔

۲۳ جنوری ۱۹۱۸ء کو لینن کے ایما پر ایک خاص سرکاری فرمان کا اجرا عمل میں آیا۔ اس فرمان کی روح سے ھر شھری کو ضمیر کی مکمل آزادی دی گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت سے سوویت یونین کے ھر شھری کو یہ آزادی حاصل ھوگئی کہ وہ جو مذھب چاھے اختیار کرے اور اپنی مذھبی رسومات آزادی سے ادا کرے۔ یا کوئی مذھب اختیار نہ کرے۔ اس حکم میں یہ کہا گیا تھا کہ مذھبی عقائد کی بنا پر کسی کے ساتھ بےجا سلوک

کرنا ، کسی کے مذہبی احساسات کو ٹھیس پہنچانا اور مذہبی رسومات کی ادائیگی پر کسی کے خلاف تادیبی کارروائی کرنا قابل سزا جرم ھے ۔ اس حکم میں ایسے قوانین اور فرمان جاری کرنے کی بھی ممانعت کی گئی تھی جو کسی کے ضمیر کی آزادی کو محدود کردیں یا مذہب کی بنا پر کسی کو فوقیت دیں ۔ اس فرمان کے اجرا کے ساتھ ھی مذہب کو حکومت سے اور اسکولوں کو مذہب سے الگ کر دیا گیا ۔ اس طرح سے سوویت یونین میں ھر مذہب کا مرتبہ یکساں ھوگیا ۔ اس کے علاوہ حکومت نے مذہب کے معاملات میں دخل اندازی بند کردی اور ساتھ ھی یہ کہا کہ مذہب بھی حکومت کے معاملات میں دخل نہ دے ۔

وسطی روس کے مسلمانوں کے سلسلے میں، جہاں مذہبی نا انصافی بہت زیادہ تھی ، اس فرمان کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے لینن کی ذاتی ھدایت پر وسطی روس کے مسلم امور کی ایک خصوصی جماعت (کمیساریت) قائم کی گئی ۔

ایک سیاست دان کی حیثیت سے لینن کی ایک نمایاں صفت یہ تھی کہ وہ تمام قوانین اور فرمانوں پر سختی سے عمل درآمد کرانے میں دوسروں کے سامنے ایک مثال قائم کرتے تھے ۔ ان کی یہ صفت ان کے اس طرز عمل سے بھی ظاھر ھوتی ھے جو انہوں نے مذہب اسلام کی جانب اختیار کیا ۔ اس کی ایک نمایاں مثال حضرت عثمان غنیؓ کے قرآن پاک کے نسخے کے واقعے مین ملتی ھے ۔ روایت یہ ھے کہ حضرت عثمانؓ کے قرآن مجید کے اس نسخے کو امیر تیمور سمرقند سے لایا تھا ۔ یہ تاریخی واقعہ سب لوگوں کے علم میں ھے ۔ اس کے بعد جب وسطی ایشیا روس کے زیر اقتدار آ گیا

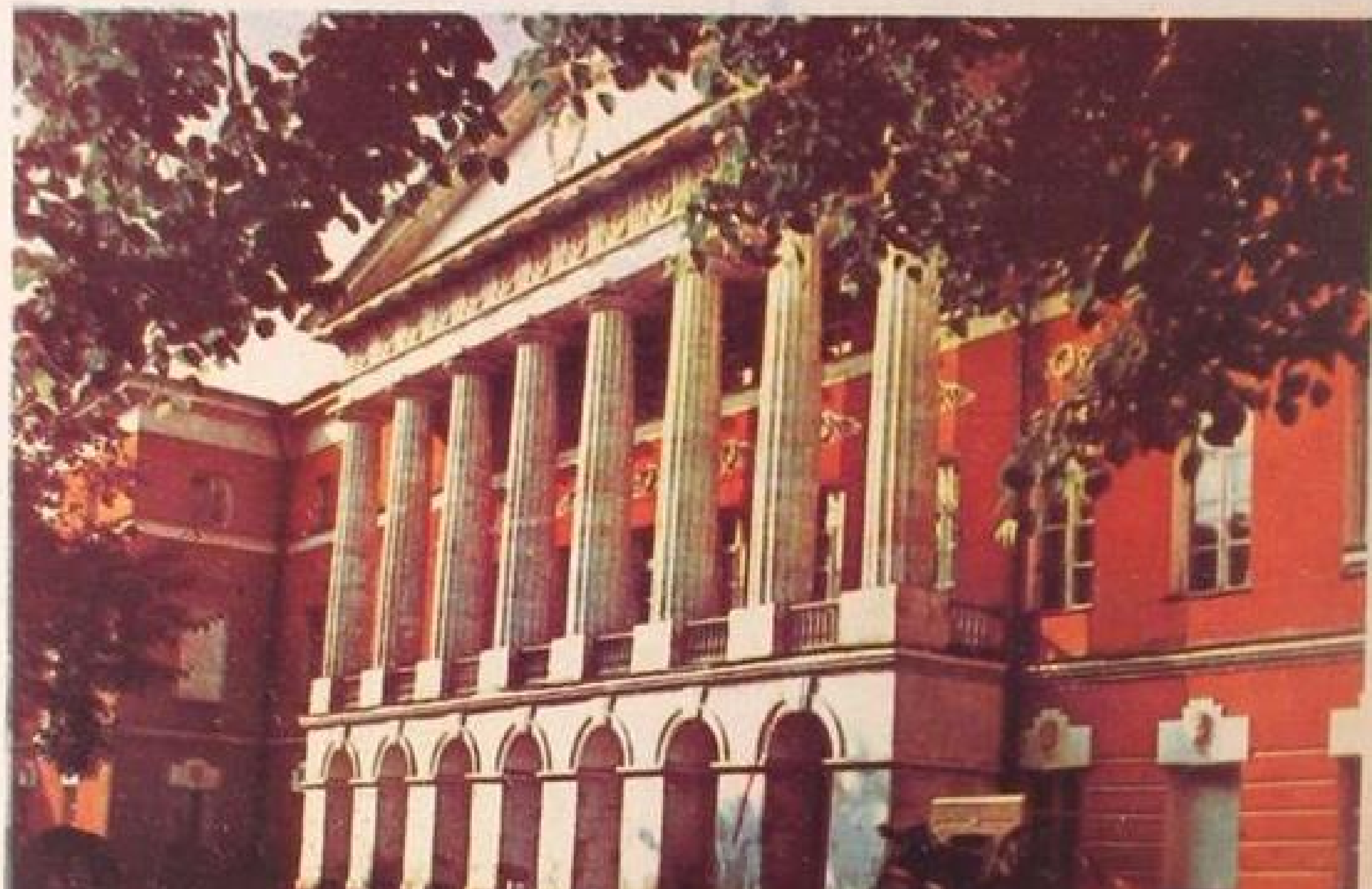
تو زار کے افسروں نے ایک سو روبل دے کر قرآن پاک کا یہ نسخہ حاصل کرلیا اور اس طرح سے مسلمانوں کو حضرت عثمانؓ کے قرآن مجید کے نایاب نسخے سے محروم کردیا گیا۔ اکتوبر کے انقلاب کے بعد یہ متبرک نسخہ مسلمانوں کو واپس کردیا گیا۔ پیڑگراڈ کے مسلمانوں کی درخواست پر یہ واپسی لینن کی ذاتی ہدایت کے مطابق عمل میں آئی۔ پھر قرآن مجید کا یہ نسخہ ازبکستان کے عوامی عجائب گھر کے انتہائی قیمتی قلمی نسخوں میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

لینن نے مسلمانوں کی اس درخواست پر بھی بہت توجہ دی جو اسلامی ثقافت کی ایک تاریخی یادگار یعنی سمرقند کی جامع مسجد کی مرمت کے متعلق تھی۔ خانہ جنگی، معاشی بد حالی اور دوسری مشکلات کے باوجود لینن نے اس درخواست پر عمل در آمد کیا اور اس کام کو پورا کر دیا۔

سالہا سال گزرتے رہے مگر لینن کی پالیسی کے اصول قائم رہے۔ پہلے کی طرح آج بھی سوویت حکومت قدیم یادگاروں کی مرمت اور حفاظت ثقافتی نقطۂ نگاہ سے کراتی رہتی ہے۔ یہ کام بہت بڑے قومی پیمانے پر ہوتا ہے۔ یونین کا دورہ کرنے والا ہر شخص یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ مرمت اور تعمیر کا کام، جس سے اسلامی ثقافت کی یادگاروں میں اصل کی طرح دوبارہ خوبصورتی آگئی ہے، بہت سے دیکھنے والوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے۔ جن یادگاروں کی اس وقت مرمت کی جارہی ہے، ان میں گور امیر، ریگستان کا سلسلۂ تاریخی عمارات، پہلوان محمود گاواں کا مزار، بی بی خانم کی جامع مسجد اور محمود



ماسکو میں فتح کی یادگار محراب



روسی انقلاب اکتوبر کا عجائب گھر

یوسفی کا مقبرہ شامل ہیں۔

پہلے کی طرح اب بھی حکومت یا اس کا کوئی ادارہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرسکتا اور نہ وہ کسی دینی عقیدے یا رسوم سے سروکار رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا انصرام چار آزاد مذہبی بورڈوں کے سپرد ہے۔ سوویت یونین کے یورپی حصے اور سائبیریا کے مسلمانوں کا بورڈ (جس کا مرکز اوفا میں ہے)، شمالی قفقاز اور داغستان کے مسلمانوں کا بورڈ (جس کا مرکز بوئی ناکس میں ہے)، ماورائے قفقاز کے مسلمانوں کا بورڈ (جس کا مرکز باکو میں ہے) اور وسط ایشیا اور کزاخستان کے مسلمانوں کا بورڈ (جس کا مرکز تاشقند میں ہے)۔

ہرمذہبی بورڈ ان قواعد و ضوابط کے مطابق کام کرتا ہے جن کی منظوری اسلامی کنگرسیں دیتی ہیں۔ کنگرسوں کے جلسوں میں اور ان کے درمیانی وقفوں میں مسلمانوں کے تمام مسائل کو مذہبی بورڈ کی مجلس صدارت طے کرتی ہے جس میں بڑے بڑے مسلمان راہنما اور بڑی مسجدوں کے امام منتخب کئے جاتے ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ ان حالات میں سوویت یونین کے مسلمان اپنے تمام دینی فرائض اچھی طرح سے بجالاتے ہیں، مذہبی تہوار مناتے ہیں اور حج کرنے بھی جاتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح نہیں ہے کہ حکومت ان کو حج پر جانے سے روکتی ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ ان کو قاعدے اور قانون کے مطابق سفر کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ یہ دوسرے ملکوں میں دوسرے مقاصد کے لئے جانے کے وقت بھی دی جاتی ہے۔

"کمیونسٹ ممالک میں مذہب" کے نام سے ایک

رسالہ شائع ہوتا ہے ۔ اس میں ایک مضمون حال ہی میں پروفیسر الیکزنڈر بینگس اور شترال لامر کلر کیونک پوجے کے قلم سے لکھا ہوا شامل اوراق ہوا ہے ۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت سارے روس میں مسلمانوں کی کل تعداد آٹھ کروڑ ہے جو اس صدی کے آخر تک دس کروڑ ہوجائے گی ۔ باقی روسیوں کی تعداد پندرہ کروڑ کے قریب ہوگی ۔ گویا مسلم اور غیر مسلموں میں ایک اور ڈیڑھ کی نسبت ہوگی ۔ یہ الگ حقیقت ہے کہ صرف تریسٹھ فیصد مسلمان ارکان اسلام پر سختی سے عمل کرتے ہیں ۔ نماز اور روزے کے پابند ہیں ۔ حج بیت اللہ کے لئے سفر بھی کرتے ہیں ۔ باقی میں سے اکیس فی صد کسی پابندی اور دلی عقیدت کے بغیر فرائض مذہب ادا کرتے ہیں اور باقی سولہ فیصد صرف نام کے مسلمان ہیں ۔ وہ فرائض تو کجا، عام رسومات اسلامی کا بھی لحاظ نہیں رکھتے ۔ اس تشکیل و تفریق سے حکومت نے کھلی آزادی دے رکھی ہے ۔ عقائد پر کوئی قدغن نہیں ہے ۔

اس طرح ثابت ہوسکتا ہے کہ سوویت یونین میں دین اسلام کے ساتھ سوتیلے پن کا برتاؤ نہیں ہوا ۔ میرا نقطۂ فکر یہ ہے کہ اسلام کی آفاقیت کو سب سے زیادہ نقصان خود اہل اسلام نے پہنچایا ہے ۔ اس وقت عالم اسلام کج رویوں کے باعث جس راہ پر گامزن ہے وہ اسے نہ قرآن کی طرف لے جاتی ہے اور نہ سنت کی جانب ۔ درحقیقت اس کی فی الحال کوئی منزل مقصود ہے ہی نہیں۔ مرکز سے فرار کوئی انفرادی عمل بھی نہ تھا ۔ بلکہ فکری غلامی اور سیاسی اسیری نے التزام و انصرام کے ساتھ اور تدریج و تسلسل کے ساتھ گزشتہ دو سالوں میں اسے لا مرکزیت کے حوالے کیا ہے ۔

اس لامرکزیت کے بعد اسے بہرحال کسی منزل مقصود کا تصور کرنا ہی ہے۔ اب وہ اس کی تلاش میں نکلا ہے اس طرح کہ اس کے چاروں طرف ایک نہیں متعدد نظریات و افکار کی یورش ہے اور ان پر مستزاد یہ کہ اس کے لئے سامان عیش و عشرت کی فراوانیاں ہیں۔ وہ تمام طاقتیں کہ جو اسلام کی نشو و نما کے ہر سامان کو تباہ کردینا چاهتی ہیں، ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اگر اپنے افکار کے دامن میں ان مسلمین کونہیں لاسکتیں تو فی الحال ان کو عیش و عشرت کے جال میں پھنسا کر رکھا جائے اور اس جال سے اس وقت تک ان کو باهر نہ نکلنے دیا جائے جب تک ان کے دل و دماغ میں اپنے ماضی کی ذرا بھی رمق باقی ہو اور اپنے دین کی ننھی سی بھی چنگاری ہو۔

آج دنیائے اسلام میں یہ عمل جاری ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ وقت کتنا قریب ہے کہ جب کسی کے لئے خود کو مسلمان کہنا وجۂ شرمندگی ہوگا۔ ایسی بے بسی کی صورت میں روس کے دس گیارہ کروڑ مسلمانوں کیلئے عالم اسلام میں وجۂ کشش آخر کیا ہوسکتی ہے؟ اور ان کو تحفظ دینے کے محرکات آخر کیا ہو سکتے ہیں؟ اس کے برعکس وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کی حکومت یعنی روس کے اثرات اسلامی ممالک میں نفوذ کررہے ہیں۔ عراق و شام کو وہ مزاجاً روسی بنا چکے ہیں۔ مصر کو تہ وبالا کیا جاچکا ہے۔ لیبیا میں اثرات دائم ہو چکے ہیں۔ افغانستان ان کی پوری گرفت میں ہے۔ ایران نے مذھبی بنیادوں میں شگاف ڈال دئے ہیں۔ پاکستان میں بھٹو صاحب نے سوشلزم کے لئے عملاً راہیں ہموار کردی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں

چین نے مسلمانوں کو دین سے دور کردیا ہے۔ مشرقی پاکستان روس اور پھر چین کی آماجگاہ بن چکا ہے۔

مسلمانان عالم کا مستقبل

میری رائے میں ابھی آنے والے پچاس سال تک یہ عمل جاری رہیگا۔ اگر اس عرصے میں کوئی زبردست تحریک اسلامی نہ اٹھی اورلوگ اپنے کئے پر نہ پچتائے تو پھر اسلام کے لئے فضا تنگ تر ہو کر رہیگی اور وہ لادینی ہی کو اپنا مذہب قرار دینگے۔ میں ذاتی طور پر اور اپنے عمیق مشاهدوں کی بنا پر یہ کہ سکتا ہوں کہ مسلمانان عالم اب ہمت ہار چکے ہیں۔ اب صرف پاکستان ہے جس پر ساری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ دین اسلام نے پاکستان سے اسلامی تحریک کی توقع قائم کی ہے اور تمام غیر اسلامی قوتوں نے پاکستان میں اس قسم کی تحریکات کو سرد کردینے کا عمل قائم کرنے پر کمر باندھ لی ہے۔ مذہب و دین اور لامذہبیت و لادینی کے مابین ایک ایسی جنگ جاری ہے جو بہ ظاہر لادینی کی فتح پر منتج ہوتی نظر آتی ہے۔ گزشتہ دنوں میں ڈھاکہ میں تھا۔ وہاں تحریک دین کا جو حال دیکھا، اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ وہاں تبلیغی جماعت کا اجتماع کم از کم دس لاکھ انسانوں پر مشتمل تھا۔ تاجیکستان میں لادینی نظریۂ حیات لادینی کی فتح ہے جس کی قیادت آج بھی ماسکو کے ریڈ اسکوئر میں مقبرۂ لینن میں لینن کی لاش کو بالکل زندہ انسانوں کی طرح محفوظ رکھ کر کی جارہی ہے۔

آف ! بات کہاں سے کہاں جاپہنچی۔

لینن کو خراج عقیدت

ہم سب مہمان خانے سے قطار اندر قطار روانہ ہوئے۔



مجسمۂ لینن پر مندوبین کنگرس عالمی صدر الدین عینی کی حاضری -

کم از کم پچیس موٹریں تو ہونگی۔ ہم نے دیکھا کہ ایک مقام پر بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ یہ مجسمۂ لینن تھا۔ ہم سب یہاں اتر گئے۔ گویا اس جگہ ہمارا انتظار ہی ہورہا تھا۔ چنانچہ مجسمے کے قدموں میں ہدیۂ گل پیش کرنے کی موثر تقریب عمل میں آئی۔ سب سے پہلے رئیس جمہوریۂ تاجیکستان نے ہدیۂ گل نذر کیا اور دوسرا ہدیۂ گل سفیں ہند اور ان کی اہلیہ کی طرف سے پیش ہوا۔ یہاں چند مقامی خواتین موجود تھیں جو تمام مندوبین اور مہمانوں کو گل دستے دے رہی تھیں تاکہ ہر ایک اپنی عقیدت کا اظہار کرسکے۔ مجھے گل دستہ نہ مل سکا اور میں مجبوراً یہ رسم ادا نہ کرسکا۔ مگر میں یہ اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکا کہ لینن کس قدر عظیم انسان تھا کہ اس نے دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو اپنے افکار میں رنگ دیا تھا۔ دنیا کا ہر بڑا شخص اس کی تعریف و توصیف میں اور اسے خراج عقیدت پیش کرنے میں رطب اللسان رہا ہے اور اب بھی ہے۔

چین کی قومی حکومت کے سابق صدر سن یات سین نے کہا تھا:

”عالمی تاریخ کی بے شمار صدیوں کے دوران ہزار ہا رہنما اور عالم پیدا ہوئے جنھوں نے بڑے خوبصورت الفاظ استعمال کئے جو کبھی عملی صورت اختیار نہ کرسکے۔ لیکن لینن! تم ان سب سے الگ تھے۔ تم صرف بولتے اور سکھاتے ہی نہیں رہے بلکہ تم نے اپنے الفاظ کو حقیقت کا روپ دیدیا۔ تم نے انسان کو مشترکہ جدوجہد کا راستہ دکھادیا۔ تم نے اس راستے پر، جسے میں نے بھی اختیار کیا، ہزارہا مشکلات کا سامنا کیا۔ میں بھی تمہارے

ہی راستے پر گامزن ہوں۔ اگرچہ میرے دشمن اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن میرے عوام مجھے اس کے لئے سلام کرینگے۔ تم جلد فوت ہوگئے۔ قسمت نے تمہیں طویل زندگی عطا نہیں کی لیکن محکوم عوام کے حافظے میں تم صدیوں تک زندہ رہو گے، کیونکہ تم ایک عظیم انسان ہو"۔

شہنشاہ ایران محمد رضا خاں پہلوی نے کہا:

"اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ لینن کا فلسفہ ہی سوویت عوام کی ثابت قدمی اور حوصلے اور سوویت یونین کی تمام تر کامیابیوں کی بنیاد تھا۔ لینن کا رول بہت عظیم ہے۔ صرف روس کے عوام ہی لینن کے لئے محبت اور تشکر کے احساسات نہیں رکھتے ایران کے عوام بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔ لینن ہی وہ شخص تھے جنھوں نے ایران کے ساتھ زار شاہی حکومت کے غیر مساوی معاہدوں اور استحصال کے خاتمے کا سرکاری طور پر اعلان کیا"۔

برطانوی دانش ور اور مشہور ڈرامہ نویس برنارڈ شا نے کہا:

"ہم کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ لینن چونکہ اب فوت ہوچکے ہیں، اس لئے ان کا تعلق ماضی سے ہے۔ لینن کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اگر ان کی تحریک اشتراکیت کی ترویج ناکام ہوجائے تو ہماری موجودہ تہذیب کو زوال ہوجائیگا"۔

مشہور جرمن سائنس داں البرٹ فنس تین نے کہا:

"میں ایک ایسے انسان کی حیثیت سے لینن کی عزت کرتا ہوں

جنھوں نے اپنی ساری توانائی مکمل بے لوث قربانی کے ساتھ سماجی انصاف کے لئے وقف کردی تھی۔ ان جیسے انسان نوع انسان کے ضمیر کے محافظ اور رکھوالے ھیں"۔

فرانس کے شہرہ آفاق مصنف روسین رولاں نے کہا :

"انھوں نے انسانی سمندر کی بحرانی لہروں میں ایک مضبوط اور پر اعتماد ھاتھ سے اپنی قوت ارادی کی پتوار کو حرکت دی اور انھوں نے اپنے پیچھے جو نقوش چھوڑے ھیں، وہ صدیوں تک نظر آتے رھیں گے۔ وہ اپنے جہاز کو پوری رفتار سے چلاتے ھوئے تمام طوفانوں سے گزر کر نئی دنیا میں لے آئے۔ لینن ھمارے عہد کے سب سے بڑے باعمل انسان ھیں اور وہ بے غرض ترین انسانوں میں سے ھیں"۔

عوامی جمہوریہ ویت نام کے سابق صدر ھوچی منہ نے کہا :

"عظیم لینن کی بتائی ھوئی شاھراہ پر، انقلاب اکتوبر کی شاھراہ پر، پیش قدمی کرتے ھوئے ویت نامی عوام نے زبردست فتوحات حاصل کی ھیں۔ یہی وجہ ھے کہ شاندار انقلاب اکتوبر کے لئے، عظیم لینن کے لئے اور سوویت عوام کے لئے ویت نامی عوام کے محبت اور تشکر کے احساسات نہایت گہرے ھیں"۔

جمہوریہ کیوبا کے وزیراعظم فیڈرل کاسترو نے کہا :

"ھم ھمیشہ لینن کے زبردست مداحوں میں شامل رھے ھیں۔ تاھم جب ھم نے یہ دیکھا کہ ان کے عوام نے کیا کامرانیاں حاصل کی ھیں اور جب ھم نے سوویت یونین سے

واقفیت حاصل کی تو ہماری نظر میں لینن کی عظمت کئی گنا زیادہ ہوگئی۔ لینن ہمارے لئے لافانی بن گئے"۔

جاپان کی سوشلسٹ پارٹی کے چیرمین توموسی ناریتا نے کہا:

"لینن ہمارے ملک میں انقلاب روس کے وقت سے ایک عظیم ترین شخصیت کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ لینن شاندار دور بینی کے حامل ایک سنجیدہ نظریہ داں کے ساتھ ساتھ ایک پر جوش عملی کارکن بھی تھے۔ دنیا کی پہلی اشتراکی ریاست ان کی قیادت میں وجود میں آئی۔ ہمارے عہد میں اشتراکیت دنیا کے ایک تہائی حصے میں فتح مند ہوچکی ہے"۔

الجزائر کے محاذ قومی آزادی کی مرکزی مجلس کے رکن محمد شے بیلا نے کہا:

"لینن نے افریقہ میں واقعات کے نشو و نما کی جانب خصوصی توجہ دی اور سامراجیوں اور نوآبادکاروں کی ریشہ دوانیوں کی ہمیشہ مذمت کی۔ عظیم انقلاب اکتوبر سے پہلے بھی اپنی بہت سی تحریروں میں انہوں نے افریقہ اور ایشیا کے محکوم عوام کی بیداری کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ عوام کے مضبوط و مستعد اتحاد پر لینن کے اعتماد نے تاریخی عمل کے دوران عوامی انقلاب کی فتح کے لئے فیصلہ کن حیثیت اختیار کرلی۔ الجزائر اور دیگر بہت سے ممالک کی مثال اس کا واضح ثبوت ہے"۔

لینن کے مجسمے کے قریب تقریب بڑی پر شکوہ اور شاندار تھی۔ ایک صاحب نے بڑھ کر سوال کیا: "سفیر پاکستان یہاں موجود نہیں ہیں؟"۔ چونکہ مجھے حقیقت کا علم تھا، اس لئے میں

نے جواب دیدینا مناسب بلکہ ضروری سمجھا۔ میں نے کہا کہ وہ اپنے سفارتی فرائض کی انجام دہی کے لئے فن لینڈ گئے ہوئے ہیں۔ جواب تو میں نے دیدیا لیکن میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ جشن صد سالۂ عینی میں سفیر پاکستان کو یا کم از کم آن کے نائب کو ضرور شریک ہونا چاہئے تھا۔ یہ بات صحیح ہے کہ جناب فیض احمد فیض صاحب کی موجودگی پاکستان کی نمائندگی کرتی ہے مگو فیض صاحب اول تو "روسی" ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ "حکومت پاکستان" نہیں ہیں۔ اور یہ عاجز و حقیر نہ کسی شمار میں ہے نہ قطار میں۔ میری شرکت محض ادبی اعتبار سے ہے، سیاسی رنگ میں نہیں ہے۔

شاہراہ عینی پر تقریب عینی کی مناسبت سے روسی زبان میں سرخ رنگ کے بینر آویزاں کئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی کم از کم تین بینر فارسی زبان میں تھے جن کا رنگ سفید تھا اور فارسی رسم الخط بڑا ہی مایوس کن بلکہ ذہن کے لئے تکلیف دہ تھا۔ میرے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ فارسی زبان کے یہ بینر کہ جو کلام عینی پر مشتمل تھے، سرخ کیوں نہیں ہیں؟ اس کا جواب نہ مل سکا۔

ابوعبداللہ رودکی

ہماری دوسری منزل مجسمۂ ابوعبداللہ رودکی تھی کہ جہاں اسی انداز سے نذرانۂ گل پیش ہوا کہ جو لینن اعظم کے مجسمے پر ملحوظ رکھا گیا تھا۔ میں جب تہران میں تھا تو کنگرس عالمی البیرونی جس ہال میں ہوئی تھی، وہ رودکی ہال تھا۔ اس وقت میں یہ معلوم نہ کرسکا تھا کہ رودکی کیا ہے، آج ذہن صاف ہوا۔ رودکی عظیم شاعر ہے۔ اس کا مجسمہ یہاں دوشنبہ میں ہے اور اس

کے نام پر بڑا اہم مقام رودکی ہال تہران میں ہے۔

تیسری سے چوتھی صدی ہجری یا نویں سے دسویں صدی عیسوی تک شمالی مغربی ایشیا میں ساسانیوں کا عہد بڑا شاندار رہا ہے۔ اگرچہ مدت فرمانروائی ایک سو تیس سال رہی لیکن اس دوران میں بڑے نامور شہنشاہ تخت نشین ہوتے رہے جنہوں نے نہ صرف حکومت کی باگ ڈور سنبھالی بلکہ ادب و شعر، تاریخ و فلسفہ اور دوسرے علوم کی بھی سر پرستی کی۔ ساسانی خاندان کا مورث اول اسد بن ساسان تھا جس نے اپنے باپ کے نام پر شاہی خاندان کا نام ساسانی رکھا۔ اسی خاندان کا ایک فرمانروا نصر بن احمد تھا جس کے دربار میں رودکی نے ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ وہ فارسی شاعری کا بانئی اول کہا جاتا ہے اور وہ پہلا صاحب دیوان شاعر بھی تھا۔ رودکی کے علاوہ اس دور کے چند اور شاعر بھی بڑے نامور تھے جن میں ایک خاتون رابعہ فرواری بطور خاص قابل ذکر سمجھی گئی ہے۔ اس عہد کے شاعر اور ادیب شاہی دارالترجمہ سے بھی وابستہ رہے۔ رودکی ان کا سربراہ تھا۔ اس کا اصل نام محمد جعفر تھا اور چونکہ نخشب ضلع کے ایک گاؤں رودک کا رہنے والا تھا، اس لئے رودکی کہلانے لگا اور شاعری میں یہی اس کا تخلص بھی ہوگیا۔ بعض مورخین نے اس تخلص کی وجہ تسمیہ دوسری لکھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد جعفر اچھا مغنی تھا اور ایک باجہ خوب بجا تا تھا جسے رود کہتے تھے۔ اس سبب سے لوگ اسے رودکی کہنے لگے۔ لیکن پہلی وجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس کے نام میں بھی اختلاف رائے ہے۔

رودکی کے بارے میں ایک عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ھے کہ وہ یونانی النسل شاعر ھومر کی طرح پیدائشی اندھا تھا لیکن ھومر سے کہیں زیادہ علوم و فنون کا ماھر ثابت ھوا ۔ آٹھ برس کی عمر میں اس نے قرآن مجید حفظ کرلیا تھا ۔ پھر علم قرأت کی تکمیل کی اور اسی وقت سے شعر بھی کہنا شروع کردیا ۔ وہ نہایت لطیف الطبع ، حاضر جواب اور بزلہ سنج تھا ۔ کلیہ و دمنہ کو ، جس کا ترجمہ سنسکرت زبان سے کیا گیا تھا ، منظوم کرنے کا سہرا اسی کے سر ھے ۔ اس کی قدر و منزلت اور جاہ و ثروت کا یہ عالم تھا کہ جب اس کی سواری نکلتی تو دوسو زرین کمر غلام رکاب کے ساتھ چلتے تھے اور جب دور دراز علاقے کے سفر پر جاتا تو چار سو اونٹوں پر اس کا سامان لادا جاتا تھا ۔

رودکی نہایت پرگو شاعر تھا ۔ رشیدی سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ھے ، البتہ بیشتر حصہ آج نایاب ھے ۔ اقسام سخن میں سے اس کے ھاں سب کچھ موجود ھے ۔ قصیدہ ، رباعی ، قطعہ ، غزل ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ ۔ اس کے کلام میں مثنوی کی مثال ذرا مشکل سے ملیگی ۔ لیکن حکایت کلیلہ و دمنہ ، جسے سنسکرت کے ترجمے سے منظوم کیا گیا ھے ، مثنوی ھی کی صف میں شمار ھوسکتی ھے ۔

اس کی شاعری کا عام انداز واقعہ نگاری ، پند و موعظت اور حسن تاثیر تھا اور یہی عربوں کے عہد جاھلیت کا اصل جوھر سمجھا جاتا تھا ۔ اس نے عشق و محبت کی داستان سرائی سے اجتناب نہیں کیا بلکہ اس ضمن میں درجۂ کمال حاصل کیا ۔ اس نے ایسی ایسی تشبیہات وضع کیں جو بعد میں فارسی شاعری کے لئے

طرۂ امتیاز ہوگئیں ۔ اس کی ایک غزل کا مطلع ہے :

زہے فزودہ جمال تو زیب آرا را
شکستہ سنبل زلف تو مشک سارا را

عنصری جیسے ماہر فن شاعر تک نے رودکی کے کمالات کا اعتراف کیا ہے ، خصوصاً اس کے قصائد کا لوہا مانا ہے۔ قصیدے کے حسن کا بڑا معیار گریز ہے جسے تشبیب کہتے ہیں ۔ رودکی اس انداز بیان کا خاص ماہر تھا ۔ مثلاً ایک باغ کی تعریف کی جارہی ہے ، محبوب باغ کو دیکھکر کہتا ہے کہ تو بہشت ہے ۔ اس کے جواب میں رودکی کہتا ہے کہ بہشت نہیں باغ ہے لیکن خدا کی بہشت کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے اور یہ علانیہ ہم سب کے سامنے موجود ہے ۔ گویا یہ نقد ہے ، وہ ادھار ہے ۔ یہ ظاہر ہے وہ مخفی ہے ۔ وہ نماز پڑھنے سے ملتی ہے اور یہ اس کی مدح کرنے سے ۔ وہ خدا کا عطیہ ہے اور یہ بادشاہ کا ۔ اس سے ہم اپنی زندگی میں لطف اندوز ہوسکتے ہیں اور اس سے مرنے کے بعد۔ اس نے تینتیس شعروں کا ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جس کا ہر شعر مطلع ہے ۔ یہ طرز سخن کسی کو نصیب نہیں ہوا ۔ زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بصارت بالکل نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا مشاہدہ اتنا تیز تھا کہ دیدہ ور بھی اس کے سامنے مات کھاجاتے تھے۔ شراب کی تعریف میں کہتا ہے کہ شراب اور عقیق دونوں ایک ہی چیز ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ ایک سیال ہے ، دوسری منجمد ۔ شراب کے رنگ اور کیفیت کا یہ عالم ہے کہ اسے چھوئے بغیر ہی ہاتھ رنگین ہوجاتے ہیں اور بے چکھے دماغ پر اثر کرتی ہے ۔ عقیق میں یہ خوبیاں کہاں ہیں ۔

اس کے کلام کی بے پناہ تاثیر ضرب المثل ہوگئی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس ضمن میں **ایک** دلچسپ واقعہ قلم بند کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

نصر بن سا سانی نے **ایک** دفعہ ہرات کا سفر کیا اور بادغیس میں جو کہ ہرات کی مشہور نزہت گاہ ہے، پڑاؤ ڈالا۔ بہار کے دن تھے اور تمام دشت و صحرا چمن زار بن گیا تھا۔ نصر ان دل فریبیوں میں ایسا محو ہوا کہ ساری بہار یہیں گزر گئی۔ جاڑے آئے تو میووں کی بہتات ہوئی۔ ان اطراف میں **ایک** سو بیس قسم کے انگور ہوتے ہیں جن میں ترنیاں اور کانجدی نہایت خوش مزہ، شاداب اور نرم ہوتے ہیں۔ نصر صحرا سے اٹھکر آبادی میں آیا اور درواز میں، جو **ایک** مشہور مقام ہے، قیام کیا۔ یہ مقامات نہایت آباد اور معمور تھے۔ ہرطرف عالی شان قصر و ایوان اور ہر ایوان کے ساتھ خانہ باغ اور پائیں باغ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں سیستان اور مازندران کے میوہ جات کی آمد ہوئی۔ نصر نے جاڑے بھی یہیں گزارے۔ ہر دفعہ قصد کرتا تھا کہ اب کی بہار گزرنے پر روانہ ہوجاؤں گا لیکن جب **ایک** موسم گزرجاتا تھا تو دوسرا زنجیر پا بن جاتا تھا۔ اسی طرح پورے چار سال گزرگئے۔ امراء اور فوج کے لوگ **تنگ** آگئے۔ تاہم بادشاہ سے کچھ کہنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ آخر رودکی کے پاس گئے اور پانچ ہزار اشرفیاں اس شرط پر دینی منظور کیں کہ بادشاہ یہاں سے بخارا واپس چلا جائے۔ اگلے روز رودکی دربار میں گیا۔ نصر شراب پی رہا تھا۔ رودکی نے ساز کے ساتھ عشاق کی دھن میں یہ اشعار گائے:

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے — یاد یار مہرباں آید ہمے
ریک آموی و درشتیہائے او — زیر پایم پرنیاں آید ہمے
آب جیحوں باھمہ پہناوری — خنگ مارا تامیاں آید ہمے
اے بخارا شاد باش و شاد زی — شاہ سویت مہماں آید ہمے
شاہ سرو است و بخارا بوستاں — سرو سوئے بوستاں آید ہمے
شاہ ماہ است و بخارا آسماں — ماہ سوئے آسماں آید ہمے

یہ سن کر نصر کا یہ حال ہوا کہ پاؤں میں موزے تک نہ پہنے اور اسی وقت سوار ہوکر بگ ٹٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا پوری ایک منزل پر جاکر دم لیا ۔

رودکی نے ۳۰۴ ھجری میں وفات پائی ۔ اس کا دیوان پہلی بار ایران میں چھپا اور پھر چھپتا ھی رہا ۔ اب بھی اس کی بڑی مانگ ہے ۔ دوشنبہ میں اگر اس کا مجسمہ نصب کیا گیا تو وہ اس کا مستحق تھا ۔

ترسون زادہ کے مزار پر

اس کے بعد تمام مندوبین مرزا ترسون زادہ کے مزار پر ھدیۂ گل پیش کرنے اور فاتحہ پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے ۔ فیض احمد فیض صاحب نے مجھے بتایا کہ مرزا ۱۹۴۹ء میں پاکستان آئے تھے ۔ میری ملاقات ان سے تقسیم برصغیر سے ایک سال قبل دھلی میں ھوئی تھی جب وہ ایشین کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے ۔ لیکن وہ ملاقات سر سری تھی اور جب پاکستان آئے تو میں خود پاکستان سے باھر شاید قاھرہ (مصر) میں تھا ۔ میں ان کی شخصیت اور ان کی تحریروں یا شاعری سے زیادہ واقف نہیں ھوں ۔



مزار ترسون زادہ پر گل ہائے
عقیدت پیش کرنے کے لیے مندوبین
جارہے ہیں ۔



مجسمۂ فردوسی سے قریب مندوبین
کنگرس عالمی صدر آلدین جمع ہیں ۔

ان کے مزار پر پہنچ کر مجھے اپنی علمی کم مائگی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔

مزار عینی پر

اس کے بعد ہم سب **لوگ** باغ عینی میں پہنچ گئے۔ یہاں صدرالدین عینی کا مزار ہے۔ مزار پر ان کا مجسمہ بھی ہے۔ یہاں لوگوں کی عقیدت کا کیا ٹھکانا تھا۔ ہم سب جشن عینی کے سلسلے میں وہاں جمع ہوئے تھے۔ بڑا جوش و خروش ظاہر ہورہا تھا۔ یہاں بھی خواتین گلدستے لئے کھڑی تھیں اور مندوبین کو دے رہی تھیں۔ میں نے ایک نہیں دو تین گلدستے لے لئے۔ جب تمام سرکاری گل پاشی ختم ہوگئی تو میں نے سب سے آخر میں ان کے مزار پر پھول رکھے اور پھر میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ پوری عقیدت اور قاعدے کے مطابق فاتحہ خوانی کی۔ ظاہر ہے کہ مجھے مجسمے کے مقابلے میں مزار کو ترجیحی حیثیت دینی چاہئیے تھی۔ اور ایک مسلمان کے مزار پر گل پوشی سے زیادہ فاتحہ خوانی ضروری ہوتی ہے۔ شاید ٹیلے وژن والوں کے لئے میری یہ حرکت عجوبۂ روزگار تھی۔ انہوں نے مجھے دل بھر کر فلما لیا۔ میرے علاوہ کسی نے اس انداز سے فاتحہ خوانی نہیں کی۔ البتہ محترمہ عصمت چغتائی کا انداز فاتحہ خوانی کا تھا مگر اس وقت ان کے طریقے میں ایک حیا تھی اور حجاب تھا اور یہ ان کے اصل مزاج اور افتاد طبع سے مناسبت اور مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

باغ عینی میں صدرالدین عینی کی بیوہ بھی موجود تھیں۔ ان کے بیٹے کمال صدرالدین عینی بھی ساتھ تھے۔ ان کے نواسے

نواسیاں ، پوتے ، پوتیاں ، بہو اور داماد سبھی تھے - بیوہ عینی بڑی ضعیف ھیں - میں ان کی خدمت میں حاضر ھوا - ان سے ھاتھ ملایا - ان کی بہو اور بچوں نے سر پر شفقت کا ھاتھ پھیرا - مندوبین یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور فلم برابر کھنچتا رہا - میں نے دل میں سوچا کہ یہ خاتون کس قدر خوش قسمت ھیں کہ ان کی زندگی میں ان کے شریک حیات کی یہ قدر و منزلت ھوئی ھے - میں نے ان کے چہرے پر نور مسرت دیکھا - میں نے خواھش ظاھر کی کہ ایک تصویر اس خاندان کے ساتھ کھنچ جائے تو اچھا ھو - استاد عبداللہ جان غفاروفے صاحب نے بالآخر اس کا انتظام کردیا -

اس موقع پر وھاں شجر کاری کی رسم بھی ادا ھوئی - میں اس میں حصہ نہ لے سکا - میری توجہ کا مرکز خاندان عینی تھا - بالآخر یہ تقریب ختم ھوئی -

ھاں اس باغ عینی میں ھمارے دوست عالیجناب بابا جان غفوروف بھی ابدی نیند سو رہے ھیں - آج کے پروگرام میں ان کے مزار پر فاتحہ خوانی کا کوئی ذکر نہیں تھا اور جب میں نے کہا کہ مجھے تو فاتحہ خوانی ضرور کرنی ھے تو کہا گیا کہ ھم آپ کو یہاں کسی اور دن الگ لے آئیں گے - لیکن میں نے دیکھا کہ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ بابا جان کا مزار یہاں ھے تو سب ھی مندوبین اس طرف متوجہ ھوئے اور گل فشانی کی رسم بھی ھوئی - میں نے تین گلدستے اسی خیال سے لئے تھے - چنانچہ ان میں سے ایک بابا جان کے مزار پر چڑھانے کے لئے بچا لیا تھا - گزشتہ بار جب میں دوشنبہ آیا تھا تو اکیڈمی آف سائنسز میں سب سے نمایاں تصویر و تعارف جس شخصیت کا کرایا گیا ،



مزار صدر الدین عینی -

مزار صدرالدین عینی پر گل ہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے مندوبین کنگرس عالمی صدر الدین عینی پہنچ رہے ہیں - گل ہائے عقیدت جناب سلیموف (سکریٹری ، از بکستان کمیونسٹ پارٹی) اورجناب مارخوف اٹھائے ہوئے ہیں -



وہ صدرالدین عینی کی تھی - پھر جناب با با جان غفوروف صاحب نے بھی، جو اس وقت زندہ تھے، ماسکو میں صدرالدین عینی کے بارے میں بڑی اھمیت کے ساتھ بتایا تھا اور ان کی تعریف کی تھی - معاً مجھے یاد آیا کہ اس وقت میں نے با با جان سے کہا تھا کہ مناسب معلوم ھوتا ھے کہ عینی کی نگارشات کے ترجمے اردو زبان میں ھوجائیں - انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مٹیریل مجھے بھجوائیں گے مگر بعد میں یہ کام نہ ھوسکا - اب مجھے بڑی شدت کے ساتھ احساس ھورھا تھا - اگر میں اس کام پر توجہ کرلیتا تو پاکستان میں عینی اب سے بہت پہلے روشناس خلق ھوجاتے -

غفوروف کے اھل خاندان کے ساتھ

با با جان غفوروف کے مزار پر ان کی اھلیہ اور ان کی ھمشیرہ سے ملاقات ھوئی - میں نے اظہار افسوس کیا - بیوی اور بہن دونوں متاثر ھوئیں - ان کو میرے بارے میں معلوم تھا کہ با با جان سے میرے تعلقات کیا تھے - گزشتہ بار (۱۹۷۵ء) میں نے ان کے گھر جانے کی سعی کی تھی، مگر انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی، کیونکہ وہ خود پہل کرنا چاھتے تھے - چنانچہ وہ ھوٹل میں دوبارہ ملاقات کے لئے آئے - میں ان کے گھر نہ جا سکا -

مجھے یاد ھے - ھوٹل میں وہ ایک دن آئے تو آتے ھی کہا : ''میں آج آپ کے ساتھ کھانا کھاؤنگا'' با با جان ھوٹل کے ھنگاموں سے بہت گھبراتے تھے اور سگریٹ کے دھوئیں سے ان کو سخت نفرت تھی - جمیل الدین عالی صاحب سے میں نے مشورہ کیا -

مسئلہ یہ تھا کہ ہم اس شام سفیر پاکستان جناب محترم سجاد حیدر صاحب کے ھاں کھانا کھارہے تھے - میں نے فوراً سفیر صاحب کو فون کیا - اس اثنا میں جمیل‌الدین عالی صاحب نے با با جان کو باتوں میں مصروف رکھا - سفیر صاحب نے اجازت دی کہ بابا جان غفوروف صاحب کو بہ خوشی سفارت خانے میں لے آئیں - وہ بھی ہمارے ساتھ کھا نا کھائیں گے - یہ طے ھوجانے کے بعد ہم نے با با جان کو بتادیا کہ ھم تو آج اپنے سفیر پاکستان کے ھاں مدعو ھیں - انہوں نے فرمایا : ''کیا میں وھاں چل سکتا ھوں ؟ '' میں نے کہا : '' بہ سرو چشم - سفیر پاکستان آپ کا وھاں استقبال کرینگے - ''

روس میں پابندیاں

روس میں لوگوں پر شدید پابندیاں ھیں - کسی سفارت خانے میں اجازت کے بغیر کوئی نہیں جاسکتا اور کوئی دعوت قبول نہیں کرسکتا - دعوت نامے روس کی وزارت خارجہ کو دئے جاتے ھیں اور اگر مناسب ھوتا ھے تو اس کی معرفت مدعوئین کو ملتے ھیں ورنہ ضائع کردئے جاتے ھیں یا پھر داخل دفتر ھوجاتے ھیں - ھم واقعی بڑے حیران ھوئے کہ با با جان کس طرح فوراً راضی ھوگئے - یہ ان کا بلند مرتبہ تھا کہ وہ اس قسم کی پابندیوں سے لاپروا تھے -

محترمہ روح افزا کی مہماں نوازی

ہمارے سفیر پاکستان جناب سجاد حیدر اور ان کی بیگم

محترمہ روح افزا نے بابا جان کا پر جوش استقبال کیا - سفیر صاحب بابا جان غفوروف کی عظمت کے پہلے سے معترف تھے اور ان کے بلند مقام سے پوری طرح واقف تھے - جناب سفیر صاحب نے ان کی جس قدر تواضع کی میں اسی قدر مسرور ہوا - کیوں نہ ہوتا ، بابا جان میرے دوست تھے ، بزرگ تھے اور مربی و محسن تھے - یونیسکو میں انجمن سنٹرل ایشیا کے جلسوں میں وہ مجھے بلانے جانے کے محرک ہوا کرتے تھے - آخری بار میکسیکو میں یونیسکو کی اس انجمن کا جلسہ ہوا تھا اور وہاں سے مجھے شرکت کی دعوت ملی تھی - اس جلسے میں یونیسکو کے ڈاکٹر نجم الدین بامات صاحب نے کہا تھا : ”ہم نے حکیم سعید اور همدرد کا قرار واقعی شکریہ ادا نہیں کیا ھے کہ جو انہوں نے یونیسکو سے تعاون کیا ھے“ - بابا جان صاحب صدر جلسہ تھے - انہوں نے بھی میری پوری پوری تعریف کی تھی - مجھے خوب یاد ھے کہ میکسیکو میں بابا جان نے اپنے ہوٹل میں ملاقات کے لئے مجھے بلایا اور مجھے کئی ھدیے دئے - ان میں ایک گھڑی بھی تھی جو میں نے لندن میں اپنے مطب میں رکھ دی ھے -

تاجیکی پلاؤ

جب کھانے کا وقت آیا اور ہم سب کھانے کی میز پر گئے تو بابا جان نے ایک گٹھڑی اٹھالی جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے - کھانے کی میز پر گٹھڑی ان کے ساتھ رہی - پھر انہوں نے کان میں مجھسے پوچھا : ”اگر میں کھانے کی کوئی چیز یہاں پیش کروں تو قابل اعتراض تو نہیں ہوگا“- میں نے

کہا : ''ہرگز نہیں'' ۔ سفیر صاحب نے بھی تائید کی ۔
بابا جان نے وہ گٹھڑی کھولی اور فرمایا : ''میں آپ کے لئے تاجیکی پلاؤ پکوا کر لایا ہوں'' یہ بابا جان کا انداز خلوص و محبت تھا ۔ ہم سب نے بڑے لطف کے ساتھ تاجیکی پلاؤ کھایا ۔ بابا جان کو کیلے بڑے مرغوب تھے ۔ سفیر صاحب کے ہاں شاید امریکی کیلے تھے ۔ بابا جان نے صرف دو کیلے نوش جان کئے ۔ ذرا سی مٹھاس بھی کھائی ۔ کھانے کے بعد ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ میں بابا جان کے لئے ھدایا لایا تھا ۔ ایک سوٹ کا کپڑا ان میں شامل تھا ۔ یہ میں نے جناب سفیر صاحب کی موجودگی میں ان کو پیش کردئے ۔ اس طرح یہ تقریب بہت اچھی ہوگئی ۔

باغ عینی میں جب مزار بابا جان پر ان کی اھلیہ ملیں تو میں نے اپنے ھاتھ پر بندھی ہوئی وہ گھڑی ان کو دکھائی کہ جو ان کے شوھر نے مجھے کوئی چار پانچ سال ہوئے دی تھی ۔ وہ پاکستان کے سرکاری دورے پر تھے اور حکومت پاکستان ان کی میز بان تھی ۔ کراچی میں درحقیقت میں ان کا میز بان تھا ۔ میں نے اسلام آباد میں بھی ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ مرتب کیا تھا ۔ یہ وہ موقع تھا کہ وھاں سائنٹی فک سوسائٹی پاکستان کا جلسہ تھا ۔ بابا جان نے بھی اس میں شرکت کی تھی ۔ میں نے لاہور میں بھی دفتر ھمدرد کو بابا جان کے لئے مستعد کر دیا تھا ۔

خسرو کمیٹی میں شرکت

امیر خسروئے دھلوی سے بابا جان کو بڑا خصوصی تعلق



حکیم محمد سعید اکیڈیمیشین بابا جان
غفوروف کے مزار پر، ان کی اہلیہ
اور بہن اور دوسرے مندوبین کے
ساتھ۔

مزار اکیڈیمیشین بابا جان غفوروف
(تاجیکستان)۔



تھا - پاکستان میں جشن خسرو کے لئے **ایک** نیشنل کمیٹی کی تشکیل ہوئی تھی - اس میں اراکین وہ تھے کہ جن کو حضرت امیر خسرو دہلوی سے دور دور کا کوئی واسطہ نہ تھا - بس کمیٹی ان لوگوں سے مرتب ہوئی تھی کہ جو پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے تھے - حیرت ہے اس کمیٹی میں پروفیسر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی **تک** نہ تھے اور تعجب ہے کہ اس کمیٹی میں پروفیسر وحید مرزا صاحب بھی نہ تھے جو امیر خسرو پر **ایک** بہترین کتاب کے مصنف کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں اور یہ کہ پاکستان میں امیر خسرو دہلوی پر ان سے زیادہ کوئی اتھارٹی نہیں ہے - اس کمیٹی میں میرا وجود کیوں ہوتا - باباجان نے پوچھا : ”آپ کیوں اس کمیٹی میں نہیں ہیں ؟“

میں ان کو کیا جواب دیتا - میں نے احتیاط سے بات کو ختم کردیا مگر مجھے بعد میں پتہ چلا کہ باباجان نے جب وزیر اعظم پاکستان سے ملاقات کی تو ان پر زور دیا کہ خسرو کمیٹی میں حکیم محمد سعید کو رکھا جانا چاہئے - چنانچہ بعد میں کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور میرا نام شامل تو کرلیا گیا، مگر ہوا یہ کہ اس کمیٹی کے کسی جلسے میں مجھے نہیں بلایا گیا اور نہ ہی مجھے کسی جلسے کا دعوت نامہ ملا - سنا ہے کہ اس جشن خسرو پر کوئی ستائیس اٹھائیس لاکھ روپے خرچ ہوئے اور کتابیں جو چھپیں، وہ اس درجہ غلط تھیں کہ آج **تک** پریس میں پڑی ہیں -

پھر اس بین الاقوامی کنگرس کے انتظام کا حال یہ تھا کہ روسی وفد آکر کراچی میں پڑگیا - اس کا کوئی سواگت کرنے والا نہ تھا - فرینڈشپ ہاؤس کے مسٹر شن شین نے مجھ سے رابطہ

قائم کیا اور میں ہوائی میدان گیا ۔ وفد کا استقبال کیا ۔ اس کو ٹھیرایا اور میں نے ہمدرد فاؤنڈ یشن کے مہمان کی حیثیت سے آسے اسلام آباد روانہ کیا ۔

اس کنگرس کے آخری اجلاس میں ایک دانش ور بزرگ و پیر نے یہ گوہر افشانی کی — امیر خسرو شاعر ہی کب تھا ۔ اس نے فارسی کے چند اشعار کہے اور وہ بھی غلط ۔ امیر خسرو تو شاہوں کی خوشامد کرتا تھا ۔

اس گوہر افشانی پر فیض احمد فیض جیسے سخت شاعر بھی جلسے سے اٹھ کر چلے گئے ۔ اس وقت کے سفیر ایران نے مجھ سے کہا کہ امیر خسرو کی آپ کے ہاں بس یہ قدر ہے جو آج شام ہوئی ہے ۔ میں سخت شرمندہ ہوا اور شرمسار بھی ۔

روس میں با با جان غفوروف کے زیر اہتمام دوشنبہ اور ماسکو میں جشن امیر خسروئے دہلوی منایا گیا ۔ میں اس میں شریک ہوا تھا ۔ با با جان نے مجھے یہ اعزاز دیا تھا کہ جب اختتامی اجلاس ماسکو کی انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈ یز میں ہورہا تھا تو مجھے انہوں نے اپنے ساتھ اسٹیج پر جگہ دی اور اصرار کیا کہ میں اختتامی تقریر کروں ۔ پاکستان میں جشن خسرو میں میرے ساتھ سلوک یہ ہوا کہ کنگرس میں مدعو نہیں کیا گیا ۔ روس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ نہ صرف مجھے دعوت دے کر بلایا بلکہ جشن خسرو کا اختتام بھی مجھ سے کرایا ۔ اس تقریب میں سفیر پاکستان جناب سجاد حیدر صاحب بھی موجود تھے ۔

پاکستان میں یہ ستائیس اٹھائیس لاکھ رپے کس مد میں خرچ ہوئے ؟ ۔ امیر خسرو کو ایک گویا بنانے پر !

رسم نقاب کشائی مجسمۂ عینی

مہمان خانۂ دوشنبہ سے ہمارا قافلہ روانہ ہوا اور ہم مجسمۂ عینی جہاں استادہ ہے، وہاں پہنچ گئے ۔ دور سے دیکھا کہ ایک بلند و بالا مجسمہ مشرق کی ایک پردہ نشین خاتون کی طرح برقع اوڑھے کھڑا ہے ۔ چاروں طرف ہزاروں افراد کھڑے ہیں۔ ٹیلے وژن کے کیمرے اپنی آنکھیں کھولے چاروں طرف لگے ہوئے ہیں ۔ ہم کو مجسمے کے قریب لے جایا گیا ۔ یہاں محترم جناب اکیڈیمیشین محمد عاصموف صاحب موجود تھے ۔ انہوں نے میرا تعارف کرایا ۔ سب سے پہلے جناب بنی یوف صاحب سے ملاقات ہوئی کہ جو وزیر اعظم تاجیکستان ہیں ۔ وہ پر جوش انداز سے ملے ۔ اس کے بعد رئیس جمہوریۂ تاجیکستان سے شرف ملاقات حاصل ہوا ۔ فوٹوگرافروں نے میری اس ملاقات کو گرفت میں لے لیا ۔ اس کے بعد دوسرے اراکین پارٹی سے ملاقاتیں ہوئیں ۔

جب ہم اس میدان میں مجسمے کے قریب گئے تو دو رویہ بچے گل دستے ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے اور وہ بدستور کھڑے رہے ۔ رئیس جمہوریہ نے خطاب کیا اور اس کے بعد انہوں نے ایک رسی کھینچ کر مجسمے کا برقع اتار دیا ۔ سارا مجمع گونج اٹھا ۔ تالیاں بجیں کہ رکنے کا نام نہ لیتی تھیں ۔ اس کے فوراً بعد بچیاں پھیل گئیں اور تمام مندوبین کے ہاتھوں میں انہوں نے گل دستے دے دئے ۔ سب سے پہلے صدر جمہوریۂ تاجیکستان نے پھول چڑھائے ۔ اس کے بعد مندوبین نے پھول نذر کئے ۔ میں بھی ان میں شامل تھا ۔ بعد میں جناب عاصموف صاحب اور دوسرے حضرات نے خطاب کیا ۔

مجموعی طور پر یہ تقریب بڑی پر شکوہ تھی۔ تنظیم انتہا کی تھی۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ مسرت کی ایک بدیہی وجہ یہ تھی کہ ایک عالم کو اس کا صحیح مقام ملا۔ علم کی قدر دانی ہوئی اور اس راہ میں مذہب و دین کا کوئی تعصب کار فرما نہ تھا۔ میں اس کو عظمت فکر کہتا ہوں اور حسن عمل بھی۔

جلسۂ افتتاحیہ

تین بجے سہ پہر عینی ہال میں جلسۂ افتتاحیہ برپا ہوا۔ اس میں تمام عمائدین حکومت و شہر نے شرکت کی۔ رئیس جمہوریۂ تاجیکستان، وزیر اعظم بنی یوف اور دوسرے اراکین پارٹی شریک تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ عمائدین اور مندوبین کو اسٹیج پر بٹھایا گیا تھا۔ دعوت نامہ جو ملا تھا، اس میں قطار اور کرسی کا نمبر دیا ہوا تھا۔ ٹھیک اسی قرینے سے کرسیاں رکھی تھیں۔ مجھے محترم محمد عاصموف صاحب نے اپنے ساتھ لیا اور مجھے میری جگہ لا کر بٹھا دیا۔ اگلی قطار میں عمائدین تھے۔ ان میں سفیر ہند بھی تھے اور ہمارے فیض احمد فیض بھی۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے اطمینان تھا کہ پاکستان صف اول میں ہے۔ خود عاصموف اگرچہ منتظم اعلا تھے اور تاجیکستان اکیڈمی آف سائنسز کے صدر اور عینی کے جانشین، مگر وہ خود دوسری قطار میں تھے۔ میں نے ان کو ہمیشہ بہت کم گو اور گوشہ نشین پایا ہے۔ سادہ دل انسان ہیں، شہرت سے گریزاں۔ میں تیسری صف میں ہوں، سردار علی جعفری صاحب ٹھیک میرے آگے دوسری صف میں، عاصموف صاحب کے پہلو میں۔

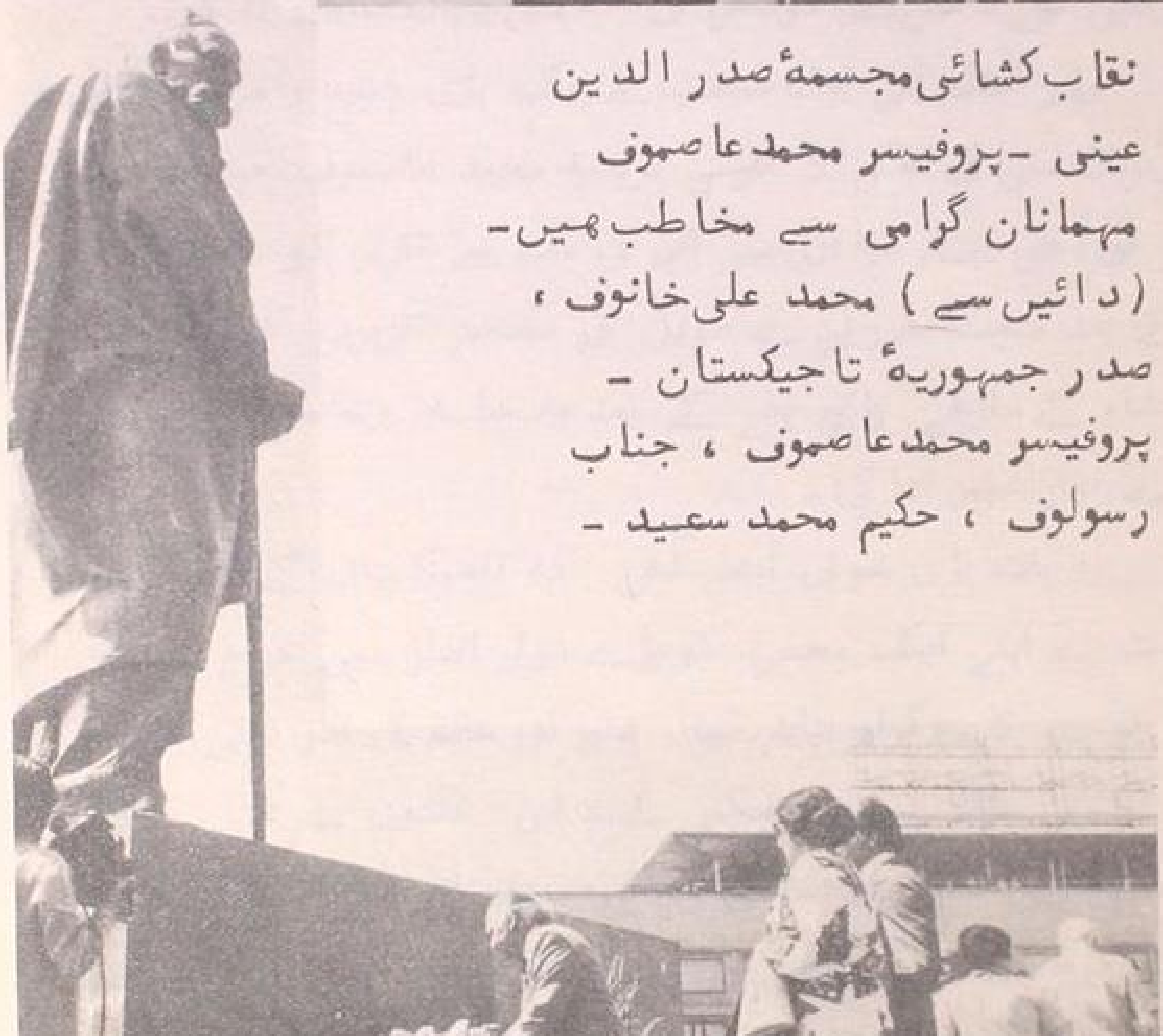
عینی کے بارے میں متعدد مقررین نے اس تقریب میں



نقاب کشائی مجسمۂ عینی و گورکی کے وقت افتتاحی تقریر بعض مندوبین کی موجودگی میں
کی جا رہی ہے -



نقاب کشائی مجسمۂ صدر الدین
عینی - پروفیسر محمد عاصموف
مہمانان گرامی سے مخاطب ہیں۔
(دائیں سے) محمد علی خانوف،
صدر جمہوریۂ تاجیکستان -
پروفیسر محمد عاصموف، جناب
رسولوف، حکیم محمد سعید -



مجسمۂ صدر الدین عینی - جناب
فیض احمد فیض گل ہائے عقیدت
پیش کر رہے ہیں -

حصه لیا - خود رئیس جمہوریه اسٹیج پر تھے - سب سے پہلے ان هی کی تقریر تھی - انھوں نے مقاصد جشن صد ساله عینی پر روشنی ڈالی اور غیر ملکی مندوبین اور ملکی مندوبین کا استقبال کیا - اس تعارف میں سب سے زیادہ تالیاں چیکو سلوواکیا اور ترکی کے مندوب پر بجائی گئیں - میرا نام بھی لیا گیا اور میں احتراماً کھڑا ہو گیا - تالیاں بجیں - ویسے تو پاکستان کے تعارف کے لئے محترمی فیض احمد فیض کافی تھے - میں نے کوشش کی که میں یہاں نمایاں نه ہوں -

وزیر اعظم بنی یوف صاحب نے ایک بڑی جامع و مرصع تقریر روسی زبان میں کی جس کا فارسی ترجمه محمد عاصموف صاحب نے مجھے فوراً هی دے دیا اور میں اس کی مدد سے تقریر کو سمجھ سکا - اس کے بعد متعدد مقررین نے طویل اور مختصر تقریریں کیں اور اس طرح شام کے ساڑھے پانچ بجے کے بعد یه جلسه برخاست ہوا - اور میں نے نماز عصر ادا کی -

یه بات بڑی خوش آیند تھی که تاجیکستان کے عوام اور حکومت نے اپنے ایک محسن کو بڑے موثر انداز میں خراج عقیدت پیش کرنے کا پروگرام بنایا تھا - علم اور عالم کی قدر دانی کی یه ایک بہترین مثال کہی جا سکتی هے - ابن خلدون نے اپنے تاریخ ساز مقدمه میں لکھا هے که جو معاشره علم اور اپنے عالم کی قدر و منزلت کرتا هے اس کی ترقی میں کوئی امر مانع نہیں آسکتا - اس مقدمه کے بارے میں دنیا بھر کے علما کی رائے هے که اس سے زیادہ موثر باتیں کسی بھی دور میں نہیں کہی گئی هیں - شہرۂ آفاق مفکر و مصنف ٹوئن بی نے بھی یہی قول فیصل دیا هے - میں جب سال گزشته ماه اکتوبر میں عراق کے صدر مقام بغداد میں ٹوئن بی

عالمی کانفرنس کے پہلے اجلاس میں پہلی تقریر کررہا تھا تو میں نے اہل بغداد کو بتایا تھا کہ ابن خلدون کے بارے میں عالمی رائے کیا ھے اور خود ٹوئن بی نے، جس کی یاد میں یہ جلسہ بغداد میں برپا ھوا ھے، کیا کہا تھا ۔ بغداد میں میرے اس خطاب کو بے حد پسند کیا گیا۔ ریڈیو اور ٹیلے وژن نے اسے نشر کیا اور بغداد کے سارے ھی اخبارات نے اسے شائع کیا۔ میرے خطاب میں بڑی صاف باتیں تھیں اور میں نے بڑے خلوص و انس کے ساتھ اہل بغداد کو اپنے ماضی میں لے جانے کی کام یاب کوشش کی تھی ۔ بغداد یونیورسٹی کے سابق شیخ الجامعہ نے مجھے گلے لگالیا اور بہت سے علما نے چوم لیا اور نوجوان طلبہ نے گھیر لیا ۔ ریڈیو بغداد کے نگران اردو نشریات نے کہا : آپ نے بغداد میں آگ لگادی ھے۔ سفیر پاکستان نے ٹیلے وژن پر مجھے سنا اور آن سے بھی زبردست داد وصول کی ۔

تاجیکستان بڑا علم نواز خطۂ ایشیا ھے۔ اہل علم شب و روز فروغ علم کے لئے مصروف عمل رہتے ھیں ۔ یہاں کی مطبوعات کا ، جن کا ذکر میں پہلے ھی کرچکا ھوں، معیار کافی بلند ھے ۔ جشن عینی کے موقع پر جو کتابیں چھپی ھیں وہ بڑی قابل قدر ھیں ۔ تحقیقی کام کا سلسلہ برابر جاری ھے ۔ اکیڈمی آف سائنسز اور اس کے تحت علوم مشرقی کا ادارہ قابل قدر خدمات انجام دے رہا ھے ۔ علماۂ علمی تحقیقات میں برابر مشغول ھیں۔ نئی نئی مطبوعات عالم وجود میں آرھی ھیں ۔ تاجیکستان کی اکیڈمی آف سائنسز کے سربراہ مرزا ترسون زادہ تھے، جن کی علمیت اور عالمانہ کاوشوں کے سب معترف ھیں ۔ عموماً عینی کے ساتھ ساتھ ان کا نام لیا جاتا ھے ۔ بہت سے علمی ادبی کاموں میں ان کا اشتراک عمل قابل تحسین ھے ۔

مرزا ترسون زادہ تاجیکستان کے عظیم شاعر تھے ۔ وہ ۱۹۱۱ء میں ریاست کے ایک گاؤں کراتاگ میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے روائتی انداز میں دستکاروں، ظروف سازوں، پارچہ بافوں اور چرم سازوں کے کارھائے نمایاں کے لئے مشہور رہے ۔ اس عظیم شاعر کے والد بزرگوار بھی ایک دستکار تھے۔ نام کے پہلے لفظ ''مرزا'' کا تلفظ تاجیک زبان میں ''مرزو'' کیا جاتا ھے جس کے لغوی معنی ''مصنف'' لئے جاتے ھیں ۔ اس صدی کے شروع میں تاجیکستان کی آبادی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت ھی کم تھی ۔ اس لئے ہر خواندہ شخص کو مصنف یا قلم کار سمجھ لیا جاتا تھا اور یہ اس کے لئے بڑا اعزاز تھا ۔ ترسون زادہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت روس کے اس پہلے اقامتی اسکول میں ہوئی جو حکومت نے تاجیکستان میں موجودہ صدی شروع ہوتے ھی قائم کیا تھا ۔ عہد طفولیت ھی میں ترسون زادہ کو شعر و شاعری کا شوق ھوگیا ۔ چنانچہ فخریہ انداز میں وہ کہتے تھے کہ رودکی، حافظ اور بیدل میرے اولین اساتذہ میں شامل تھے ۔ مشرقی شاعری کی دیرینہ روایات پر پوری طرح عبور حاصل کرنے کے بعد ترسون زادہ نے تقاضائے وقت کے مطابق اپنے کلام میں جدید طرز فکر اور نئے انداز بیان کا اضافہ کیا ۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے ان کی زندگی ھی میں چھپے تھے ۔ ایک مجموعہ کا نام تھا ''گنگا سے کریملن تک'' جس میں برصغیر کی جدوجہد آزادی پر روشنی ڈالی گئی ھے اور اس کے ساتھ ھی بتایا ھے کہ لینن کے افکار و خیالات نے اس ملک کو نئی زندگی دینے کے لئے کیا کردار ادا کیا تھا ۔

مرزا ترسون زادہ عوام میں بے حد مقبول تھے ۔ انہیں اشتراکی نظام کا ہیرو سمجھ کر لینن انعام دیا گیا۔ اور جب انہوں نے افریقی ایشیائی ملکوں کے استحکام اور سالمیت کے لئے اعلیٰ خدمات انجام دیں تو جمال عبدالناصر اور جواہر لال نہرو انعامات سے نوازا گیا ۔ افسوس ہے کہ وہ وقت سے پہلے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

کنسرٹ

مذکورہ بالا جلسۂ افتتاحیہ کے اختتام پر چائے نوشی کا انتظام تھا ۔ ایک خاص قسم کا پانی جو ''شاہ عنبر'' کہلاتا ہے، بہ کثرت موجود تھا ۔ یہاں ہر قسم کے اجتماعات میں شاہ عنبر ھی کی سر بند بوتلیں ملتی ھیں۔ یہ منرل واٹر ہے اور بہت ھی مرغوب مشروبات میں شامل ہے ۔ شاہ عنبر ایک مقام کا نام ہے جہاں نکلنے والے ایک چشمے کا پانی بوتلوں میں بھر کر سر بہ مہر کردیا جاتا ہے۔ ھوا زدگی (ایرو نیشن) سے اس کی قوت ھضم کو بڑھادیا گیا ہے۔

چائے پانی کے شغل کے دوران میں کنسرٹ کے لئے اسٹیج تیار کر لیا گیا۔ ھم سب بڑے ھال میں پھنچ گئے۔ تا کہ کام و دھن کی لذت کے بعد افزائش روح کا موقع بھی مل جائے ۔ میں نے بہت حیرت کے ساتھ اس بات پر غور کیا کہ ھند ستانی مندوبین اپنی تھکن کا عذر پیش کر کے محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔ کنسرٹ سے مجھے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے لیکن ھم جلیسی کو میں اھمیت دیتا ھوں ۔ چنانچہ میں نے آخر وقت تک اس میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا ۔ صرف اس وقت کہ جب عبداللہ جان غفاروف نے چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے تعمیل کی ۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ آٹھ



دوشنبہ ، تاجیکستان میں پروفیسر عبداللہ جان غفاروف اور حکیم محمد سعید ان شوفر کے ساتھ جو کنگرس عالمی صدر الدین عینی کے دوران ان کی موٹر کار چلاتے رہے -

بجے ڈنر ہے اور وہاں وقت کی پابندی کرنی ہے۔ محفل کے سب لوگ اس عشائیہ کے لئے مدعو نہیں تھے۔ صرف مندوبین کو جانا تھا۔

جملہ مندوبین باغ شہر سرکاری میں مقیم تھے۔ اس کے وسیع ہال میں ڈنر کا اہتمام تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک شاہی انداز کی ضیافت ہے۔ کیا انتظامات تھے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ رئیس اور وزیر سب ہی شریک تھے۔ کم سے کم پانچ سو مہمان تھے۔ کھانا متنوع تھا اور بکثرت تھا۔ یعنی اسے ایک ہزار آدمی سیر ہوکر کھا سکتے تھے۔ شاہ عنبر کے ساتھ ہمہ قسم کی شرابیں بھی تھیں۔ وائن، وھسکی، شمپین اور ووڈکا۔ آخر الذکر روس کی خاص شراب سمجھی جاتی ہے۔ محفل میں جس کثرت سے شراب رکھی گئی تھی، اسی کثرت سے پینے والے بھی موجود تھے۔ شاید ایک میں ہی دوسروں کے خیال کے مطابق ''بدذوق،، تھا جو اس ''نعمت،، سے محروم تھا۔ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ افغانستان کے امین صاحب نے فرمایا: ''آپ بڑے ہی متقی ہیں۔ نہ جانے وہ داد دے رہے تھے یا طنز کر رہے تھے۔

انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ماسکو کے ڈاکٹر غضنفر علی یف نے، جو میرے پرانے دوست ہیں، مجھے بتایا کہ جو کباب دسترخوان پر آئے ہیں، وہ گھوڑے کے گوشت کے ہیں۔ مجھے ایک لمحے کے لئے کچھ کراہیت سی محسوس ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اسے کھانے کا فیصلہ کر لیا۔ بہر نوع شافعی عقیدے کے مطابق گھوڑے کا گوشت حرام نہیں ہے۔ میں

نے سوچا کہ آج اسے کھا کر ذائقہ معلوم کر لو۔ یہ موقع شاید زندگی میں پھر نہ آئے۔ تجربہ برا نہیں رہا۔

مجھے غازی صلاح الدین ایوبی کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ انھیں اپنے ایک خاص نسل کے گھوڑے سے بڑا عشق تھا۔ ایک شب ان کا کوئی عزیز از جان دوست آیا اور کباب کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اپنے عزیز دوست کے لئے غازی اپنی عزیز ترین شے ھی قربان کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنا عزیز از جان گھوڑا ذبح کرادیا اور اس کے گوشت کے کباب تیار کرا کے دوست کی تواضح کا سامان کردیا۔ دوست کا احترام کرنے کی یہ عمدہ مثال ھے۔ میں نے خیال کیا کہ شاید ادارۂ علوم شرقیہ نے بھی اپنا کوئی عزیز گھوڑا ذبح کیا ہو گا۔ میں نے کباب چکھ لینے پر اکتفا کی۔ وہ یقیناً لذیذ تھے، لیکن طبیعت پر اثر پڑا۔

عینی کی ایک کتاب

کنگرس کی طرف سے ھدیہ کے طور پر ھمیں عینی پر ایک نفیس کتاب ملی جو بڑی نفاست اور اھتمام کے ساتھ طبع کی گئی تھی۔ اسے مرتب کرنے والے خود صدر الدین عینی کے صاحبزادے کمال عینی تھے جنھیں پروفیسر محمد عاصموف صاحب کا پورا تعاون حاصل تھا۔ ان کا لکھا ھوا انگریزی زبان میں پیش لفظ بھی شامل اوراق ھے۔ کتاب بڑی جامع ھے اور بے شمار تصاویر سے مزین ھے۔ کاش یہ انگریزی یا فارسی زبان میں ھوتی۔ دیباچہ کمال عینی نے لکھا ھے جو انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں ھے۔ لیکن تصاویر کی کیپشن صرف روسی زبان میں ھیں۔ اگر انھیں بھی فارسی میں لکھا جاتا تو تصاویر کی نوعیت اچھی طرح

سمجھ میں آتی اور میں ساری کتاب سے استفادہ کرسکتا ۔ میں نے کتاب کے شروع میں خالی صفحات پر تمام مندوبین کے دستخط لینے کی مہم شروع کردی ۔ رئیس جمہوریہ اور وزیر اعظم بنی یوف وغیرہ سے لے کر ہر مندوب نے دستخط کر دیئے ۔ اس طرح اس جلسہ کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ۔

رات ساڑھے دس بجے میں واپس مہمان خانے میں آ گیا اور کتاب کو اچھی طرح دیکھنا شروع کردیا ۔ انگریزی زبان میں لکھا ہوا عاصموف صاحب کا پیش لفظ بھی پڑھ ڈالا ۔ میں نے صدرالدین کے بارے میں کافی مطالعہ کرلیا تھا اور اسی مطالعے کی بنیاد پر اپنا مقالہ تیار کیا تھا لیکن اس پیش لفظ نے میری معلومات میں مزید اضافہ کیا اور مجھ کو متاثر بھی کیا ۔

صدرالدین عینی

فارسی تاجیکی ادب عالیہ نے دری (قدیم فارسی) زبان میں فروغ پایا ۔ اس ادب عالیہ کے نام لیوا سوویت تاجیکستان کے مصنفین ہیں ۔ گذشتہ ایک ہزار سال سے زیادہ مدت میں اس علاقے کی قیمتی فنی روایات نے اتنی ترقی کی کہ ممالک شرقیہ میں رہنے والی قوموں نے اپنی ثقافت کو ان سے مالا مال کرلیا اور اس کا اثر مغربی ادب تک جا پہنچا ۔ سب جانتے ہیں کہ عظیم اطالوی شاعر گوئٹے فارسی تاجیکی ادب عالیہ کا سب سے بڑا قدر دان تھا ۔ اس نے اس کا صرف مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اس سے پوری طرح استفادہ کرتے ہوئے اپنے خیالات میں رنگ بھی بھرا ۔ اس ضمن میں اور بھی مغربی مصنفین کے نام لئے جاسکتے ہیں ۔ ان کی نگارشات عالمی ادب کے خزانے کی قدر و منزلت بڑھاتی ہے ۔

صدر الدین عینی نے اپنے ثقافتی ورثے کی روایات کا محض سلسلہ جاری رکھنے ہی میں اعانت نہیں کی بلکہ اس میں نئی زندگی کی روح پھونک کر اسے چار چاند لگا دیئے۔ اس کے معمولی کاشتکار باپ کی دلی تمنا یہی تھی کہ اس کا ہونہار بیٹا عالم و فاضل ہوکر دنیا میں نام پیدا کرے اور وہ ابنائے وطن میں کسی طرح بلند مقام حاصل کرلے۔ چنانچہ وہ اپنے زمانۂ طفولیت ہی سے ان روایات کا قدردان ہوگیا۔ محض ایک معمولی باپ کے بیٹے کی حیثیت سے وہ جب عوامی تہواروں میں شریک ہوتا اور لوک گیت سنتا تو اس کے دل میں ایک آمنگ پیدا ہوتی کہ وہ خود بھی شاعر بنے اور بہتر گیت ترتیب دے۔ وہ بارہ سال کی عمر میں یتیم ہوگیا اور زندگی بسر کرنے کا کوئی قریبی سہارا باقی نہ رہا تو وہ اپنے وطن مالوف کو خیر باد کہہ کر بخارا چلا گیا جو ان دنوں جملہ علوم و فنون کا مرکز تھا اور جہاں علم و ادب کی تلاش میں سرگرداں رہنے والوں کی ہمت افزائی عوام کی طرف سے کی جاتی تھی۔ امیر مملکت کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

ذوق و شوق کی فراوانی نے بہت جلد عینی میں خوشہ چینی کی صلاحیت پیدا کردی۔ وہ غزلیں اور نغمے لکھنے لگا۔ پھر جدت طرازی نے نئی راہ عمل دکھائی اور اس کے کلام میں انفرادیت پیدا ہوتی گئی، جس پر ہر طرف سے خراج تحسین ملنے لگا۔ ارباب علم نے بھی اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو سمجھ لیا تھا۔ اسی دوران میں عینی کو احمد دانش کی قابل قدر تصنیف ”نوادر الوقائع“ دیکھنے کا موقع ملا جس میں امیر بخارا کے

ظلم و ستم کو اور مذموم طریق کار کو بے نقاب کیا گیا تھا۔ اس مطالعہ سے عینی نے پہلی بار اپنے دل و دماغ میں روحانی انقلاب کو فروغ دینے کا سلیقہ پالیا اور وہ ایک نئی راہ عمل پر چل پڑا۔

اس نے خیال ظاہر کیا کہ نئی کتب نصاب کی ترتیب اس انداز سے کی جائے کہ نئی نسل کے نوجوان اپنے مذہب سے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاست کو پوری طرح سمجھنے کے لائق ہوجائیں۔ پھر روس میں اکتوبر کا عظیم اشترا کی انقلاب رونما ہوا تو گویا عینی کی مراد بر آگئی۔ اس نے بلا تامل اس تغیر کو لبیک کہا اور اسے فروغ دینے میں برابر کا شریک ہوگیا۔ اس وقت وہ سرکاری موقف کے بموجب باغیانہ سرکشی کی پاداش میں جیل کے اندر بند تھا۔ نئے انقلاب نے نہ صرف اجتماعی طور پر ساری قوم کو بلکہ انفرادی طور پر اسے آزادی دے دی اور وہ کھل کر سامنے آگیا۔ جیل میں روا رکھے جانے والے غیر آئینی تشدد نے جو بد نما داغ اس کے جسم پر چھوڑے تھے، وہ آخر عمر تک برقرار رہے۔ یہ ذاتی تلخ تجربات بھی اس سے ساری عمر شعلہ نوائی کراتے رہے۔

انقلاب کے بعد روسی ادب سے عمیق اثرات حاصل کرنے کا موقع ملا، جنکی جھلک عینی کی بعد کی تحریروں میں نمایاں رہی اور جس نے دنیا کے عظیم مصنفین کی صف میں اسے لا کھڑا کیا۔ اس نے اپنے خیالات کو سب سے زیادہ میکسم گورکی سے ہم آہنگ کیا اور اس نے تلوار کی دھار سے زیادہ قلم کی روانی کو کارگر سمجھ لیا۔ اس نے زور دیا کہ زبان سے نکلے ہوئے یا قلم سے

لکھے ہوئے الفاظ کی کاٹ تیر و نشتر کی جراحت سے زیادہ سریع الاثر اور دور رس ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے تاجیکی صحافت کی صحیح خطوط پر داغ بیل ڈالی اور قومی اخبارات کو آزاد خیالی کی راہ پر چلنے کی تلقین کی جس میں وہ خاطر خواہ کامیاب رہا۔ اس کی کوئی کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

خود اس کے منظوم و منثور رشحات قلم نے ایسے نقوش کا پرچم بلند کیا۔ اس کی تمام تصانیف میں یہی ایک جذبہ کارفرما رہا ہے۔ اس نے انہایت پرجوش الفاظ میں غریب عوام کو اپنی حقیقت اور قدر و قیمت سمجھنے اور اپنے پندار کو رفعت دینے کا سبق دیا۔ اس کی یہ سعی و کاوش کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی، جس کے ذریعہ سے اس نے، اپنے درد دل کو عوام پر مسلط کر کے، انہیں ایک لمحۂ فکر دیا تھا۔

اس کے ناولوں کے کردار جیتے جاگتے انسان ہوتے تھے اور انہیں پڑھنے والا اپنے حالات کی جھلک ان میں پا کر سمجھتا کہ خود اس کے خیالات کی ترجمانی عینی نے اپنے الفاظ میں کی ہے۔ اس طرز پر لکھنے والے جلال اکرامی اور رحیم جلیل وغیرہ اس کے ہم عصر تھے لیکن درجۂ کمال کی جاذبیت، جو عینی نے اپنی تحریروں میں پیدا کی، وہ کسی کو نصیب نہ ہوسکی۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی۔ عینی نے وفور جذبات کے تحت ہر بات دل کی گہرائی سے نکال کر خون دل سے گرما کر اپنی معجز بیانی سے کام لے کر صفحۂ قرطاس پر رکھ دی تھی۔ اس اعتبار سے کوئی بھی اس کا مد مقابل نہ ہوسکا۔ وہ اپنی انفرادیت کا رنگ دے کر جریدۂ عالم پر اپنا نقش دوام ثبت کر گیا۔

ہر گزرنے والے دن کے ساتھ اس کی مقبولیت بڑھتی جارہی ہے۔ حال ہی میں اس کی نگارشات کا ایک مکمل مجموعہ پندرہ جلدوں میں شائع ہوا ہے جسے صد سالہ تقریبات کے پروگرام کا سب، سے اہم جزو بنا دیا گیا ہے۔ یہ اس کی قدر و منزلت کا ایک مناسب اعتراف ہے۔

یہ نوٹ لکھکر میں ایک بجے شب سوگیا اور صبح اٹھا تو کلینڈر پر نظر پڑی۔ یہ دیکھکر حیران رہ گیا کہ اتوار کا دن ہے۔ گویا پرسوں جمعہ گزر گیا تھا اور جمعہ کی نماز کا خیال تک نہ آیا تھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ اپنی ڈائری میں بھول کر غلط دن لکھ دیا۔ جس دن ہم ماسکو سے روانہ ہوئے، وہ جمعہ ہی تھا۔ نماز جمعہ ہوائی جہاز میں کیسے پڑھی جاتی۔ روانگی کے وقت خیال تھا کہ ہم وقت پر پہنچ گئے تو میں جمعہ کی نماز دوشنبہ کی کسی مسجد میں ادا کرونگا۔

نوریک کی سیر

اب نوریک کی سیر کا پروگرام تھا۔ میرے لئے یہ سیر نئی نہیں تھی۔ میں ایک بار پہلے یہاں آچکا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس علاقے کو دوبارہ دیکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ فیض احمد فیض صاحب اور سردار جعفری صاحب دونوں اپنے بستروں میں دبک گئے۔ یہ دونوں کل کے پروگرام کے بعد تھکن محسوس کر رہے تھے۔ موسم کم از کم میرے لئے بڑا شاندار تھا۔ کل تمام دن بڑی گرمی رہی تھی اور آج موسم بدلا ہوا تھا۔ کل عاصموف صاحب نے پوچھ ہی لیا تھا کہ ”آپ کو گرمی تو نہیں

لگ رہی" - میں نے جواب دیا : "میں سرد و گرم چشیدہ ہوں ، آپ پروا نہ کریں !"

شب گزشتہ جب ہم ڈنر سے فراغت پا کر واپس آرہے تھے تو سفیر ہند نے اصرار کیا کہ ماسکو میں ضرور میرے ہاں کھانے پر آئیے گا - آپ سے باتیں ہونگی - سفیر صاحب اندرا حکوت میں وزیر رہ چکے تھے - وہاں یہ ہندستان کی غالب اکیڈمی کے صدر بھی تھے - اس لئے میرے بڑے بھائی جناب حکیم حاجی عبدالحمید سے قریب تھے - غالب اکیڈمی کے بارے میں بھائی جان محترم اور حکومت ہند میں اختلاف ہوگیا تھا - بھائی جان غالب اکیڈمی قائم کرچکے تھے - حکومت ہند اسے روکنا چاہتی تھی - بھائی جان نے پہل کردی - رات دن میں عمارت تعمیر کرادی اور جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ، صدر جمہوریۂ ہند سے اس کا افتتاح بھی کرادیا - سرکاری اکیڈمی منہ دیکھتی رہ گئی -

رات سے جو بارش ہورہی تھی ، اس کا سلسلہ صبح تک جاری رہا - اس طرح موسم قدرے سرد ہوگیا تھا - سب تیاری مکمل ہوگئی تو دس بجے دو شنبہ سے نوریک روانہ ہوگئے - سات آٹھ موٹریں تھیں - آگے آگے موٹر ہائی وے انسپکشن کی کار تھی جس کا کام حفاظتی اقدامات تھا - اس کار کے گزرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دوسری تمام گاڑیاں جو سڑک پر چل رہی ہیں ، ایک طرف ہوکر رک جائیں بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہاں فائر بریگیڈ کے انجن کے گزرتے وقت ٹریفک رک جاتا ہے - یہاں نوعیت ذرا مختلف تھی - یہ تنظیم اور احترام قانون کی بد یہی علامت ہے -

میں نے روانگی سے قبل احتیاطاً اپنا اوور کوٹ لے لیا تھا۔ یہ بہت مناسب تھا۔ بارش میں میرا اوور کوٹ برساتی کا کام دیتا ھے اور سردی میں گرم رکھتا ھے۔ اگر یہ کوٹ ساتھ نہ ہوتا تو کم سے کم ماسکو میں قلفی جم جاتی۔

پچھلی بار میں نے دیکھا تھا کہ دوشنبہ میں دنیا کا ایک بڑا ڈیم تیار ہو رہا ھے۔ گزشتہ دو سال میں یہ اب تکمیل کی منزل تک پہنچ جانے کے قریب تھا۔ اس ڈیم سے تاجیکستان کے علاوہ دوسری ریاستوں کو بھی بجلی فراہم ہوسکے گی۔ اس سے مقامی اقتصادی بحالی میں بڑی مدد ملیگی۔ یہ کام بڑا قابل قدر ھے۔

دوشنبہ سے نوریک تک کا راستہ بڑا ھی خوبصورت ھے اور خود نوریک کا تو کیا کہنا۔ یہ تاجیکستان کا ایک ایسا قصبہ ھے جس کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر شاید ھی کوئی شخص اس کی تعریف کئے بغیر رہ سکے۔ وہ ہر موسم میں کسی نہ کسی اعتبار سے اپنی دل آویزی کا سکہ زائرین پر بٹھا دیتا ھے۔ تاجیکستان کے صدر مقام دوشنبہ سے یہ صرف اڑسٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر ایک اونچے پہاڑ کے دامن میں دریائے رخش کے کنارے واقع ھے۔ ایسا معلوم ہوتا ھے کہ خود قدرت نے بڑی سعی و کاوش سے پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع وادی میں ایک بے مثل مقام اس کے لئے پسند کیا ھے۔ دوشنبہ سے وہاں تک پہنچنے کے لئے جدید وضع کی ایک وسیع پختہ تارکول کی سڑک بنائی گئی ھے جو سیاہ ناگ کی طرح لہراتی بل کھاتی دکھائی دیتی ھے جس کے دونوں طرف حد نظر تک زمردیں رنگ سبزہ زمین کا چہرا ڈھانکے رہتا ھے اور اس کا سلسلہ اگلے شہر تک برقرار رہتا ھے۔

یعنی درمیان میں کوئی سنگلاخ یا چٹیل میدان نظر نہیں آتا ۔ موسم بہار میں تو اس کا حسن دوبالا ہوکر عجیب نظارہ پیش کرتا ھے ، خصوصاً جب بادام اور انجیر کے درخت پھولوں اور پھلوں سے لد جاتے ھیں ۔ پھر موسم سرما میں جب دھوپ خوب کھلی رھتی ھے اور تیز ھوائیں چلتی ھیں تو قدرت کی دیوی صحت کے انمول موتی بکھیرتی نظر آتی ھے ۔ کوھسار کی شمالی ڈھلانوں پر برف جم کر سبزے کے ساتھ سفیدی کا حسن تضاد پیش کرتی ھے جس پر محض نظر ڈالنے سے بصارت بڑھ جاتی ھے ۔ موسم گرما میں بھی یہ وادی حسین دکھائی دیتی ھے کیونکہ موسم خزاں شروع ھونے سے پہلے ھی پتے پیلے پڑجاتے ھیں اور جب وہ گرچکتے ھیں تو ایسا محسوس ھوتا ھے کہ کسی دست نازک نے زمردیں فرش پر سونے کے پترے بکھیر دئے ھیں ۔

اسی وادی میں ایک بستی چرمازاک کہلاتی ھے جو ایک وسیع درے کے درمیان واقع ھے ۔ وھاں سے لمبی لہکاری سیاہ سڑک دوشاخہ ھوکر آگے قدم بڑھاتی ھے ۔ دونوں کی سمتیں اور منزلیں جدا ھوتی ھیں ۔ لیکن وادی کا حسن لازوال تقسیم ھوکر ماند نہیں پڑتا بلکہ مختلف الالوان پھولوں کی آما جگاہ بن جانے کے باعث دوبالا ھوجاتا ھے ۔ اس مقام کی دلآویز کشش ھر موسم میں اتنی شدت کے ساتھ دامن گیر ھوتی ھے کہ سیاح مسافروں سے بھری ھوئی بس میں سوار ھوں یا شاندار بے بہا ذاتی کار میں ، ایک لمحے گاڑی ٹھیرا کر اس کا عمیق نظارہ کرلینا چاھتے ھیں ۔ چنانچہ ھم مندوبین کی گاڑیاں جب اس مقام پر پہنچیں تو کچھ دیر کے لئے رکے بغیر نہ رہ سکیں ۔ سب ھی

اراکین اتر پڑے تاکہ اس حیات آفرین فضا میں چند لمحے سانس لے کر معجزہ فطرت دیکھ سکیں۔

قصبے کی کل آبادی تقریباً ۲۳ ہزار نفوس پر مشتمل ہے لیکن ان میں مختلف قومیتوں کے نمائندے نظر آتے ہیں اور اکثریت ان سرکاری کارکنوں کی ہے جو بجلی پیدا کرنے والے کارخانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی موسمی پھلوں اور میووں کی کاشت کرنے والے ہیں جن کے چہروں کا رنگ اپنے تیار کردہ پھلوں سے زیادہ سرخ و سفید کہا جاسکتا ہے۔ بلند و بالا شاندار عمارتوں کے آس پاس کچھ بوسیدہ وضع کی جھونپڑیاں بھی دکھائی دیتی ہیں جو امارت و غربت کا رنگ تضاد ظاہر کرتی ہیں۔ آبادی کا سلسلہ پہاڑی کے دامن سے چوٹی تک چلا گیا ہے اور چونکہ یہ علاقہ تقریباً ۲۷ لاکھ کلوواٹ بجلی پیدا کرنے کا بڑا مرکز ہے، اس لئے یہ تصور کرنا آسان ہے کہ گھپ اندھیرا چھا جانے کے بعد جب برقی قمقمے ہر گھر میں اور ہر راستے پر روشن ہوتے ہونگے تو یقیناً یہ محسوس ہوتا ہوگا کہ آسمان کا ایک ٹکڑا زمین کے قدم چومنے کے لئے ذرا سا جھک گیا ہے۔ یہاں ستر کلو میٹر طویل اور پانچ کلو میٹر عریض ایک قطعہ آب بھی ہے جس پر برف سے زیادہ سفید کشتیاں مچھلی کا شکار کرتی نظر آتی ہیں۔ میرے دل ناداں نے ترغیب دی کہ صد سالہ تقریبات سے فراغت پاکر چند دن یہاں قدرت کی آئینہ سامانی میں گزارے جائیں مگر اپنی مصروف زندگی کی مجبوریوں نے محتسب بن کر اس ارادے سے باز رکھنا ہی مناسب سمجھا اور میں سب کے ساتھ دوبارہ گاڑی میں سوار ہوکر منزل کی طرف چل پڑا، حالانکہ دل

نہیں چاهتا تھا کیونکه بارش نے سماں اور بھی بھلا کردیا تھا ۔ میرے تو دل کی کلیاں کھل کر چٹکنے لگی تھیں ۔

نوریک میں سب سے پہلے ایک ہال میں استقبالی اجتماع ہوا ۔ غالباً میونسپل کمیٹی کے صدر صاحب نے کلمات استقبالیه ارشاد فرمائے اور پھر نوریک ڈیم کے انجینئر صاحب کو دعوت دی که وہ اس تاریخ ساز ڈیم کے بارے میں تفاصیل بتائیں ۔ وہ بے چارے شاید قلب کے مریض تھے ۔ نوجوان تو تھے مگر ڈیم کی تفاصیل بتاتے وقت پسینه پسینه ہوئے جارہے تھے ۔ حال آں که موسم خاصا سرد تھا ۔ اس کے بعد مندوبین کو لے جاکر ڈیم دکھایا گیا ۔ میں نے بھی دیکھا ۔ وہاں ایک صاحب نے مجھے پہچان لیا ۔ آپ تو دو سال قبل بھی آئے تھے ۔ میں نے بھی ان کو پہچان لیا ۔ ڈیم پر فوٹوگرافرس اور ٹیلے وژن کے کارکن بھی موجود تھے ۔ میں ان سے دور ھی تھا مگر پھر ان کے اصرار پر میں نے ذرا سی ایکٹنگ بھی کرلی ۔ وہ چاهتے تھے که ہم باتیں کریں اور وہ پس منظر میں ڈیم کی مشینری رکھ کر ہماری فلم تیار کرلیں ۔

دو بجے ہم ایک مرکزی ہال میں آ گئے ۔ سینکڑوں آدمیوں سے ہال بھرا ہوا تھا ۔ دراصل یه نوریک میں جشن عینی تھا ۔ یہاں افتتاحی تقریر کے بعد محفل شعر و ادب برپا ہوگئی ۔ کئی تقریریں ہوئیں ۔ متعدد شعرا نے کلام سنایا ۔ میرا خیال تھا که تاجیکستان میں بیدل ، حافظ اور اقبال معروف تر ھیں مگر آج ایک صاحب نے عمر خیام پر تضمین سے حاضرین سے داد لی ۔ تمام شاعری روسی زبان میں تھی اور فارسی میں ایک بھی شاعر

نے کوئی نظم نہیں کہی - میرے قریب تاجیکستان کے مشہور شاعر جناب میر سعید میر شاکر تشریف فرما تھے - وہ مجھے فارسی میں سمجھاتے رہے - یہی شاعر تاجیکی امیر خسروئے دهلوی کی تقریبات میں شرکت کے لئے پاکستان گئے تھے - یہاں ان سے ۱۹۷۵ء میں تاجیکستان دو شنبہ میں مل چکا تھا - پاکستان میں ان کی خاطر تواضع ممکن حد تک کردی تھی اور ان کو هدایا بھی دئے تھے - وہ مسز ڈی سلوا (میری سکریٹری) کا حال پوچھتے تھے -

صبح جب ماسکو گزر گاہ سے ہوکر گزرا اور اب شام کو بھی واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ جو پھول ہم نے مجسمۂ لینن پر رکھے تھے، وہ بدستور رکھے ہوئے تھے - ان کو کسی نے ھاتھ تک نہیں لگایا تھا - حال آں کہ شام کے وقت یہاں سیلانی جمع بھی تھے - یہ ملی تنظیم کا حال تھا - اگر پاکستان ہوتا تو شاید قبر کے اندر کا کفن بھی غائب کردیا جاتا - نوریک سے واپسی پر میں نے دو شنبہ تک دیہی علاقوں میں آبادیوں کو غور سے دیکھا - اب تک دیہی علاقوں میں لباس قدیم تاجیکی هی استعمال ہو رہا تھا - عورتیں تنگ (حیدر آبادی) پاجامے اور لمبے کرتے پہنے ہوئے تھیں اور سر پر چوکور ٹوپی اوڑھ کر اس پر کساوا کس لیا تھا - بچے بھی تاجیکی لباس میں تھے - مردوں میں داڑھیاں رکھنے کا رواج ہے اور بوڑھے لوگ روئی کے کوٹ اور صدریاں پہنے ہوئے تھے - صورت شکل میں ان لوگوں کو برصغیر سے مماثل کیا جاسکتا ہے - ایک زمانہ تھا کہ تاجیکستان وغیرہ علاقوں سے ہندستان تک قافلے آتے جاتے تھے - گویا یہ رشتہ بڑا قدیم ہے - دو شنبہ سے کابل بھی زیادہ دور نہیں ہے - ہوائی

جہاز کے ذریعہ سے زیادہ ۴۰-۴۵ منٹ کا راستہ ۔ اگر دوشنبہ ہموار کردیا جائے اور سڑکیں تعمیر کردی جائیں تو روس کی یہ مسلم ریاستیں افغانستان ، پاکستان اور ایران سے قریب تر ھیں ، جبکہ ماسکو سے یہ دور تر ھیں ۔

چین کی ڈپلومیسی

اس حقیقت کے پیش نظر ھی تو چین روس سے مطالبہ کرتا ھے کہ ان پانچوں مسلم ریاستوں کو آزاد کرو مگر خود چین کا حال کیا ھے ؟ آدھا پاکستان اس کے زیر نگیں ھوگیا ھے ! کیسے ؟ امریکہ ، روس اور چین -- ان سب کی نگاھیں مشرقی پاکستان پر تھیں اور ھر ایک اس علاقے کو اپنے زیر نگیں کرنا چاھتا تھا ۔ روس کا اساسی مقصد و منشا یہ تھا کہ مشرقی پاکستان چین کے زیر نگیں نہ جانے پائے ۔ خود روس کو وھاں حکومت کرنے کی بہ ظاھر چنداں خواھش نہیں تھی ۔ اس لئے روس نے گزشتہ دس سال تک اپنے افکار کی وھاں روشنی پھیلائی اور لوگ کہتے ھیں کہ اس جذبے کے ساتھ کہ پاکستان کو کمزور کردیا جائے ۔ روس نے مشرقی پاکستان کو ھندستان کے زیر نگرانی کردیا ۔ اور ھندستان نے اس پر آمادگی ظاھر کردی ۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ھے اور بہ ظاھر اس کے غلط ھونے کی کوئی وجہ نہیں ھے تو درحقیقت ان دونوں بڑی طاقتوں نے غلطی کی ھے ۔ اس غلطی کے نتائج آج سے دس پندرہ سال بعد ظاھر ھونگے کہ جب ھندستان لازمی طور پر مغربی بنگال اور آسام سے محروم ھوگا اور روس کو یہ دیکھنا ھوگا کہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) لازماً چین کے زیر نگیں ھوگیا ھے ۔ میری رائے میں دنیا کی کوئی طاقت ایسا

هونے سے نہیں روک سکتی ۔ میں چین کی ڈپلومیسی کی داد دونگا کہ اس نے ایک زبان ہلائے بغیر اور پاکستان سے دوستی کو ذرہ برابر نقصان پہنچائے بغیر آدھا پاکستان اپنے زیر نگین کر لیا ھے ۔ اس سیاست میں روس اور امریکہ دونوں صریحاً ناکام ہوگئے ھیں ۔ میرے دل میں ضرور یہ شبہ ھوتا ھے کہ مشرقی پاکستان کا حادثہ تنہا بیرونی سیاست کی وجہ سے پیش نہیں آیا ھے ۔ اس میں خود ھمارا کردار بھی مشتبہ ھے اور یہ شبہ کرنے کے وجوہ موجود ھیں کہ ھم نے ھندستان کے لئے راستہ ھموار کردیا ھے ۔ فی الحال یہ ضرور راز ھے مگر آخر کب تک یہ راز رھیگا ۔ بایں ھمہ اگر یہ راز کسی وقت افشا ھو بھی گیا تو گردن زدنی جن کی ھونی ھے وہ دونوں اب موجود نہیں ھیں ۔ بنگالیوں نے اپنی آزادی قربان کرھی دی ھے اور اب ان کو چین کی گرفت سے کم از کم دو سو سال نجات نہیں ملیگی اور جب وقت نجات آئیگا تو بنگالی دراصل بنگالی نہ ھوگا ۔ اس کی زبان وہ ھوگی جو بنگالی ، برمی اور چینی کا آمیزہ ھوگی ۔ یعنی وہ بنگالی زبان جس نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے جدا کیا وہ زبان آخرکار ختم ھوجائے گی ۔

ھم سب مندو بین ساڑھے چھ بجے باغ میں واپس آگئے ۔ میں نے ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف کو خستہ پایا ۔ وہ میرا بڑا ھی خیال رکھ رھے تھے ۔ میں اس عالم شخصیت کا احترام ھر لمحہ کرتا ھوں ۔ مگر وہ مجھے اپنے خلوص و انس سے گرویدہ تو کرھی رھے تھے ، مجھے شرمندہ بھی کرنے لگے ۔ مہمان خانے کے دروازے پر ڈاکٹر اکبر خان مستعدی کے ساتھ موجود تھے ۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ سات بجے روانہ ھونا ھے ۔ آج ایک

ڈرامہ ہے جو خاص طور پر اس موقع کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ میں اس قسم کے پروگراموں سے کبھی نہیں گھبراتا۔ تاہم اگر صبح پتہ چل جاتا کہ پروگرام کی نوعیت کیا ہے تو ذہنی طور پر آدمی تیار ہوجاتا ہے۔ پروگرام مطبوعہ موجود ہے مگر ان حضرات کو اب تک یہ ادراک نہیں ہوا تھا کہ ہم روسی زبان نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ہمارا سارا انحصار مترجمین پر ہوتا ہے۔

تعارف

میں نماز عصر ادا کر کے وقت معینہ پر تیار ہوگیا۔ موٹر نمبر ۸ پر ہم تھیٹر پہنچ گئے۔ وہاں ڈاکٹر منیرہ موجود تھیں۔ وہ ایک نوجوان کو لائیں اور کہا: "ان سے ملئے۔ یہ آج کے ڈرامے کے مصنف ہیں۔ طالب شہیدی ان کا نام ہے"۔ میں اس نوجوان سے ملا۔ پرتپاک شیک ہینڈ ہوا۔ اس کا لطف لے کر ڈاکٹر منیرہ نے کہا: "اور یہ میرے بھائی ہیں"۔ میں نے طالب شہیدی کو گلے اور سینے سے لگا لیا۔ اس بغل گیری کا لطف منیرہ نے زیادہ اٹھایا۔ ڈاکٹر منیرہ اکیڈمی میں میرے دوست ڈاکٹر میرزا یوف کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ گزشتہ بار ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ میرے دوست میرزا یوف اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ بڑی عالم فاضل شخصیت تھے۔ کنگرس عالمی ابو ریحان البیرونی پاکستان میں روس سے تاجیکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ میرے مہمان تھے۔ ان سے بڑا قلبی تعلق ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر منیرہ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں کام کررہی تھیں۔ اس بار وہ محترمہ عصمت چغتائی کی مترجمہ تھیں اور ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہیں۔

ڈرامہ

پروگرام روسی زبان میں ملا۔ ڈرامے کے نام کا پتہ ہنوز نہیں چلا ہے مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پینٹو مائم اور بیلے کا یہ مرکب ایک سود خوار کے کردار کا مظہر ہے۔ ڈرامے میں سارے بدکردار وہ لوگ تھے جو داڑھیاں لگائے ہوئے تھے اور روپیہ پیسہ جن کا مقصد زندگی تھا۔ سود خوار مولوی آخر تک روپے پیسے کو مقصد زندگی بنائے رہا اور ڈرامے میں جو چار دوسرے مولوی آئے' وہ بھی محبت زر سے خالی نہ تھے۔ سود خوار نے ایک سکہ ہوا میں اچھالا تو چاروں مولوی گتھم گتھا ہوگئے اور پانچواں سود خوار۔

اس اعتبار سے پاکستان کے ملاؤں میں اور تاجیکستان کے ملاؤں میں قدر مشترک ہے۔ ہمارے ہاں بھی ملا ٹکے کے بھاؤ بک جاتا ہے اور معاشرے کو سب سے زیادہ یہی تباہ کرتا ہے۔ بایں جبہ و دستار جب وہ بدکرداری کا مظاہرہ کرتا ہے تو معاشرے کے ذہن جوان کو داغدار بنا دیتا ہے۔

رات دس بجے سب مہمان واپس آگئے۔

میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ نوریک میں ساڑھے چار بجے دھی روٹی کھائی تھی اور وہ ضرورت کے لئے کافی تھی۔

میرا مقالہ جشن عینی میں

صدرالدین عینی کے جشن صد سالہ کے ذیل میں ۱۷ اور ۱۸ اپریل کو یعنی مسلسل دو دن سائنسی اجلاس منعقد ہوئے۔ میں نے ۱۷ اپریل کی صبح کو اپنے مقالے کی نوک پلک درست

کی۔ بڑی شدت کے ساتھ اس کا احساس ہو رہا تھا کہ میرا مقالہ زبان فارسی میں ہونا چاہئے تھا۔ دراصل میں نے فارسی ترجمے کا فیصلہ کیا تھا مگر بعد میں نہ جانے کیوں میں نے انگریزی کا فیصلہ کرلیا۔ یہاں اکثریت فارسی زبان جاننے والوں کی تھی۔ دوسرے ممالک کے جو اسکالرز آئے تھے وہ بھی فارسی داں تھے۔ اور ماسکو وغیرہ سے جو روسی شرکا‌ٔ آئے' وہ بھی فارسی شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تاجیکستان کی زبان فارسی ہے مگر یہاں بھی اکثریت روسی زبان سمجھتی ہے۔ بہر حال میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے مقالے سے قبل چند کلمات فارسی میں کہونگا اور بغیر لکھے کہونگا۔ میں اپنا مقالہ چھاپ کر لایا تھا۔

دس بجے ہم کانفرنس ہال میں پہنچ گئے۔ یہ نیا تعمیر ہوا ہے۔ اس میں موجودہ ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔ دوشنبہ کے اعتبار سے یہ ایک بہترین مقام ہے کہ جہاں بڑی سے بڑی عالمی کانفرنس منعقد کی جاسکتی ہے۔ ابھی زیر تعمیر ہے۔ شاید ایک سال بعد اس میں ضروری اضافات بھی حسب ضرورت ہوجائیں گے۔

اکیڈیمیشین محمد عاصموف صاحب موجود تھے۔ اب تک جو تقریبات ہوئیں، ان میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اس علمی اجلاس میں بھی وہ پیش پیش تھے اور صدر جلسہ بھی تھے۔ پروگرام کے مطابق میرا مقالہ کل ہونا تھا، مگر پروفیسر عاصموف صاحب نے فیصلہ کیا کہ حکیم صاحب کا مقالہ آج ہی ہوگا اور سب سے پہلے ہوگا۔ تاہم سب سے پہلے دو مقالات ملکی اسکالرز کے ہوئے۔ تیسرا مقالہ ہندستان کے جناب علی سردار جعفری

صاحب کا تھا ۔ انھوں نے اپنا مقالہ دوشنبہ آکر ھی لکھا ۔ درحقیقت یہ عینی اور حکومت کے لئے کلمات خیر تھے جن کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کیا ۔ ان کی زبان بہت پاکیزہ ھے ۔ ان کے خیالات ایک پختہ شاعر کی طرح ھیں ۔ میں نے ان کو پہلی بار سنا ۔ علی سردار جعفری صاحب ترقی پسند ادب کے ترجمان ھیں ۔ روس میں ان کا مقام متعین ھے ۔ ان کے کلام کا روسی زبان میں ترجمہ بھی ھوا ھے ۔ ان کا مقام وہ ھے جو فیض احمد فیض کا پاکستان میں ھے ۔ مگر یہ حقیقت ھے کہ فیض صاحب کی روس میں قدر و منزلت زیادہ ھے ۔ وہ لینن پرائز ونر بھی ھیں کہ جو روس کا سب سے بڑا اعزاز ھے ۔

علی سردار جعفری صاحب کے بعد اکیڈیمیشین عاصموف نے نہایت موزوں الفاظ میں میرا تعارف کرایا ۔ غالباً وہ اس سے پہلے سینکڑوں حاضرین سے تعارف نہیں کراسکے تھے ۔ مجھے انھوں نے مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی ۔ میں نے چند منٹ فارسی میں خطاب کیا اور معذرت چاھی کہ میرا مقالہ غیر فارسی زبان میں ھے ۔ میں نے وضاحت کی کہ میں طب کے میدان میں حقیر محقق ھوں اور انگریزی زبان میں طب قدیم کو متعارف کرارھا ھوں ۔ اس لئے میری علمی اور تحقیقی زبان انگریزی ھے ۔

مادام مریم سلگانگ صاحبہ فوراً میرے ساتھ آگئیں اور انھوں نے انگریزی سے روسی میں ترجمہ کی ذمہ داری سنبھال لی ۔ محترمہ مریم سلگانگ ادارۂ مصنفین روس میں شعبۂ ممالک خارجہ کی صدر ھیں ۔ اردو بھی جانتی ھیں ۔ انگریزی پر عبور و قابو ھے ۔

میرے مقالے میں فارسی کے اشعار جگہ جگہ تھے جن کو میں نے اچھے فارسی انداز سے پڑھا ۔ بارے یہ مرحلہ بخیر و خوبی ختم ہوگیا ۔

میرے مقالے کا متن

میرے مقالے کا مختصر اردو ترجمہ درج ذیل ہے ۔ اس کا عنوان تھا : صدرالدین عینی — انسان ، اس کا عہد ، اس کا پیغام ۔

”باشندگان عالم کی زندگی کے ہر پہلو میں ، خصوصاً معاشرتی فروغ کے لئے جد و جہد کرنے والوں کے میدان عمل میں ایک انقلاب اس وقت رونما ہوتا ہے کہ جب جہالت ، غربت و افلاس اور بیماریاں کسی ملک میں ، جس کا عہد ماضی شاندار اور درخشاں رہا ہو ، اپنا نقش جمالیتی ہیں ۔ تاجیکستان انقلاب اکتوبر سے قبل ایسا ہی ایک ملک تھا ۔ اب سے چند صدی پہلے، وسطی ایشیا نے نہ صرف ماہرین فن تعمیرات اور فنکاروں کو جنم دیا بلکہ رودکی ، فردوسی ، ناصر خسرو اور کمال خجندی جیسے شعرائے کرام نیز ، فلسفی ، دانشور اور اطبا بھی پیدا کئے ۔ موخرالذکر کی صف میں ابو علی ابن سینا جیسے متبحر اور عقل کل انسان کا شمار ہوتا ہے ۔ انقلاب اکتوبر کو نہ صرف عوام کی اکثریت نے قبول کیا بلکہ بہ رضا و رغبت اور بہ مسرت و شادمانی اس کا خیر مقدم کیا ۔ ایسے لوگوں کی صف میں صدرالدین عینی کا شمار ہوتا ہے جو اپنے عہد کے ایک ممتاز نثر نگار ، شاعر اور مفکر تھے جو آگے چل کر تاجیک اکیڈمی آف سائنسز کے صدر، ڈاکٹر آف فلولوجی (ماہر لسانیات) اور اسٹالن انعام یافتہ ہوگئے۔

کرۂ ارض کے اس حصے کی تاریخ عہد وسطیٰ کی ورق گردانی کی جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں امارت بخارا کا قیام عمل میں آیا تھا ۔ اس میں موجودہ تاجیکستان کا کچھ علاقہ شامل تھا ۔ عرصۂ دراز تک اس وسیع علاقے کا نظم و نسق سنبھالنے والے امیر فہم و فراست اور حسن و خوبی کے ساتھ فرمانروائی کرتے رہے ، یہاں کی زبانیں ، رسم و رواج ، عادات و اطوار اور ادیان و مذاہب باہم شیر و شکر رہے اور اپنے نقوش ایک دوسرے پر جماتے رہے ۔ لیکن انیسویں صدی عیسوی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی جس نے اس سرزمین کے حالات کا ہر نقش بدل ڈالا اور سلطنت کی خود مختاری بھی ختم ہوگئی ۔

وسطی ایشیا میں روسی لشکروں کا منظم صورت میں داخلہ ۱۸۶۱ء میں شروع ہوا اور امارت بخارا زار روس کے تحت ایک باجگزار ریاست بن گئی ۔ امیر وقت کو مجبور ہوجانا پڑا کہ وہ ان غاصبوں کی مرضی کے خلاف کوئی عمل نہ کرے جنہوں نے معصوم انسانوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور مصائب و آلام کا نشانہ بنانے کے لئے لامحدود اختیارات حاصل کرلئے تھے ۔ اپنی رعیت کی نجات کے لئے امیر کے پاس نہ ہمت تھی ، نہ اقتدار اور نہ وسائل و ذرائع ۔ لہذا زار کے ظلم و استبداد کے تحت سارا ملک آہ و فغاں کرتا اور تڑپتا رہا ۔

حریت و آزادی ، حتیٰ کہ تعلیم و تربیت کے ضمن میں بھی ، بہت ہی گراں اور ناممکن الحصول تھی ۔ علاج معالجے کی خصوصی مراعات صرف طبقۂ اُمرا کو حاصل تھیں ۔ غریب لوگ

صرف اتائیوں اور نیم حکیم شعبدہ بازوں کے رحم و کرم پر رہتے تھے جو جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے ذریعہ سے ان کا روگ مٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کوئی ایسا مستند طبیب نہیں ہے جو جڑی بوٹیوں کا عرق نکال کر ہی کسی مریض کو پلا سکتا ہو۔ اس صورت حالات کے لئے امیر ایک حد تک ذمہ دار تھا لیکن کلیتہً اسے الزام دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ جب بھی کسی دوسرے ملک کا اقتدار قائم ہو، مفتوح قومیں مصائب و آلام کا شکار ہوجاتی ہیں۔

جہالت، غربت و افلاس اور بیماری کے مذموم چکر کے ہاتھوں بگڑنے والے ان حالات میں صدر الدین ۱۵ اپریل ۱۸۷۸ء کو بخارا کے ضلع گژدوان کے ایک قصبے سوقطر میں پیدا ہوئے۔ اس سے سترہ سال پہلے زار روس ان کے مادر وطن کی آزادی کو غصب کرچکا تھا — اس سر زمین کی آزادی کو جو سر سبز و شاداب وادیوں، روشن و پر فضا گھاٹیوں، پہاڑوں کی اونچی نیچی اور ازل سے برف پوش چوٹیوں سے مل کر بنی تھی، جس کی فضا خوشگوار اور ہر طرف کھلی ہوئی دھوپ سے صحت بخش تھی۔

صدرالدین کے والد کے مالی وسائل محدود تھے، اس لئے وہ کسی مدرسے میں زانوئے ادب طے کرکے باقاعدہ تعلیم شروع نہ کرسکے۔ کبھی یہاں داخل ہوئے، کبھی وہاں۔ گویا کسی مدرسے جہاں بھی امداد ملی، اسے قبول کرلیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کے لئے ان مدرسوں کا نظام ہی واحد آسرا تھا۔ غریب نوجوان اعلا تعلیم یا فنی تربیت کا خواب تک دیکھنے سے محروم تھے۔ چنانچہ صدر الدین کو دس سال کی عمر تک اپنا نام بھی صحیح انداز

میں لکھنا نہیں آتا تھا ۔ تاہم غربت و افلاس کے لبادے میں لپٹ جانے والی جوانی کی تشنگیٔ علم کسی عنوان سرد نہ پڑسکی ۔

جب ان کے والد سعید مراد خواجہ مرنے کے قریب تھے تو انھوں نے اپنے اس بیٹے کو بستر مرگ کے قریب بلایا اور آخری وصیت کے طور پر کہا :

''مدرسے ضرور جایا کرو ، خواہ تمہیں کتنی ھی مصیبتوں کا سامنا ھو ۔ پڑھو ، لکھو اور ایک انسان بن جاؤ ۔ ،،

اس طرح ابدی سکون اور امن باپ کو ملا اور دائمی پریشانیاں بیٹے کو اور اس کے ساتھ ھی یہ عزم صمیم بھی کہ ھر قیمت پر تعلیم حاصل کرنی ھے ۔ باپ کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال تھی ۔ ان کا بوڑھا باپ اور ان کے جھونپڑے میں رھنے والے جملہ افراد ھیضے کا شکار ھوگئے تھے جس نے دو سو گھروں والے اس گاؤں میں وبائی مرض کی صورت اختیار کرلی تھی ، صرف صدر الدین خوش نصیب تھے کہ بہت جلد اس موذی بیماری سے نجات پا کر تندرست ھوگئے ۔ چنانچہ خود ان کے قول کے مطابق اس چھوٹے سے مکان میں وہ ایک ڈاکٹر ، ایک میٹرن ، ایک نرس اور ایک وارڈ بوائے کے انداز میں خدمات انجام دیتے رھے ۔ ان تمام فرائض کی ذمہ داری اس ایک جان ناتواں پر آپڑی تھی ۔

باپ کی وفات کے بعد تمام مصیبتوں کا پہاڑ ایک دم ٹوٹ پڑا ۔ گیارہ سال کے بچے نے آذوقۂ حیات حاصل کرنے کے لئے ھر قسم کی محنت و مشقت گوارا کرلی ۔ انھوں نے ایک مزدور ، ایک باورچی ، ایک دھوبی اور ایک گھریلو ملازم کی طرح کام شروع کیا اور ایک بار تو وہ دق و سل کے ایک مریض کے تیمار دار بن گئے

اور جب وہ مریض ، جو ایک دولتمند شخص تھا ، مر گیا تو اس کے بھائی نے تیمار دار سے کہا کہ حق خدمت کے طور پر مرحوم کے اثاثے میں سے جو چیز چاہو ، لے لو اور کہو تو نقد رقم ادا کردی جائے ۔ مگر آئندہ شاعر اور ادیب بننے والے اس یتیم لڑکے نے صرف دیوان صائب پسند کیا ۔ ایک کتاب پر اکتفا کرنا ہر شخص کے لئے حیرت انگیز تھا ، اس معنی خیز انداز سے صدرالدین عینی کے اصل کردار ، شاعری سے ان کے دلی لگاؤ اور علم و ادب سے ان کے ذوق و شوق کا پتہ چلتا ھے ۔

اسی طرح ایک اور موقع پر معاوضۂ خدمت کے طور پر انھوں نے کلیات بیدل اور دیوان حافظ قبول کرنے کو ترجیح دی اور جب ایک شخص حج بیت اللہ کے لئے عازم سفر ھونے لگا اور اس نے چاہا کہ اپنے فاضل سامان کا کچھ حصہ واقف کاروں میں تقسیم کردے تو صدرالدین نے دیوان جامی کے سوا کوئی اور غیر شاعرانہ چیز پسند نہیں کی ۔ اس انوکھے انداز میں انھوں نے کوشش کی کہ اپنے مختصر سے کتب خانے میں اضافہ کرتے رہیں ، حالانکہ اپنی کتابوں کو مناسب صورت میں رکھنے کی جگہ بھی ان کے جھونپڑے میں نہیں تھی ۔

یہ بالکل حقیقت ھے کہ اس زمانے میں ان کے مسائل بے شمار تھے ۔ اشیائے خوراک کی کمی ، رہائشی سہولتوں اور ستر چھپانے والے لباس کا فقدان سب سے زیادہ پریشان کن تھا ۔ اکثر راتیں انھوں نے کچھ کھائے پیے بغیر گزار دیں ۔ اکثر موقعوں پر وہ کسی مسجد کے گوشے میں یا کسی دوست کی کھولی میں لیٹ کر سوگئے ۔ اپنے اس طرز زندگی کے بارے میں ایک رباعی کہی

جو ان کے احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس قماش کی زندگی بسر کرنا میرا مسلک نہیں ہے، نہ دوستوں کا دست نگر رہنا میرا شعار ہے۔ بدقسمتی پر آنسو بہانا بھی زیب نہیں دیتا لیکن اب شکایت کی جائے تو کس سے کی جائے۔

اس کے برعکس یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روسی اقتدار کے زیر اثر تاجیک ادب کا آغاز ۱۹۱۸ء میں صدرالدین عینی کی ایک نظم سے ہوا جس کا عنوان تھا: "سرود آزادی۔"، اس نظم کو حفظ کر کے باآواز بلند گاتے ہوئے مدرسوں کے بچے باہر نکل آئے اور انقلاب اکتوبر کی پہلی سالگرہ کی تقریبات میں شریک ہوگئے۔ نظم کا مفہوم تھا:

"اے بدقسمت انسانو! اے غلامو! تمہاری آزادی
کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ مجھے خوش خبری سناؤ،
اے میرے ساتھیو! دنیا میں صبح مسرت نمودار
ہورہی ہے"۔

اپنی نظموں کے لئے صدرالدین نے یکے بعد دیگرے چار تخلص اختیار کئے: "سفلی"، — "محتاجی"، — "جنونی"، اور آخر میں "عینی"، — لغت میں اس آخری لفظ کے اڑتالیس معنے درج ہیں جن میں "آنکھ"، "منبع"، اور "سورج"، بھی شامل ہیں۔

چونکہ فن شعر گوئی میں انہیں بڑا ملکہ اور سلیقہ حاصل تھا، اس لئے اپنے فالتو وقت میں وہ ہمیشہ کوشش کرنے لگے کہ کوئی نظم موزوں کرلیں اور جب ان کی کوئی نظم اچھا ذوق رکھنے والے سامعین کے سامنے پڑھی جاتی تو نعرہ ہائے تحسین کے ساتھ داد دیتے ہوئے اسے شاہکار نظم اور معیاری ادب کہا

جاتا ۔ ایک حد تک انہوں نے طرز سخن میں بیدل کا تتبع کیا تھا ۔

موسم سرما میں سردی سے بچنے کے لئے ان کے پاس روئی بھرا ھوا صرف ایک کوٹ تھا جسے پہن کر وہ دن بھر حسب ضرورت پھرا کرتے اور رات کو اسی میں لپٹ کر سوجاتے ، ان کے پاس نہ رضائی تھی ، نہ لحاف ، نہ کمبل ۔ ان کے پاس چمڑے کی جرابیں بھی نہیں تھیں ۔ ان کے سب دوست جراب کے بغیر گھر سے نکل نہیں سکتے تھے ۔ لیکن مجبوری کے ساتھ خود داری بھی ھو تو انسان ھر محرومی کو خاموشی سے گوارا کرلیتا ھے ۔ وہ اپنے ھی ھاتھ سے بنائے ھوئے سلیپر پہن کر جاڑے کے موسم میں گزارا کرتے جن سے ان کے پاؤں کی جلد جگہ جگہ سے چٹخ جاتی تھی ۔ لیکن انہوں نے کبھی کسی سے بھیک مانگنے کے انداز میں کوئی چیز طلب نہیں کی اور نہ زندگی سنوارنے کے لئے کوئی بے جا مطالبہ کیا ۔ انہوں نے مخیر حضرات کی فیاضانہ پیش کشوں کو بھی قبول کرنے سے انکار کردیا ۔ انہیں یہ بھی شبہ تھا کہ یہ لوگ امارت بخارا کے دلال ھیں اور اس طرح ناجائز فائدہ اٹھانا چاھتے ھیں ۔ اس رویہ سے اندازہ ھوتا ھے کہ وہ غیر معمولی طور پر کتنے وسیع النظر تھے ۔ زندگی کے ان لاتعداد نشیب و فراز میں بکھرے رھنے کے باوجود ھمیشہ ایک مقصد حیات ان کے سامنے رھا اور وہ دیانت داری اور سچائی کے ساتھ ھر منزل سے گزرتے رھے ۔

پھر ایک وقت آیا کہ جب مناسب تعلیم کی جستجو میں انہیں اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہہ دینا پڑا اور وہ بخارا کے مشرقی علاقے میں چلے گئے جہاں مشتاق طلبہ کے لئے مفت تعلیم

کا انتظام تھا۔ دن کے وقت وہ درسی کتابوں کا مطالعہ کرتے جو معمولی معاوضے کے بدلے میں انہیں طلبائے قدیم سے مستعار مل جاتی تھیں اور رات کے وقت وہ کسی ریستوراں میں جا کر برتن دھونے یا چوکیداری کرنے کے فرائض انجام دیتے۔ وہ کسی بھی کام سے جی نہ چراتے تھے۔ محنت و مشقت کی عظمت ان کے دل میں جا گزیں تھی۔ حصول علم کا جذبہ ان کے دل و دماغ پر اس طرح طاری تھا کہ وہ اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے چند سال میں اپنی تمنا پائے تکمیل کو پہنچادی اور امتیاز کے ساتھ فارغ التحصیل ہوگئے۔ ان کے مطالعے کے موضوعات میں سائنس کی تمام شاخیں ، ادب و انشا اور دوسری زبانیں شامل تھیں۔

وہ اپنی تمام عمر پرامن طریق کار کے مطابق محنت کش عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر نبرد آزما رہے کیونکہ ان کے خیال میں قوموں کی اقتصادی خوش حالی اس طور سے ممکن ہے۔ انہوں نے عوام سے بھی کہا کہ کسی قسم کی تخریبی کارروائی سے خالی الذہن ہوکر هم آهنگی اور یک جہتی کے ساتھ متحد رهیں۔ انہیں سب سے زیادہ ناپسند بات یہ تھی کہ کوئی بھی قدم غیرجمہوری انداز میں اٹھایا جائے۔ ان کی رائے میں جمہوریت کا مطلب یہ تھا کہ ایک خیر سگالی جذبے کے تحت تمام شہری معاشرتی مساوات کے حصول کی کوشش کریں۔ انہوں نے بہ بانگ دھل کہا کہ هر سطح پر انسان دوستی کے اصولوں میں یکسانیت پیدا کی جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کوئی بھی غیر منصفانہ عمل ، خواہ وہ حکومت هی کے خلاف کیوں نہ

هو اور خواہ اس کا جواز موجود کیوں نہ هو ، قطعی طور پر کوئی عذر برداشت نہیں کیا جائیگا ۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اخلاقیات کے مسلمہ اصول محنت کش طبقے کے لئے بھی یکساں ہونے چاہئیں ۔ ایسی عملی سرگرمیوں اور پند و نصیحت کی بنیاد پر انہیں عظمت عمال کا ایک عالمی نشان تسلیم کیا گیا اور انہیں صنعتی فراخدلی کے ضمن میں ایک عظیم علمبردار اور امداد باھمی کے نظم و نسق کے لئے روشن خیالی کی ایک علامت سمجھ لیا گیا ۔ اس طرح انہوں نے اپنے ابنائے وطن میں معاشرتی شعور کا احساس ، کام کرنے کی لگن اور عزت نفس کے حصول کا جذبہ بیدار کردیا ۔

عینی نے انقلاب اکتوبر کے بعد هی نثر میں لکھنا شروع کیا جس کے جلو میں آزادی اور انصاف کی لہریں ابھر آئیں ۔ هر قسم کی کمینگی ، بے غیرتی ، معاشرتی بے انصافی ، نیز افسروں ، اهلکاروں اور طبقۂ امراء کی خون آشامیوں کو بے نقاب کرنے میں انہیں غیر معمولی شہرت حاصل هوئی ۔ ان کے الفاظ بے پناہ غم و غصے ، برهمی اور نفرت میں ڈوبے هوئے سنائی دیتے تھے ۔ ان کی نگارشات میں استعمال هونے والے افراد کی اکثریت جیتے جاگتے انسان هیں ۔ ان کی تخلیقات کا ایک هلکا سا نقش حسب ذیل ھے :

(۱) ”بخارا کے جلاد“ مطبوعہ ۱۹۲۰ء ، جس میں ازبکستان کے ایک قبیلے کی انتہائی دردناک حالت کی ترجمانی کی گئی ھے ۔ اس میں پیش هونے والے هر کردار کی قسمت خوف و هراس کی جھلک دکھاتی

ہے۔ نیز طبقہ امراء اور سرکاری اہلکاروں کی اخلاقی پستی کے ناٹک کا آخری پردا اٹھتا نظر آتا ہے۔ ان صفحات میں عینی کی حقیقت پسندی کے کچھ اور ظاہری نقوش نمایاں ہوجاتے ہیں جو ان کے خیالات کی اصل بنیاد ہے اور جس سے ان کے آئندہ ظہور میں آنے والے کارناموں کو تقویت پہنچتی ہے۔ ایک موقع پر خود انہوں نے کہا تھا :

"میرے عہد ماضی کی یاد داشتیں میرے بیشتر ناولوں، تحریروں، تاریخی مقالوں اور کہانیوں کی اصل بنیاد ثابت ہوئی ہیں"۔

(۲) "اودینہ" مطبوعہ ۱۹۲۴ء ایک ایسی طویل کہانی ہے جس میں ایک محنت کش انسان یعنی ایک کاشتکار لڑکے کی زندگی اور دل کی کیفیات ایک فنکارانہ تجزیہ کے ساتھ آشکار ہوتی ہیں۔ تاجیک ادب میں پہلی بار اس کے ذریعہ سے روز مرہ حالات کی روشنی میں ایک عام محنت کش طبقے کے افراد پر توجہ مبذول کی گئی ہے جن میں سادہ لوح انسانوں کی خصوصیات اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ اس اعتبار سے نہ صرف عینی نے بہ حیثیت ایک نثر نگار کے بلکہ تمام تاجیک ادیبوں نے اس کہانی سے عمیق تاثر لیا ہے۔ کمزور طبع اور نازک مزاج اودینہ اس تشدد اور ظلم و ستم سے نمٹنے کی کوشش کرتا رہا جو اس زمانے کے سخت گیر انسانوں کا خصوصی کردار تھا اور جب اس کے

صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہوا تو اس نے سوچا کہ اب فرار کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

(۳) "احمد — جنوں کا فاتح"، مطبوعہ ۱۹۲۸ء ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس کا ضمیر بعض عناصر کے تحت نا واقفیت اور دیرینہ تعصبات کے اثرات سے پاک صاف تھا۔ کہانی کا ہیرو اپنے وقت کے لحاظ سے بے مثل کارنامے انجام دیتا اور انسانی جذبے کی قوت و استعداد اور اختیارات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مصنف کے فنیاتی عقیدے کے مظہر یہ الفاظ ہیں کہ

"انسان خبیث روحوں سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ پریاں اور جن بھوت اس قابل نہیں ہوتے کہ آدم کی اولاد کو کوئی نقصان پہنچا سکیں"۔

(۴) "دو خند"، مطبوعہ ۱۹۳۰ء عینی کا پہلا ناول ہے اور عام طور سے تاجیک ادب میں اس نوعیت کا پہلا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ ناول کے سب سے بڑے کردار "یودگور"، کی تقدیر "اودینہ"، کی قسمت سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اول الذکر ایک ایسا مثالی نمونہ ہے جو معاشرتی آزادی کے لئے سختی سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ یعنی انسان دوستی کے عظیم خیالات کے لئے جد و جہد کرتا ہے تاکہ سب کو فتح و نصرت نصیب ہو سکے۔

(۵) "غلامان وطن"، مطبوعہ ۱۹۳۴ء جو حالات زمانہ کو پورے تزک و احتشام کے ساتھ پیش کرنے کا ایک

شاہکار ہے۔ اس ناول کے تار و پود میں ان حملوں کی جھلک نظر آتی ہے جو غلامی اور غلاموں کی تجارت کو ختم کرنے، جاگیردارانہ تعلقات کے مذموم بحران کو فنا کرنے، انقلاب اکتوبر کو کامیاب بنانے اور اشتراکیت پسندی کے فیصلوں کو مضبوط و استوار کرنے کے لئے کئے گئے تھے۔ حصول آزادی کے لئے عام لوگوں نے جو راہ اختیار کی، وہ صرف انفرادی کوششوں کے ذریعہ سے ہی متعین نہیں ہوتی بلکہ پتہ چلتا ہے کہ من حیث القوم کس کس طرح اس تحریک میں حصہ لیا گیا۔ عینی نے اپنی توجہ صرف اس تاریخ ساز انداز فکر ہی پر مبذول نہیں کی جو غلامی اور انکسار پسندی کو مٹانے کے لئے محنت کش عوام نے اختیار کیا بلکہ اس عملی کشمکش کو بھی جو مکمل نجات پانے کے لئے کی گئی اور جس سے استحصال کرنے والوں کے مذموم کردار اور عزائم کی ترجمانی ہوتی ہے۔

(٦) "سود خوار کی موت"، مطبوعہ ۱۹۳۷ء ایک طنزیہ کہانی ہے جس میں عینی واضح طور پر بیان کرتے ہیں کہ میری ستم شعار حقیقت پسندی اصلیت کو بے نقاب کرنے کے لئے ایک زبردست معاشرتی طاقت ہے۔ کہانی کا اصل کردار ایک لالچی، خون چوس سود خوار ہے جس کی روح دل کی سیاہی سے داغدار ہے۔ اس کی کتے جیسی حرص اور دوسروں کے مال و متاع کو

غصب کرنے کے لئے اس کی لامحدود طمع واضح کرتی ھے کہ جاگیردارانہ معاشرے کے نظام میں انسانیت کے خلاف کیا کچھ ھوتا ھے۔ مصنف اس بات پر زور دیتا ھے کہ ھیرو کے خلاف عوام میں کس قدر نفرت پائی جاتی ھے۔ اس لئے عوام اس نظام سے برھم ھیں جس میں ایک ایسا ذلیل انسان پیدا ھوا جسے عام لوگوں پر برتری بھی حاصل ھوگئی۔

(۷) ''یتیم،، مطبوعہ ۱۹۳۹ء ایک ناول ھے جس میں ماضی اور مستقبل کی تاریخ اور حقائق حاضرہ ایک ساتھ پیش کئے گئے ھیں۔ خاص طور سے نازی جرمنی کے خلاف وطن پرستی کی عظیم جنگ کے دوران مصنف کی خصوصی توجہ عوام کے جذبۂ حریت پسندی کے معنی خیز مظاھر کی جانب مبذول ھوتی ھے جن کے زیر اثر وہ غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف نبرد آزما ھوجاتے ھیں۔

(۸-۹) ''مقنع کی بغاوت،، اور ''تیمور ملک،، مطبوعہ ۱۹۴۴ء دو عظیم مطبوعات ھیں جو ایک ھی سلسلے کی کڑیاں ھیں۔ پہلی کتاب اس زبردست رجحان سے تعلق رکھتی ھے جو سائنسی انکشافات سے وابستہ ھے اور دوسری میں منگولیا کی یلغار کے دوران رونما ھونے والے واقعات کی عکاسی ھوتی ھے۔ اس اعتبار سے ان کو سائنسی اور تاریخی مقالات کہا جا سکتا ھے۔

(۱۰) ''یادداشت،، مطبوعہ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۴ء، چار

جلدوں میں، جنہیں پڑھ کر قارئین حیرت زدہ رہ جاتے ہیں کہ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ''جنوں کا فاتح،، جس نے باہمت احمد کے فرضی نام سے خود نوشتہ سوانح حیات پیش کی ہے، عینی بذات خود موجود ہیں۔ انہیں ایسا کرنے کا حق تھا کیونکہ ان کی اپنی زندگی انسانی شجاعت، بہادری، عظمت اور قوت کی بے مثال تصویر تھی۔ اسی لئے طاقت اور انسانی صلاحیت و استعداد کی جھلک ان کی اپنی شخصیت میں نمایاں نظر آتی ہے اور وہ واضح طور پر صاف الفاظ میں ایک محنت کش کے مصائب و آلام، مسرت و شادمانی غم و غصہ اور امید و یاس کے ملے جلے احساس کی ترجمانی کرتے اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ معاشرے کی آزادی کی خاطر جد وجہد کرنے کے لئے پکے ارادے رکھیں۔ وہ شاندار الفاظ میں دولت مندی کے سب سے زیادہ اہمیت والے لمحات کی عکاسی بھی کرتے اور اس کے ساتھ ہی افسوسناک لب و لہجے میں اہل تاجیکستان کی دکھ بھری داستان بھی سناتے ہیں۔ صرف چوتھی جلد مصنف کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی جو ان کی حقیقت پسندانہ طبیعت کے انتہائی عروج کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کارنامے کو بجا طور پر بخارا کا خزانہ معلومات کہا جاسکتا ہے۔

ان سب کتابوں کو تاجیکستانی ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ سمجھا گیا ہے۔ ان کی تعریف نہ صرف اہل وطن نے کی

بلکه غیر ملکوں کے صائب الرائے محققین نے بھی ان کی قدر و منزلت کی ہے۔ چنانچہ چیکوسلوواکیہ کے ایک عظیم شخص ژولی فوجک نے ، جو ۱۹۳۹ء میں تاجیکستان کے دورے پر گئے تھے ، عینی کے بارے میں بجا طور پر کہا تھا :

” عینی صرف آپ ہی کے نہیں ہمارے بھی ادیب ھیں ۔ ان کی کتابیں نہ صرف فن لطیف کی عمدہ مثالیں ھیں، بلکہ انہیں کتب نصاب میں بھی شامل کیا جاسکتا ھے ۔ ان کتابوں کے ذریعہ سے نہ صرف عہد ماضی کے مصائب و آلام اپنی جھلک دکھاتے ھیں بلکہ تاجیک قوم نے جو کامرانیاں حاصل کی ھیں ، ان پر بھی روشنی پڑتی ھے۔ وہ ان تفصیلات کا زندہ ثبوت ھیں اور اسی لئے عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لئے ہماری جد و جہد میں وہ براہ راست معاون ہوسکتی ھیں ،،۔

اسی طرح تاجیکستان کے لوگوں نے اس حقیقت پر فخر و انبساط محسوس کیا ہوگا کہ جب ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں نے اپنی دوسری کانفرنس کے موقع پر ، جو ۱۲ سے ۱۶ فروری ۱۹۶۲ء تک بمقام قاہرہ منعقد ہوئی تھی ، اپنا قطعی منشور منظور کرتے وقت کہا تھا :

” ہم رہین منت ھیں نا معلوم مصنفین کے کارناموں کے نیز رابندرا ناتھ ٹیگور ، لوحسین ، صدرالدین عینی اور طٰہٰ حسین جیسے مصنفین کے بھی ، جنھوں نے خیالات و تصورات اور کام کرنے کی امنگ کو ترقی دینے کی صورت پیدا کی تھی ،،۔

تاھم عینی کی زندگی میں ایک زبردست موڑ پیدا ھوا جس نے ان کے اصولوں اور نظریات کو یکسر بدل دیا۔ یہ ۹ اپریل ۱۹۱۷ء کا ذکر ھے کہ جب امیر بخارا کے زیر فرمان ان کے چھوٹے بھائی حاجی سراج الدین کو اس الزام پر پھانسی دیدی گئی کہ وہ ایک خفیہ انجمن کے رکن ھیں۔ یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس انجمن نے امیر کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کا تہیہ کر رکھا ھے۔ درحقیقت وہ انجمن تعلیم میں اصلاحات لانے، ھر گاؤں اور قصبے میں مزید اسکولوں اور مدرسوں کے قیام کا اھتمام کرنے اور اعلا تربیت پانے کے لئے اساتذہ کو باھر بھیجنے کی خاطر وجود میں آئی تھی۔ اس حادثے نے قدرتی طور پر عینی کو زبردست دماغی تکلیف پہنچائی۔ چنانچہ اس شدید پریشانی اور ذھنی انتشار کے عالم میں انھوں نے اپنے بھائی کے اندوھناک قتل پر ایک مرثیہ لکھا۔ انھوں نے دل کے ٹکڑے کردینے والے اذیت ناک الفاظ میں آہ و فغاں کی۔ طویل مرثیے کے آخری بند میں انھوں نے کہا :

”اے خدا ! اس خانۂ بیداد و ستم کو ویراں کردے،
اے خدا ! اس دفتر ظلم و استبداد کو قبرستان بنادے،
اے خدا ! اس تخت شاھی کو جو ھماری بدبختی کا باعث بنا ھے، ٹکڑے کرکے، سیاہ خاک میں ملا دے،
اے خدا ! اس تاج زریں کو جو خونخوار سر کی زینت ھے، سر سمیت قید خانے میں ڈال دے۔
اے خدا ! اس محل کو جو جلادوں کا عشرت کدہ ھے، مسمار کرکے زیر زمیں دفن کردے۔

اور اس کے بعد دنیا میں حکمرانی رہے
آزادی، عدل و انصاف اور رفاقت کی۔

وہ سارا مرثیہ، جس کے ایک حصے کا ترجمہ اوپر درج ہے، فارسی ہفتہ وار ''شعلۂ انقلاب'' کے اکتوبر ۱۹۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ان کے کچھ اور مضامین بھی، جو نفرت و حقارت سے پر تھے، اسی رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ اس طرح حکومت پر جو زبردست اعتراضات ہوئے، ان کی پاداش میں سخت ترین کارروائی کی گئی کیونکہ انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اظہار وجوہ کا کوئی نوٹس دئے بغیر یا قانونی عدالت میں مقدمہ چلائے بغیر عینی کو ایک معینہ مدت کے لئے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اور ان کی ننگی پیٹھ پر ڈنڈے سے پچھتر ضربات لگائی گئیں۔ لیکن چند ہی ماہ بعد روس کے انقلابی فوجی دستوں نے ان کی سر زمین پر قدم رکھا اور امیر کے جیل خانے سے انھیں رہا کرالیا۔ تاہم اس وقت تک ان کی صحت گر چکی تھی اور وہ دل برداشتہ ہوگئے تھے۔ لہذا وہ اپنی صحت اور توانائی کو بحال کرنے کے لئے سمرقند چلے گئے تاکہ نئے سرے سے کام کرنے کی لگن پیدا ہوسکے۔

چونکہ وہ متعدد زبانیں اعلا استعداد کے ساتھ جانتے تھے اور انھوں نے تمام سائنسی علوم کا مطالعہ بھی کیا تھا، اس لئے انھیں ڈاکٹر آف فلولوجی (لسانیات) کی اعزازی سند دی گئی اور تاجیکستان کی اکیڈمی آف سائنسز کا صدر مقرر کردیا گیا۔ ان کی نثر نگاری کے پیش نظر، جن کو کئی جلدوں میں مرتب کیا گیا تھا، اور جن میں ان کی '' یادداشت،، شامل ہے، انھیں ادب کا اسٹالن انعام بھی دیا گیا۔

۱۵ جولائی ۱۹۵۴ء کو دو شنبہ میں ان کی وفات ہوئی۔ یعنی اسی جگہ جہاں تاجیکستان کے اس عظیم دانشور کو اس کی صد سالہ یوم پیدائش کی تقریب منانے کے لئے دنیا کے ہر گوشے سے ہم سب جمع ہوئے تھے۔ خدا کرے، وہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں۔

عینی کے بارے میں مزید معلومات

صدرالدین عینی ایک اعلا دانشور، مفکر اور مصنف ہی نہیں، پابند صوم و صلواۃ ایک دیندار متقی انسان بھی تھے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ جس سر زمین سے تعلق رکھتے تھے، وہ وسطی ایشیا کا ایسا علاقہ تھا، جہاں تقریباً تیرہ سال پہلے اسلام کے عہد اولین ہی میں اس دین متین کی شمع روشن ہوگئی تھی۔ خلافت راشدہ کا مبارک زمانہ، ۶۳۳ء سے ۶۶۰ء تک بظاہر بڑا مختصر تھا، لیکن خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رض کے عہد خلافت (از ۶۳۴ء تا ۶۴۵ء) میں نور اسلام ایسا پھیلا کہ اس خطۂ ارض سے، جو بت پرستوں، مشرک ترکوں یا بدھ مت کے ماننے والوں کا مسکن تھا، تاریکی یکسر دور ہوگئی اور اس کی ضیاباریاں، کمتر درجہ پر سہی آج تک بر قرار ہیں۔ عینی کے بزرگوں نے اسی فضا میں سانس لیا اور پیغمبر آخرالزماں صلعم کی ہدایات سے استفادہ کیا۔

وسطی ایشیا کا وہ علاقہ، جو جغرافئے کی تاریخ میں ترکستان کہلاتا تھا، آج بہت سی روسی ریاستوں پر منقسم ہے جن میں تاجیکستان، قفقاز، قازقستان اور ازبکستان وغیرہ شامل ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت کے اور عصر حاضر کے بعض

مقامات کے ناموں میں تغیر و تبدل ہوگیا ہے۔ حضرت عمر فاروق رض کے عظیم سپہ سالار احنف بن قیس رح نے مشہور شہر مرو فتح کیا تھا۔ پھر حضرت امیر معاویہ رض کے دور حکومت (۶۶۱ء تا ۶۸۰ء) میں ممتاز صحابی حضرت حکم بن عمرو غفاری رح کی قیادت میں مسلمانان عرب دریائے جیحون پار کرکے اسی علاقے میں داخل ہوئے اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا جو خلفائے عباسیہ اور اویہ کے عہد میں بدستور جاری رہا۔ دنیائے عرب کی سرحدیں، چونکہ ایران اور افغانستان سے ملی ہوئی تھیں اور ترکستان کا علاقہ افغانستان کے عین شمال میں تھا، اس لئے اسلام کے مبلغین کو اپنے لشکر لے کر صرف زمین کا سینہ طے کرکے یہاں پہنچنا ممکن تھا۔

ترکستان میں فروغ اسلام

تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد جب عربوں کی سر زمین پر طوائف الملوکی پھیلی تو مسلمانوں کے دوسرے مفتوحہ علاقے بھی اس لہر سے غیر متاثر نہ رہ سکے۔ لیکن سیاسی موقف اور دینی عقائد عموماً الگ الگ رہے ہیں۔ چنانچہ ترکستان کے وسیع علاقے میں حکومتیں تو بدلتی رہیں لیکن دین الٰہی کے ماننے والے اپنے مسلک پر جمے رہے۔ ترکوں کے علاوہ منگولوں، سامانیوں، ساسانیوں اور غزنویوں کے قبیلے اقتدار حاصل کر کر کے اپنے اپنے پرچم لہراتے رہے لیکن اسلام کی شمع ہدایت کو مدھم کرنے کی جرأت کسی میں نہ ہوئی یا بصورت دیگر وہ اس حقیقت سے خالی الذہن نہیں رہے کہ مذہبی خیالات سیاسی مسالک پر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ تاریخی واقعات کچھ بھی ہوں، اس

حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس سرزمین پر بسنے والے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ کسی نہ کسی انداز میں پابند مذہب رہے ۔ انہوں نے ارکان اسلام پر خلوص نیت کے ساتھ عمل کیا ۔ نمازیں پڑھیں ، روزے رکھے ، طویل فاصلہ ہونے کے باوجود عازم سفر حج بھی ہوئے ۔ آج بھی صدیاں گزر جانے کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں روسی باشندے ، جو زیادہ تر جنوبی علاقے کی اشتراکی ریاستوں سے تعلق رکھتے ہیں ، ہر سال حج بیت اللہ کے لئے جاتے اور اس دینی فریضے کو انجام دیتے ہیں ۔ اس لئے یہ بات پورے یقین کے ساتھ تسلیم کی جاسکتی ہے کہ اس ملک میں جسے اشتراکی نظام کے زیر اثر ہونے کے باعث لادینی کا مرکز کہا جاتا ہے ، کم سے کم اسلام کے ماننے والوں پر کوئی قدغن نہیں ہے اور جیسا کہ لینن کے اشتراکی منشور کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے ، ہر شخص کو اپنے عقائد کی حد تک آزادی میسر ہے ۔ صرف اتنی بات ہے اور اسے قابل اعتراض نہیں کہا جاسکتا کہ دین و مذہب کے نام پر سیاست میں یا نظام حکومت میں کسی قسم کی مداخلت گوارا نہیں کی جاتی ۔ کوئی عیسائی رہے یا یہودی ، مسلمان رہے یا بودھی یا لادین ، ارباب اقتدار کو کوئی سروکار نہیں ہوتا ۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ اس سرزمین پر ہر چھوٹے بڑے شہر میں حتیٰ کہ قصبات اور دیہات میں بھی مسجدیں ، کلیسا ، مندر اور دوسری عبادت گاہیں موجود ہیں ۔ مسجدوں میں محراب و منبر کے زیر سایہ رکوع و سجود کرنے والے کثیر تعداد میں ملتے ہیں ۔ تاجیکستان اور ازبکستان کی ریاستوں میں تپاشا خواجہ علمدار ، خواجہ عبیداللہ احرار ، ملا یعقوب چرخی ، خواجہ یعقوب جامی اور

حضرت اسمٰعیل بخاری کی مساجد بے حد شاندار اور مشہور ہیں - یہ ان علاقوں میں ہیں جن پر مسلمانوں نے گیارہ سو سال تک باقاعدہ حکومت کی اور اپنے دینی اثرات ہر اعتبار سے اس طرح چھوڑے کہ ان کے لمعات آج تک نور اسلام پھیلا رہے ہیں -

ضیاء الدین بابا خانوف

ہر علاقے کے علمائے دین ، اعلا مذہبی پیشوا اور مفتی سمجھے جاتے ہیں جن میں جناب ضیاءٔ الدین بابا خانوف بھی ایک نمایاں شخصیت کے حامل ہیں - جنوبی حصۂ سوویت یونین کی اکثر ریاستوں میں انہیں بیشتر لوگ اپنا روحانی باپ سمجھتے ہیں - اور یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے کہ وسط ایشیا میں رہنے والے مسلمانوں کے ان سربراہ کا نام اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر دور دور تک احترام سے لیا جاتا ہے - ایسے ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے - موصوف دوبار پاکستان آئے ہیں اور ان کی بڑی قدر و منزلت ہوئی ہے - انہوں نے ایک موقع پر کہ جب وہ ہمدرد لیبارٹری ، ہمدرد لائبریری اور ہمدرد مطب دیکھنے آئے تو پاکستان کو اپنا ہی وطن کہا تھا - یہ ان کی بلند خیالی کا ثبوت ہے - پاکستان کے لئے اس سے بڑی عزت افزائی اور کیا ہوسکتی ہے -

بابا خانوف ایک عالم دین کے خاندان میں پیدا ہوئے - اس چیز نے بچپن ہی سے ان کی زندگی کا راستہ متعین کردیا - ۱۹۱۳ء میں جب ان کی عمر صرف پانچ سال تھی ، انہیں مسجد طلحہ شیخ کے دینی مدرسے میں تعلیم پانے کے لئے بھیج دیا گیا ، جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پڑھنا لکھنا سیکھا -

اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں انہوں نے قرآن شریف پڑھا اور حفظ کرلیا ۔ اس کے بعد انہوں نے کوکل داش مدرسہ میں مشہور و معروف عالم دین یوسف خواجہ دوملا کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کی ۔ اسی زمانے میں وہ "بارک خانہ" کی جماعتوں میں جانے لگے جہاں مشہور عالم دینیات علاء الدین درس دیا کرتے تھے ۔ ۱۹۲۶ء میں وہ شیخ محمد سعید الاصالی کے مرید ہوگئے جو ایک ممتاز عالم دین تھے ۔ انہوں نے ان سے عربی تفسیر، حدیث اور دوسرے مضامین پڑھے ۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے تربیتی نصاب مکمل کیا اور سند حاصل کی ۔ اگلے برس وہ تاشقند کی **ایک** مسجد میں امام مقرر ہوگئے ۔

۱۹۴۲ء میں ضیاء الدین بابا خانوف کے والد شیخ ایشان بابا خان ابن عبدالمجید خان کی سعی و کاوش اور پہل کاری پر وسط ایشیا، خصوصاً تاجیکستان اور قزاقستان کے مسلم مذہبی بورڈ کے قیام کا کام شروع ہوا اور اس طرح وہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کے مذہبی مرکز کے سرگرم منتظمین میں شامل ہوگئے ۔ انہوں نے اس زمانے کی مختلف مذہبی تنظیموں کے حاصل کردہ تجربے کا مطالعہ کیا، نئے مذہبی ادارے کے تنظیمی اصول مرتب کئے اور اکتوبر ۱۹۴۳ء میں منعقد ہونے والی وسط ایشیا کے علمائے دین کی پہلی کنگرس کی تیاریوں میں حصہ لیا ۔ اس کنگرس نے وسط ایشیا اور قزاقستان کے مذہبی بورڈ کو مستقل بنیادوں پر قائم کردیا ۔ ان کے والد شیخ ایشان بابا خان اس مذہبی بورڈ کے چیرمین کثرت رائے سے منتخب ہوئے اور وہ خود قاضی مقرر کرلئے گئے ۔

اس وقت سے ضیاءُ الدین بابا خانوف کی دینی سرگرمیاں مذہبی بورڈ کے کاموں سے قریبی طور پر وابستہ رہیں - ۱۹۴۸ء میں وہ مذہبی بورڈ کے نائب صدر منتخب ہوگئے اور ۱۹۵۷ء میں ان کے والد کے انتقال کے بعد وسط ایشیا اور ملحقہ علاقوں کے مسلم نمائندوں کی کنگرس نے انہیں اتفاق رائے سے بورڈ کا چیرمین بنالیا - انہیں مفتی کے مصدقہ منصب پر بھی فائز کرلیا گیا -

مفتی بابا خانوف مذہب اسلام کے فروغ اور تبلیغ کے لئے بہت کچھ کام کر رہے ہیں - انہوں نے "فقہُ السنہ" نامی کتاب کا جو دنیائے اسلام میں بے حد مشہور ہے، عربی سے تاجیک اور ازبک زبانوں میں ترجمہ کیا اور کتاب پر اپنی ذاتی رائے بھی پیش لفظ کی صورت میں لکھ دی - انہوں نے ایک رسالہ بھی مرتب کیا جس میں شریعت کے قوانین کی عمومی توضیح کی گئی ہے - انہوں نے عظیم مفکر اور طبیب بو علی سینا کی کتاب "قانون" کو بھی مذکورہ بالا دونوں زبانوں میں منتقل کردیا - علم طب پر یہ ایسی مستند کتاب ہے جو آج تک درسی کتابوں میں شامل کی جاتی ہے -

مفتی ضیاء الدین بابا خانوف نے عملی طور پر سیاحت میں حصہ لیا تاکہ دور دراز علاقوں کے ہم مذہب بھائیوں سے ملیں - چنانچہ انہوں نے کراچی، مکہ معظمہ، بغداد، قاہرہ اور دوسرے شہروں میں منعقد ہونے والی بہت سی اسلامی کانفرنسوں میں حصہ لیا اور مقالے پڑھے - وہ چھ مرتبہ حج بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کرچکے ہیں - سوویت یونین کی حکومت نے امن اور بین الاقوامی دوستی کی جدوجہد میں ان کی پرخلوص کاوشوں کا

اعتراف کرتے ہوئے انہیں '' تمغۂ اعزاز '' دیا ہے۔

مفتی ضیاء الدین بابا خانوف اپنے خاندان کے ایک مثالی رکن اور ایک شفیق باپ ہیں۔ انہوں نے اپنے عزیزوں کو پاکیزگی ، صداقت اور محنت کی تعلیم دی اور کہا کہ اکل حلال کو ہمیشہ مدنظر رکھا جائے۔ ان کی سب سے بڑی لڑکی نفیسہ ایک گھریلو خاتون ، ایک مخلص شریک حیات اور چھ پیارے بچوں کی ماں ہیں۔ ان کی دوسری بیٹی انیسہ ڈاکٹر ہیں۔ ان سے چھوٹے ان کے بیٹے شمس الدین اور بیٹی محسنہ عربی زبان سیکھ رہے ہیں۔ اور ماسٹر آف آرٹس کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے مقالات لکھ رہے ہیں۔ سب سے چھوٹے دو بیٹے ابھی اسکول جاتے ہیں۔ اپنی نجی زندگی میں مفتی موصوف کو باغبانی کا شوق ہے۔ وہ روزانہ کچھ وقت نکال کر اپنے مکان کے باغیچے میں جاتے اور پودوں اور پھولوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

مفتی بابا خانوف ۱۹۶۸ء کے شروع میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کی تقریبات میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائے تو وہ روسی مسلمانوں کے گیارہ رکنی وفد کے سربراہ تھے، اسلئے کہ وہ اس وقت قاذقستان اور تاجیکستان کی اسلامی کونسل کے سربراہ تھے اور اسی نے انہیں نامزد کیا تھا۔ یہ کانفرنس نزول قران پاک کی چودہ سو ویں سالگرہ منانے کے سلسلے میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے بلائی تھی۔ اس موقع پر بابا خانوف نے سوویت یونین میں اسلام کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مفید معلومات فراہم کیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت روس میں پانچ کروڑ مسلمان آباد ہیں اور ہر سال ان کی

تعداد بڑھ رہی ہے۔ بڑی مسجدوں کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے اور اتنی آزادی ہے کہ اگر ایک بستی کے بیس مسلمان چاہیں تو اپنے لئے ایک مسجد تعمیر کرسکتے ہیں۔ تاشقند کی بعض مساجد دو سو سال پرانی ہیں اور بعض اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ مثلاً مسجد خوجہ اقرار پندرھویں صدی عیسوی میں اور خوجہ زومراد سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں تعمیر ہوئی تھی لیکن ان کی دیکھ بھال اس طرح کی جاتی ہے کہ زائرین کو نو تعمیر معلوم ہوتی ہیں۔ یہی حال بخارا کی مسجد خوجہ زین الدین کا ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی۔ قران پاک کے نسخے عام طور پر کتب فروشوں کی دکان پر فروخت نہیں ہوتے لیکن نجی ناشرین فرمائش پر مہیا کرتے ہیں۔ اس طرح ہر مسلمان گھرانے میں اور مسجدوں میں قران پاک موجود رہتا ہے۔ قران پاک کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں جن میں علاقائی زبانوں میں ترجمے والے ایڈیشن بھی شامل ہیں۔ یہ ان کے لئے ہیں کہ جو کلام پاک کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہیں۔ قران کو حفظ کرنے والوں کی تعداد بھی خاصی زیادہ ہے۔ وہ ماہ رمضان میں تراویح میں باقاعدہ حصہ لیتے ہیں۔ قران پاک کے علاوہ احادیث اور دوسری مذہبی کتابیں بھی چھپتی رہتی ہیں جن کی طباعت کا انتظام مذہبی بورڈ کرتے ہیں اور برائے نام قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔

بابا خانوف نے فرمایا کہ روسی مسلمان فریضۂ حج ادا کرنے بھی جاتے ہیں۔ اس میں صرف ایک قباحت ہے کہ روسی جہازوں کو سر زمین عرب پر اترنے کی اجازت نہیں ہے لیکن اس

ضمن میں روسی مسلمان سعودی عرب کے فرمانروا پر زور ڈال رہے ہیں کہ کم سے کم حاجیوں کے جہازوں کو وہاں اترنے کی اجازت حج کے خاص موقع پر دیدی جائے۔ بنیادی طور پر حکومت نے اس درخواست کو مان لیا ہے۔ مسلمانوں کی شادیاں بھی اسلامی روایات اور احکامات کے مطابق ہوتی ہیں۔ البتہ طلاق یا دوسرے تنازعات کی صورت میں جو شاذ و نادر ہوتے ہیں، شادیوں کے اندراج سے متعلق مذہبی دفاتر کے علاوہ عدالتوں سے بھی رجوع کرنا پڑتا ہے۔

انہوں نے بتایا کہ مسلمانوں کے لئے مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ صلاحیت و استعداد رکھنے والے مسلمانوں کو سرکاری عہدوں پر فائز کیا جائے۔ بالفاظ دیگر مذہبی اعتبار سے باشندگان روس میں کوئی تخصیص نہیں کی جاتی۔ بس اتنی بات ہے کہ مسلمان مذہبی تعلیم و تربیت سے قطع نظر قومی نظام تعلیم کے مطابق بھی سند حاصل کریں۔ انہوں نے بتایا کہ روس میں تقریباً سو قومیتوں کے افراد آباد ہیں لیکن مذہبی عقائد سب کے یکساں ہیں جو زیادہ تر حنفی عقائد رکھتے ہیں لیکن اس لحاظ سے بھی ان میں کوئی امتیاز قائم نہیں ہے انہوں نے یہ بھی بتایا کہ روسی مسلمان رابطۂ عالمی اسلامی سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور ان کے نمائندے اس میں شریک ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کے بارے میں انہوں نے اچھی رائے قائم کی اور پاکستان کی اس کوشش کو سراہا کہ اصل وقت سے بہت پہلے اس نے چودہ سو سالہ تقریبات منانے کے لئے اولین

قدم اٹھایا ہے۔ کانفرنس کی کامیابی پر گہرے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے امید ظاہر کی کہ پاکستان کے مسلمان بھائی آئندہ بھی اس ضمن میں پہل کرتے رہیں گے تاکہ یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔

جناب مفتی ضیاء الدین بابا خانوف جولائی ۱۹۷۸ء میں بھی پہلی ایشیائی اسلامی کانفرنس کے لئے پاکستان تشریف لائے تھے۔ انھوں نے کانفرنس کی نشستوں میں حصہ لینے کے علاوہ ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کیا جس میں تازہ ترین اعداد و شمار کی روشنی میں روسی مسلمانوں کی موجودہ تعداد اور ان کی موجودہ صورت حالات پر اظہار خیال کیا۔ ان کے بیان کے مطابق اب مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ سے بھی بڑھ گئی ہے اور صدی ختم ہونے تک نو اور دس کروڑ کے درمیان ہوجائیگی۔ کانفرنس کی کارروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد مفتی موصوف نے کراچی میں ہمدرد کے دفاتر دیکھے اور ہمدرد کی لائبریری کے لئے قران پاک کا ایک نایاب تاریخی نسخہ پیش کیا جو راقم الحروف نے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کا صدر ہونے کے اعتبار سے بصد شکریہ قبول کیا اور اپنی لائبریری میں بڑے اہتمام کے ساتھ محفوظ کرلیا ہے۔

''کافی بریک،، کے لئے مندوبین کے لئے کانفرنس ہال کی بالائی منزل پر بڑے سلیقے کا اہتمام تھا۔ شریک تو میں بھی ہوا، یہ دوسری بات ہے کہ لذت کام و دہن سے اجتناب کیا۔ البتہ باتیں دلچسپ ہوتی رہیں اور یہ اندازہ نہ ہوسکا کہ ''کافی بریک،، ختم ہوا اور اجلاس دوبارہ شروع ہوگیا ہے۔ وہ تو مجھے چیکوسلواکیہ کے اسکالر نے بتایا کہ اب اجلاس میں چلنا

چاھئے - مجھے بڑی شرمندگی ھوئی ، تاھم فوراً اجلاس میں پہنچ گیا -

نقاب کشائی مجسمۂ عینی و میکسم گورکی

نئے کانفرنس ھال کے ایک کونے میں دو مجسمے سفید برقعے اوڑھے تھے - دو بجے ان کی نقاب کشائی کی رسم ادا ھونی تھی - میں باھر آیا - جناب فیض صاحب میرے ساتھ آئے - میں نے کہا :

''جناب ! یہاں تین مجسمے ھیں - دو وہ سامنے ھیں اور تیسرا میں ھوں ،،-

میرا لباس سفید تھا - مجسمے بھی سفید کپڑے اوڑھے ھوئے تھے - صرف وضع قطع مختلف تھی - فیض صاحب ھنس پڑے - ان کی ھنسی بعض دفعہ بڑی معنی خیز ھوتی ھے -

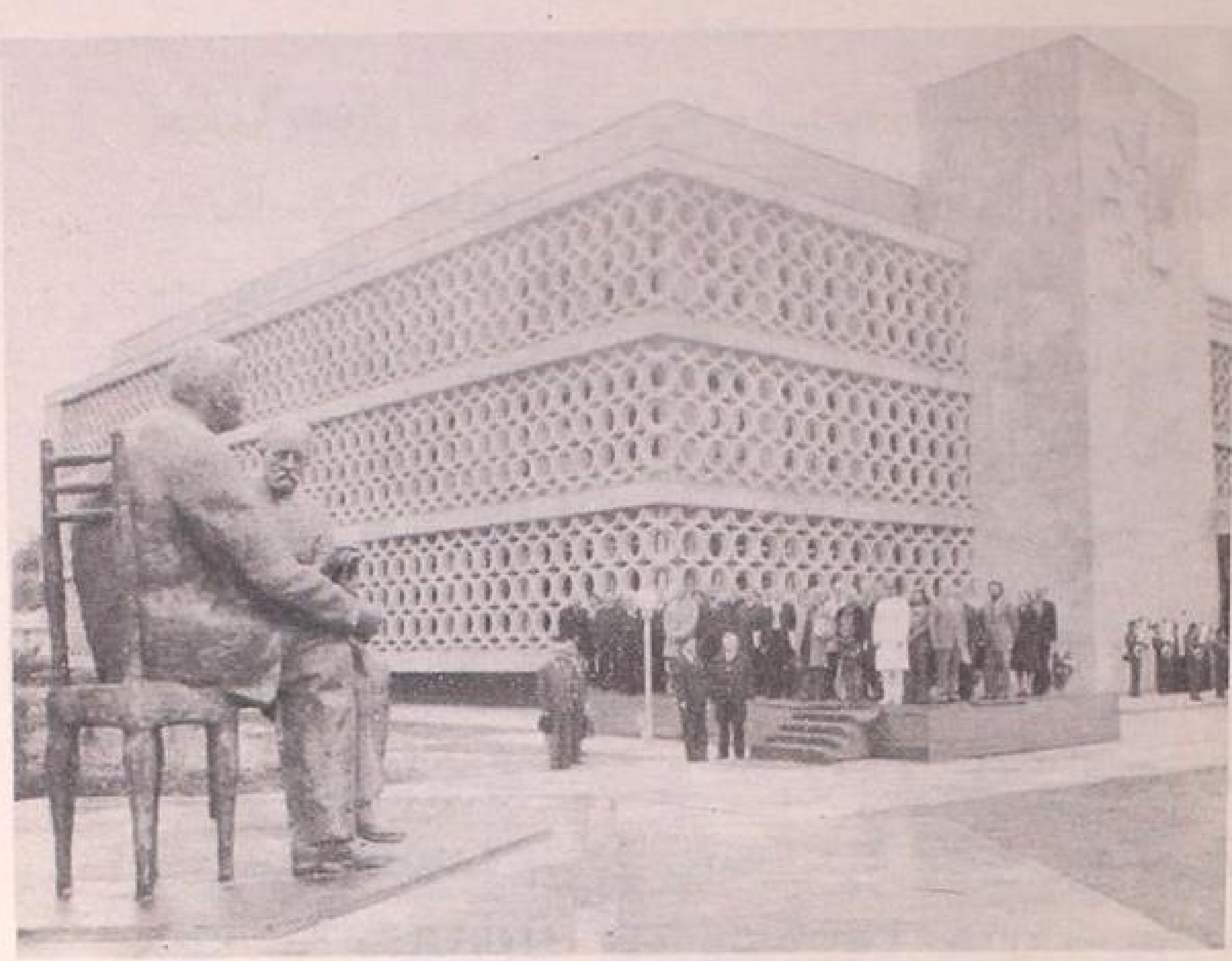
وزیراعظم تاجیکستان نے یہ رسم ادا کی - گرہ ذرا سخت ھوگئی تھی - ڈوری کھینچی ، جھٹکا دیا مگر کسی طور کھل نہ سکی - ایک منتظم صاحب نے بھاگ کر گرہ ڈھیلی کردی - اس طرح نقاب گر پڑے - البتہ میری سفید شیروانی جوں کی توں رھی - سارے لوگوں نے زبردست تالیاں بجائیں - کانفرنس میں شامل ھونے والے مندوبین کے علاوہ سڑک پر بھی شائقین کا مجمع لگ گیا تھا - مگر اس قدر منظم تھا یہ مجمع کہ اس کا جواب نہیں - نہ کوئی دھکم پیل ، نہ کوئی ھا ھو ، یکسر خاموشی تھی - حالانکہ وہ گھنٹہ بھر سے زیادہ عرصے سے وھاں کھڑے تھے اور صبر و سکون کے ساتھ تقریریں سنتے رھے تھے -

مجسمے میں دکھایا گیا تھا کہ میکسم گورکی اور صدرالدین عینی دونوں ایک جگہ کرسیوں پر برابر بیٹھے ھیں -

گویا تبادل خیال کر رہے ھیں۔ بڑے دلکش مجسمے تھے۔ ان کا بت ساز بھی وھاں موجود تھا۔ میں نے ھمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کی طرف سے ان کو مبارکباد دی اور طنز و مزاح کے ملے جلے انداز میں کہا کہ آپ نے دنیا کے بت کدوں میں ایک اور بت کا اضافہ کردیا ھے۔

صدر الدین کے بارے میں تو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں ھے، البتہ میکسم گورکی کی شخصیت اس لحاظ سے قابل غور تھی کہ وہ عینی کے ھم عصر ھی نہیں، ساری زندگی ھم جلیس، ایک دوسرے کے غم میں شریک اور ھر کام میں ساتھی رہے تھے۔

میکسم گورکی دراصل قلمی نام تھا الیکسی میکسیمو فچ پیشکوف کا جو ۱۸۶۸ء میں پیدا ھوئے اور بہت سی کتابیں لکھ کر ۱۹۳۶ء میں فوت ھوگئے۔ وہ صغر سنی ھی میں یتیم ھوگئے تھے۔ ان کی پرورش اور گھر کے گزارے کے لئے کوئی سہارا نہیں تھا، نہ کہیں سے امداد مل سکتی تھی۔ اس لئے ان کی بیوہ ماں نے، جس کے لئے دوسری شادی بھی ممکن نہیں تھی، حالات سے مجبور ھوکر کچھ غلط ناجائز طریقے اختیار کئے جن میں لغزشیں شامل تھیں۔ وہ ماں کی اس روش کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن ماں کے لئے زندگی کے سب سے اھم مسئلے کا کوئی اور حل بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں سے باز پرس کی اور اپنے طفلانہ انداز میں اسے سمجھایا بھی کہ وہ اپنے اطوار بدل دے لیکن ماں کے لئے دوسرا چارۂ کار نہیں تھا۔ کم سن بچہ بارہ سال کی عمر میں گھر سے فرار ھوگیا۔ اس کو اپنی اور اپنی ماں کی وہ زندگی پسند نہیں تھی۔ لیکن اس عمر میں کوئی اور بہتر زندگی گزارنا



تقریبات نقاب کشائی مجسمۂ عینی و گورکی -



مجسمۂ صدرالدین عینی و میکسم گورکی - ان ہم عصر دانشوروں
کے حضور گل ہائے عقیدت پیش کئے جا رہے ہیں -

بھی اس کیلئے ممکن نہیں تھا ۔ اس لئے وہ خود بھی آوارہ ہوگیا ۔ ہر قسم کی بد چلنی کے داغ اس کے معصوم دامن پر لگ گئے ۔ اس نے اس عہد کی تمام یاد داشتیں کتابی صورت میں جمع کردیں جو "میرا بچپن" کے نام سے شائع ہوئی ہیں ۔ وہ حقیقت پسندانہ اسلوب نگارش کا شاہکار ہے ۔

جب عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ گورکی کا شعور بیدار ہوا تو انہوں نے ماں کی مجبوریوں کو محسوس کیا اور جواز پیدا کرلیا ۔ انداز فکر میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی ۔ اب اظہار ناراضگی کے بجائے ماں کا احترام ان کے دل میں پیدا ہوگیا اور وہ ان کے سامنے جھک گئے ۔ انہوں نے ہر شخص کی ماں کو، خصوصاً اپنی ماں کو لائق تعظیم کہنا شروع کیا ۔ اپنے انھی خیالات و احساسات کو انہوں نے ایک اور کتاب "ماں" میں، جو ناول کے انداز میں لکھی گئی، جمع کردیا ۔ یوں تو ان کی ہر تحریر کی قدر و منزلت ہوئی اور ان کے خیالات کو سراہا گیا لیکن " ماں " کو روسی ادب میں بڑا درجۂ قبول حاصل ہوا ۔ اسے گورکی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے ۔ انہوں نے اور بھی کئی ناول، ڈرامے اور مختصر کہانیاں لکھیں، جو ان کی قوم کے لئے سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی ہیں ۔

وہ ٹالسٹائی کے ہم عصر تو نہیں کہے جاسکتے کیونکہ موخرالذکر عمر میں ان سے پچاس سال بڑے تھے لیکن گورکی نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور اسی لئے ان کا احترام کرتے تھے ۔ البتہ مشہور افسانہ نگار چیخوف اور ناول نگار صدرالدین عینی گورکی کے ہم عصر تھے ۔ ان کی عمروں میں محض چند سال کا فرق تھا ۔

شاید اسی اعتبار سے تاجیکستان کے ارباب اقتدار نے گورکی اور عینی کو ایک دوسرے کا هم جلیس ثابت کرنے کے لئے ایک هی مجسمے کی صورت میں قریب قریب بٹھا دیا۔ اس اعتبار سے جس مشترک مجسمے کی نقاب کشائی هوئی، وہ میرے نزدیک تاریخی اهمیت کا حامل هے۔

اسی سال ماہ ستمبر میں ٹالسٹائی کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ پیدائش کا جشن منایا جائیگا۔ ٹالسٹائی نے عوامی ذهنوں کو جس طرح متاثر کیا هے، اس کے بارے میں روسی ادیب بار بار زور دیتے رهے هیں۔ ٹالسٹائی کی وفات سے دس سال پہلے آنتن چیخوف نے لکھا تھا:

" مجھے ٹالسٹائی کی موت کے تصور سے خوف آتا هے۔ اگر ان کی وفات هوگئی تو میری زندگی میں ایک بڑا خلا پیدا هو جائیگا۔ ان کے بغیر همارے ادیب کی حیثیت بھیڑوں کے ایک ایسے گلے کی سی رہ جائیگی جس کا رکھوالا کوئی نہ هو "۔

بیس سال پہلے روسی ناول نگار اور افسانہ نویس آئیوان ترگنیف نے یہی سوچا تھا اور ٹالسٹائی کی وفات کے دو سال بعد الیکساندر بلاک نے بھی یہی خیال ظاهر کیا تھا کہ ٹالسٹائی کی وفات سے ترقی پذیر دانشور اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگیں گے۔

کانفرنس کے دوران هر موقع پر اور نقاب کشائی کے وقت اجتماع میں بھی میرا لباس سب کے لئے توجہ کا مرکز رها۔ سارا سفید لباس، اچکن، علی گڑھ شرعی پاجامہ، سفید موزے اور سفید جوتے تک — لوگ اوپر سے نیچے تک دیکھتے تھے۔ میں



سمہٴ صدر الدین عینی پر گل ہائے عقیدت پیش کرنے کے لیے
ر جمہوریہٴ تاجیکستان اور رفقاء قدم زن ہیں۔



مندوبین کنگرس عالمی صدر الدین عینی ،مجسمہٴ عینی پر گل ہائے
عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہیں۔

بڑا خوش ہوتا تھا کہ میں نے اپنے لباس میں کوئی تبدیلی نہ کرکے اپنے لئے ایک انفرادیت پیدا کرلی ہے۔ یہ میرے لئے موجب فخر و انبساط تھا۔

پاکستان میں مجسمہ سازی؟

ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف نے کہ جو میرے مترجم تھے نقاب کشائی کی رسم ادا ہونے کے بعد سوال کیا:

''کیا پاکستان میں مجسمہ سازی ہوتی ہے اور کیا مجسمے وہاں لگائے جاتے ہیں''۔

میں نے نفی میں جواب دیا اور فوراً سینکڑوں سال پہلے کا وہ واقعہ یاد دلایا کہ جب محمود غزنوی نے زر و جواہر کی پیشکش قبول کرنے کے بجائے سومناتھ کے مندر کا بت توڑ ڈالا تھا اور اس ضمن میں علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھ کر اس کا ترجمہ کر دیا:

قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

انہیں خود بھی پاکستان کا مزاج معلوم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کی اساس اور بنیاد اسلام ہے اور اسلام میں مجسمہ سازی کی اجازت نہیں ہے۔ اس کا مزاج بت شکنی ہے، بت سازی نہیں ہے۔ بت شکنی کے بعد ہی تو کعبہ وجود میں آیا تھا۔ مگر یہ کعبہ کی چوکور عمارت مرکز عبادت نہیں ہے بلکہ اسے ایک سمت کی حیثیت حاصل ہے۔ اصل مرکز عبادت تو ذات باری تعالیٰ ہے۔ کعبہ تو مقام اجتماع مرکز ہے۔ اس چوکور عمارت کے اوپر کھڑے ہوکر ہی

حضرت بلال حبشی رح نے اذان دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا :
" اللہ بڑا ہے ، اللہ بڑا ہے ، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں "۔
شاعر کی زبان میں یوں کہا گیا ہے :

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں ، لا الہ اللہ

روس میں سب سے زیادہ قابل تعریف مجسمے تو لینن کے ہیں۔ ہر جگہ ، ہر مقام پر ، ہر سڑک کے چوراہے پر ، ہر کتاب میں اور یہی نہیں ، ہر دماغ میں لینن کا مجسمہ موجود ہے یا اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ کوئی ذہن اس سے خالی نہیں ہے۔ لینن کو انہوں نے خدا بنا دیا ہے۔ مرکزیت اسے ہی حاصل ہے۔ لینن ہی کے نقطۂ فکر سے چین میں انقلاب برپا ہوا تھا مگر وہاں کا خدا اب بدل چکا ہے۔ وہاں اب ماؤ چینیوں کا خدا ہے۔ روس و چین دونوں واحد نظریاتی سرحدیں رکھتے ہیں مگر سیاسی اختلاف نے ایک کے بجائے دو خدا کردیئے ہیں اور اس طرح نہ جانے کتنے خدا اور وجود میں آجائیں گے۔ کم ال سنگ نام کا ایک اور خدا کوریا میں زیر تعمیر ہے۔

نقاب کشائی کے بعد روس کا قومی ترانہ بجایا گیا۔ سب لوگ ست کھڑے رہے۔ نہ صرف شرکائے کانفرنس بلکہ سڑک پر موجود مجمع بھی ساکت و صامت رہا اور جب تک ترانہ ختم نہ ہوا کوئی اور آواز کان میں نہ آئی۔ پھر عام لوگ ان مجسموں کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھے۔ میں نے قریب جا کر فنی کار گزاری کے اعتبار سے بغور دیکھا۔ پھول ان کے قدموں میں احترام و عقیدت کے ساتھ رکھے جارہے تھے۔ محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ

بھی آگے بڑھیں ۔ انھوں نے ہندوؤں کی طرح دونوں ہاتھ جوڑ کر دونوں مجسموں کو پرنام کیا اور پھر ڈنڈوت کے انداز میں گورکی اور عینی کے چرنوں کی داسی بن گئیں ۔ اسقدر جھکیں کہ چرنوں میں لیٹ گئیں ۔

میرا لباس قابل غور

مجسموں کے برقعے اور میرے لباس سے متعلق بیان کے ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا ۔ مناسب ھے کہ اس کو میں یہاں لکھ ہی دوں ۔ یہ ۱۹۴۸ء کا ذکر ھے ۔ عالمی ادارۂ صحت کے علاقائی مرکز یعنی ایسٹرن میڈی ٹرینین ریجن کے مرکز اسکندریہ کے زیر اہتمام قاھرہ میں علاقائی اجلاس تھا ۔ اس اجلاس میں شرکت کے لئے حکومت سندھ نے میرا نام تجویز کیا ۔ واقعہ یہ ھے اور سچ بات یہ ھے کہ اس وقت سندھ کے وزیر صحت میرے جگری دوست سید میراں محمد شاہ صاحب تھے ۔ میں نے ان سے بغیر غور و فکر کہ دیا کہ میں اس اجلاس میں جانا چاھتا ھوں اور سیدی شاہ صاحب نےمیرا نام بغیر غور و فکر منظورکردیا ۔ بھلا ڈاکٹر لوگ اس فیصلے کو کیسے برداشت کرسکتے تھے ۔ مسئلہ خاصا الجھ گیا ۔ سید میراں محمد شاہ کو بھی ضد ھوگئی ۔ وہ اس وقت کے مرکزی وزیر صحت جناب عبدالستار پیرزادہ صاحب سے ملے اور بالآخر ان سے تحریری اجازت نامہ میری شرکت وفد کے لئے حاصل کرلیا اور میں قاھرہ روانہ ھوگیا ۔ جناب حبیب اللہ بہار صاحب (مشرقی پاکستان کے وزیر صحت) وفد کے قائد تھے ۔ کرنل آفریدی (عالمی ادارۂ صحت میں ملیریا کے ماھر) کرنل صدیقی (سرجن) اور جناب جی اے مدنی (ڈپٹی سیکریٹری،

مرکزی وزارت صحت ، پاکستان) تین اراکین تھے اور چوتھا رکن میں تھا ۔ مدنی صاحب کے نام پیرزادہ صاحب نے کوئی خط دیا تھا ۔ شاید یہ ہدایت کی گئی تھی کہ مجھے وفد میں شریک رکھا جائے ۔ یا ممکن ہے کوئی اور ایسی ہی ہدایت ہو ۔ آج تک مجھے یہ راز نہیں بتایا گیا ۔

کرنل آفریدی صاحب کا مزاج یہ تھا کہ جب ہم کانفرنس ہال میں پہنچے تو سب کو پروگرام اور متعلقہ کاغذات دئے جارہے تھے ۔ کرنل آفریدی صاحب نے واضح طور پر منع کردیا اور کاغذات مجھے نہیں ملے ۔ کرنل صدیقی صاحب کا رویہ بھی بڑا خراب تھا ۔ طب مشرق کی وہ تحقیر کرتے تھے اور بار بار کرتے تھے ۔ جناب مدنی معتدل تھے ۔ انہوں نے یہ پتہ ہی نہ چلنے دیا کہ اس وفد میں میری حیثیت کیا ہے ۔ ویسے ان کا انداز مشفقانہ تھا ۔ اسکندریہ میں جب تمام وفود کے اعزاز میں لنچ ہوا اور لنچ اسی جگہ ہوا کہ جہاں جنگ عظیم میں اسٹالین ، روزویلٹ اور چرچل جمع ہوئے تھے تو اس لنچ میں سور کا گوشت بھی شامل تھا ۔ میں بالکل تمیز نہیں کرسکتا تھا ۔ جناب مدنی صاحب آپے سے باہر ہوگئے ۔ انہوں نے احتجاجاً لنچ سے اٹھ جانے کا فیصلہ کیا ۔ اس احتجاج میں انہوں نے مجھے بھی شریک کرلیا ۔ ہم دونوں اٹھ گئے ۔ ہمارے باقی ساتھی بیٹھے رہ گئے ۔ ہم دونوں نے شہر کا رخ کیا اور بازار میں کبوتر کا شوربہ پیا اور کسی جگہ سے روٹی لے لی ۔ غرض جب تک اہرام مصر کے سامنے ہوٹل میں لنچ ختم ہوا ، ہم دونوں اسکندریہ کی گلیوں میں گھومتے رہے ۔

مدنی صاحب کی یہ بات بڑی دل کو لگی اور میں ان کے احترام میں زیادہ مستعد ہوگیا۔ یاد آتا ہے کہ قصر شاہی میں ہمارا وفد بھی شاہی کتاب پر دستخط کرنے گیا۔ وہاں مدنی صاحب نے اپنے دستخط "محمد علی جوہر" کئے۔ یہ بات میری سمجھ میں جب بھی نہ آئی تھی اور اب بھی نہیں آئی ہے۔

کرنل آفریدی اور کرنل صدیقی دونوں میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ میں مدنی صاحب کی حفاظت میں تھا۔ ان کا یہ احسان مجھے یاد ہے۔ مدنی صاحب اس زمانے میں چمڑے کی فوجی اسٹک ہاتھ میں رکھتے تھے اور جب ضرورت پڑتی، وہ اسٹک مجھے تھما دیتے تھے اور میں اس کی حفاظت کرتا تھا۔ اس سے میں تنگ آگیا۔ ایک جگہ انہوں نے اسٹک مجھے دی اور میں نے لے لی اور جہاں ہم تھے، وہیں میں نے چھوڑ دی۔ اور جب مدنی صاحب نے واپس مانگی تو میں نے کہ دیا کہ آپ نے جہاں دی تھی، میں وہیں چھوڑ آیا ہوں۔ مدنی صاحب کا میں نے یہ نقصان کیا۔ میں اسے آج بھی یاد کرتا ہوں مگر میری طرف سے یہ بغاوت تھی۔

کرنل آفریدی صاحب نے ایک دن کہا:

"آپ یہ کیا لباس پہن کر آئے ہیں۔ شیروانی سے قاہرہ کے لوگ نفرت کرتے ہیں (They look down upon this dress.)

مجھے کرنل آفریدی کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔ میں نے ان کو کوئی جواب نہیں دیا مگر اس دن یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس اچکن اور شیروانی کی دنیا بھر میں عزت کراؤنگا

اور میں نے اپنا یہ لباس کبھی تبدیل نہیں کیا ۔ دنیا بھر میں اسی لباس سے پھرتا ہوں ۔ اب کوئی اس کی تحقیر نہیں کرتا ۔ مجھے اس پر فخر ہے ۔

جامعۂ تاجیکستان

آج کا پروگرام نہایت اچھا رہا کہ جامعۂ تاجیکستان جانے کا موقع ملا ۔ رئیس الجامعہ بابا جان پولاد تھے ۔ وہ تاجیکی ہیں اور بہت نفیس انسان ہیں ۔ ان کے چہرے پر ڈاکٹر محمود حسینیت ہے اور ان کا انداز بڑا سنجیدہ ہے اور پر از محبت و شفقت ۔ ان سے مل کر واقعی دل خوش ہوگیا ۔ انہوں نے جامعۂ تاجیکستان کے بارے میں چند باتیں بتائیں جو میں نے ذہن میں بٹھالیں مثلاً :

(۱) آج سے تیس سال قبل جب سوال کیا جاتا تھا کہ کوئی پڑھا لکھا ہے ، تو جواب دیا جاتا کہ " ملا " مگر اب یہ بات نہیں ہے ۔ یہاں ہر شخص تعلیم یافتہ ہے ۔

(۲) آج سے تیس سال قبل جب یہ جامعۂ تاجیکستان قائم ہوئی تھی تو اس میں صرف چودہ استاد تھے اور دو سو طالب علم ۔ اب اس جامعہ میں چودہ تو پی ایچ ڈی ہیں اور درجنوں دوسرے استاد ہیں ۔ طالب علم بارہ ہزار ہیں جن میں آدھے لڑکے اور آدھی لڑکیاں ہیں ۔

(۳) اس وقت جامعۂ تاجیکستان میں سترہ فیکلٹیز ہیں ۔

(۴) ہم منصوبہ بندی کرتے ہیں ۔ یعنی ہمیں تعمیر ملت و وطن کے لئے جس شعبے میں جس مہارت کی حاجت

ہوتی ہے ، ہم طلبہ کو اسی انداز پر تعلیم دیتے ہیں تا کہ تعمیر کا کام بند نہ ہو اور خود طالب علم فارغ تعلیم ہو کر اپنے وقت و طاقت کو ضائع نہ کرسکے بلکہ اس کے لئے کام مہیا ہو۔

(۵) تعلیم دو زبانوں میں ہوتی ہے۔ روسی زبان اور تاجیکی یعنی فارسی زبان۔ اس وقت ستر فیصد طلبہ تاجیکی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور صرف تیس فیصد روسی زبان میں ۔

جامعۂ تاجیکستان کے بارے میں تمام معلومات پر مشتمل روسی زبان میں ایک کتابچہ دیا گیا جو میں نے محفوظ کرلیا ۔ جناب رئیس الجامعہ سے ملاقات دلچسپ رہی ۔ اس کے بعد طلبہ سے ملاقات تھی ۔ جناب بابا جان پولاد صاحب کے معیت میں ہم سب جامعہ کے اسمبلی ھال میں گئے ۔ یہاں کم از کم ایک ہزار طلبہ ، لڑکے اور لڑکیاں ، موجود تھے ۔ انہوں نے زبردست تالیوں سے ہم سب کا استقبال کیا ۔ بیشتر طلبہ و طالبات کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں ۔ وہ میرا لباس بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے ۔ مجھے کرنل آفریدی یاد آگئے۔ کئی سال گزرنے کے بعد وہ میرے اچھے دوست ہوگئے تھے ۔ ان کی قاهره والی زیادتی میرے دل پر نقش تھی مگر میں نے اپنی طرف سے کبھی ان کے احترام میں فرق نہیں آنے دیا اور بالآخر حسن اخلاق سے ان کو ہر طرح جیت لیا ۔ ہم مندوبین اسٹیج پر بیٹھ گئے ۔ جناب رئیس نے فرداً فرداً سب کا تعارف کرایا ۔ سب سے پہلے پاکستان کا نمبر آیا ۔ انہوں نے جناب فیض احمد فیض صاحب کا تعارف کرایا ۔ فیض صاحب اس

علاقے میں پہلے سے معروف ہیں ۔ ان کے لئے زبردست تالیاں بجائی گئیں ۔ دوسرا تعارف میرا تھا اور خوب تھا ۔ طلبہ و طالبات نے میرا بھی اسی جوش و خروش سے استقبال کیا ۔ پاکستان سے ان سب کو خاص دلچسپی تھی ۔ ہندستان کے بعد دوسرے ممالک کے وفود متعارف ہوئے ۔

اس تعارف کے بعد در حقیقت محفل شعر و ادب برپا ہوئی ۔ جناب رئیس نے انتخاب کر کے فرداً فرداً دعوت خطابت دی ۔ اولاً جامعۂ تاجیکستان کے ایک استاد اور ایک طالب علم نے خطاب کیا ۔ اس کے بعد مندوبین کو دعوت دی گئی ۔ جناب فیض نے اپنا کلام سنایا ۔ جناب علی سردار جعفری نے بھی اپنا ایک ترقی پسند کلام پیش کیا ۔ پھر چیکوسلوواکیہ، بلغاریہ ، افغانستان وغیرہ کی باری آئی ۔ پھر روسی ریاستوں وغیرہ کے نمائندوں نے نظم و نثر میں خطاب کیا ۔ مجموعی طور سے یہ مجلس خوب رہی ۔ طلبہ میں تنظیم قابل قدر تھی ۔ یہاں کسی طالب علم اور طالبۂ علم میں امتیاز نہ تھا ۔ سب ملے جلے بیٹھے تھے ۔ اخلاقی اقدار بلاشبہ بلند ہیں ۔

آخر میں طلبہ نے اپنا پروگرام رقص و سرود پیش کیا جو مجموعی طور پر بڑا دلچسپ تھا ۔ اس دوران میں طلبہ نے آٹوگراف کی مہم شروع کردی اور جب تک ہم جامعہ سے رخصت ہوئے ، میں آٹوگراف بکس پر دستخط کرتا رہا ۔ موٹر میں سوار ہوتے ہوئے بھی کم از کم پانچ کتابوں پر ''جاگو جگاؤ'' لکھ کر دستخط کردئے اور پاکستان ہر جگہ لکھا ۔ طلبہ میں بڑا جوش و خروش تھا ۔ تصاویر بھی لی گئیں ۔ جناب رئیس الجامعہ کے

ساتھ بھی میری کافی تصویریں لی گئیں ۔ شاید مجھے ایک دو مل جائیں ۔

ڈرامہ ۔ زندگیٔ عینی

اس دن شہر میں دو جگہ عینی ڈرامے ہو رہے تھے ۔ ایک جگہ " زندگیٔ عینی "، موضوع تھا اور دوسری جگہ عینی کی کتاب " دو خند "، پر ڈرامہ مرتب کرکے پیش کیا جارہا تھا ۔ ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب نے سوال کیا ، کہاں چلنا چاہتے ہیں ؟ میں نے جواب دیا ، جہاں آپ لے جانا چاہیں ۔ وہ مجھے عینی اوپیرا لے گئے ۔ روسی زبان میں عینی اوپیرا اس طرح لکھتے ہیں :

АИНИ ОПЕРА

آج کے ڈرامے کے مصنف جناب سیف الدین شرف الدین تھے ۔ وہ خود بھی وہاں موجود تھے ۔ ان سے ملاقات ہوئی ۔ جناب نذر صاحب ، وزیر ثقافت بھی موجود تھے ۔ اور پروفیسر امیر سعید امیر شکر بھی دیکھنے آئے تھے ۔ میں نے ان کو " شیر و شکر "، کہہ کر خطاب کیا ۔ بڑے خوش ہوئے ۔ وہ مفہوم کو سمجھ گئے ۔

ڈرامہ عینی کی زندگی پر تھا ۔ ان کا زمانۂ عسرت ، پھر ان کا تحصیل علم کے بعد " جاگو جگاؤ "، کی تحریک جسکی مخالفت ہوئی ۔ ایک ملا کو دکھایا گیا تھا کہ وہ جاسوس بنا اور امیر بخارا کی فوج یا پولیس کو عینی اور ان کے رفقاء کی نشان دہی کرتا تھا ۔ اس ملا کا کردار یہ دکھایا گیا کہ وہ سب کچھ روپے پیسے کے لالچ میں کرتا تھا اور پھر وہ ذلیل و خوار ہوا ۔

عینی کی پیشی امیر بخارا کے سامنے ہوئی۔ وہ پابجولاں دربار میں لائے گئے مگر انہوں نے امیر بخارا کے سامنے مظاہرۂ جرات کیا جس سے امیر ناراض ہوگیا اور ان کو مع رفقاء جیل میں ڈال دیا گیا۔ بالآخر روسی فوج سرخ جھنڈا لے کر جیل میں آگئی۔ عینی نے بڑھ کر سرخ پرچم کو چوم لیا۔ تمام قیدی فرط مسرت کے نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے لگے اور ''انقلاب زندہ باد،، کی صداؤں سے جیل گونج اٹھی۔ امیر بخارا کا دور ختم ہوا اور روسی حکومت کا آغاز ہوا اور انہیں غربا کے لئے جدوجہد کا پورا پورا صلہ ملا۔ وہ عظیم انسان قرار پائے۔ انہوں نے اپنی زبان و قلم سے ایک ایسی بیداری پیدا کی کہ جو ترقیٔ وطن پر منتج ہوئی۔

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے ڈرامے دیکھے ہیں۔ اپنے بچپن میں لیلیٰ مجنوں اور قتل تمیزن سے لے کر دنیا بھر میں بڑے بڑے ڈرامے دیکھے ہیں۔ اٹلی میں، نیو یارک میں، اور چین میں۔ غرض یہ کہ کہاں نہیں دیکھے۔ مگر تاجیکستان کا یہ اوپیرا ہر اعتبار سے خوب تھا۔ کردار، سیٹنگ، لباس، مکالمے۔ غرض ہر چیز کو میں نے اس کے عروج پر پایا۔ حیرت ہوئی اور بے پناہ مسرت بھی حاصل کی۔

تھیٹر اور اوپیرا کے شوقین

اس وقت سوویت یونین کے دارالحکومت ماسکو میں چونتیس اور پورے ملک میں پانچ سو ساٹھ سے زیادہ تھیٹر اور اوپیرا ہیں۔ ان میں سے سترہ تاجیکستان میں ہیں۔ بعض تھیٹر صرف بالغوں کے لئے مخصوص ہیں اور بعض صرف بچوں کے لئے۔ عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ کوئی انتظام نہیں ہے۔ سب

ایک ساتھ دیکھتے ھیں - تھیٹر میں اور اوپیرا میں کام کرنے والے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کو باقاعدہ اداکاری کی تربیت دی جاتی ھے - اس مقصد کے لئے متعدد اسٹوڈیو اسکول قائم ھیں - ماسکو کے اسٹوڈیو اسکول کے مشترک ڈائرکٹر پروفیسر وکٹر مونی یوکوف ھیں - گویا ایسے اسکولوں کو بھی درسی اسکولوں کا مرتبہ دیا جاتا ھے اور ان کے معلم بھی پروفیسر کہلاتے ھیں - ایک خاتون لیود میلا بیلو سودا جو خود بھی اداکاری کے فن سے بخوبی واقف ھیں ، اور اکثر ڈراموں میں حصہ لیتی رھتی ھیں ، ایک اسکول کی ڈائرکٹر ھیں - تربیت پانے والے طلبہ کو اس وقت اسکول سے ڈپلوما ملتا ھے جب ان کا کوئی ڈرامہ اسٹیج پر مقبول ھوجائے اور ان کی اداکاری کو عام طور پر سراھا جائے - ان تھیٹروں میں کلاسیکی مصنفین کے ڈرامے بھی پیش کئے جاتے ھیں - ان میں روسی اور غیر روسی ھونے کی تخصیص نہیں ھے - مثلاً انتون چیخوف کا ''چچا دانیا،، بائرن کا '' دان جوان،، پائری بیور مارچائس کا '' سیوائل کا حجام ،، اور بچوں کے لئے ھنس اینڈرسن کی لکھی ھوئی پریوں کی کہانیاں ڈرامے کے انداز میں پیش کی جاتی رھی ھیں - عموماً ایسے ڈرامے کا انتخاب کیا جاتا ھے کہ جو حقیقت پسندی ، سچائی اور انسانی ھمدردی کے جذبات کی عکاسی کرتے ھیں - منتظمین کا خیال ھے کہ حقیقی تھیٹر اور اداکاری کی تشکیل سخت محنت ، فن کی لگن اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے ممکن ھوتی ھے - گزشتہ نصف صدی میں بہت سے ڈرامہ نویس اور اداکار بام شہرت پر پہنچ کر عوام سے خراج تحسین حاصل کرتے رھے ھیں -

ٹالسٹائی کا مشہور ناول ''جنگ اور امن،، اسٹیج پر اور فلم کے پردے پر یکساں مشہور ہوا ہے۔ اسے بیلے کی صورت میں بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔ روسی شاعر الیکساندر بلاک نے اس ناول کے بارے میں کہا تھا : ''جب میں اسے پڑھتا یا اس کا تصور کرتا ہوں تو محسوسات پھیل کر میری پوری زندگی اور ہر اس شے کا احاطہ کرلیتے ہیں جو مجھے قریب سے عزیز ہے،،۔ ناول کو فلم کے پردے پر پیش کرنے والے ڈائرکٹر سرگئی بونڈارچک نے ان الفاظ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا تھا : ''فلم سازوں، تھیٹر والوں، فن کاروں اور موسیقاروں کے لئے لیو ٹالسٹائی میں بڑی کشش ہے،،۔

ابوالقاسم لاھوتی

تاجیکستان کے اسی عہد کے ایک مشہور شاعر اور ڈرامہ نویس ابوالقاسم لاھوتی تھے جو عینی کے ہم عصر ھی نہیں، ان کے قریبی ہم جلیس بھی تھے۔ ان کے نام کے ساتھ عموماً استاد کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردی تھیں۔ ۱۹۲۰ء میں جب انقلاب کی صبح تاجیکستان میں نمودار ھوئی تو ملک مفلسی اور معاشی بربادی کا شکار تھا۔ خوفناک وبائیں ان پڑھ انسانوں کو اپنا لقمہ بنا رہی تھیں۔ پھر بھی کچھ لوگ امیر بخارا کو دوبارہ تخت پر بٹھانا چاھتے تھے جو ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اسلئے کہ تمام تر رکاوٹوں کے باوجود انقلاب نے ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کرلی تھیں۔ سرکاری اداروں میں غریبوں کے نمائندے شامل ھوگئے تھے۔ نئے انقلاب کی جدوجہد

هر سمت شروع ہوگئی تھی۔

اس موقع پر ابوالقاسم لاہوتی نے نصابی کتابیں تیار کیں اور تاجیکستان میں اولین اشاعت گھر کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے نئے طرز زندگی اختیار کرنے کے لئے ترقی پسند نظمیں لکھیں اور اپنے خیالات کو ڈراموں کی صورت میں سمودیا۔ ان کے نغمے اور مکالمے ہر شخص کی زبان پر آگئے۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں عوام کے دشمنوں پر کاری ضربیں لگائی تھیں اور نئی زندگی کی تعمیر کی دعوت دی تھی۔ اسلئے وہ بہت جلد مقبول ہوگئے۔ صدرالدین عینی ان کے ہر حال میں شریک کار رہے۔ ان دونوں نے مل کر عوامی ثقافت کا پرچم بلند کیا۔

لاہوتی دراصل ایرانی النسل تھے۔ اپنے وطن میں بھی انہوں نے انقلابی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کردیا تھا۔ گرفتاری، سزائے موت اور فرار ان کا مقدر بن گئے۔ وہ ترک وطن کرکے ترکی چلے گئے اور کچھ عرصے جلا وطنی کی زندگی گزارتے رہے۔ پھر تاجیکستان آگئے۔ یہ ان کا دوسرا اور آخری وطن بن گیا۔ ظاہر ہے کہ ان مصائب اور نشیب و فراز سے گزرنے والا شخص اپنے ڈراموں میں قلم اور تلوار کو ایک ساتھ چلا کر ہی آگے بڑھ سکتا تھا۔ انہوں نے صرف کلاسیکی روایات ہی کو جاری نہیں رکھا بلکہ نئے ذرائع اظہار تخلیق کئے۔ اشتراکی انقلاب کی آتش فروزاں میں ان کی شاعری اور ڈرامہ نگاری کندن کی طرح چمکنے لگی اور اس میں شدت و توانائی پیدا ہوگئی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تیس سے زیادہ سال ادب اور فنی تعمیر کے لئے وقف کردیئے اور مقصد کی تکمیل کی۔ اسلئے وہ اب بھی

زندہ ھیں اور ھمیشہ زندہ رھیں گے۔

ڈرامہ ختم ھونے کے بعد رات ساڑھے گیارہ بجے واپس مہمان خانے آیا تو صدر دروازے پر فیض احمد فیض صاحب کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ سردار جعفری بھی تھے۔ جعفری صاحب کی بیگم صاحبہ اور محترمہ عصمت چغتائی ڈرامے میں میرے ساتھ تھیں۔ میں ذرا پہلے آگیا تھا۔

مجھے سخت بھوک لگ رھی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب تھک کر چور ھوگئے ھیں اور مضمحل سے نظر آرھے ھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ میں آج کھانا نہیں کھاؤنگا۔ وہ اصرار کرتے رھے اور میں انکار۔ آخر وہ اجازت لے کر اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ جناب فیض نے فرمایا ”آج آپ ھمارے ساتھ کھانا کھائیں گے“۔ میں راضی ھوگیا اور پھر ھم سب مہمان خانے کے کمرۂ طعام میں جا بیٹھے۔ وھاں خواتین بے چاری صبح کے ناشتے کے لئے میزوں کو قرینے سے درست کررھی تھیں۔ بارے انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ھم سب کو کھانا کھلایا۔ میں اب تک گوشت سے پرھیز کرتا رھا تھا۔ آج شامی انداز کے کباب نوش جاں کر ھی لئے۔ پتہ چلا کہ یہاں ذبیحہ مل جاتا ھے۔ اللہ ھی جانے۔ جہاں ھر کام میکا نائزڈ ھو وھاں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ ھوٹل میں کام کرنے والوں کے انداز گفتگو سے یہ پتہ چل رھا تھا کہ وہ مسلمان ھیں، اسلئے ھوسکتا تھا کہ گوشت صحیح قسم کا ھو۔ ورنہ اللہ معاف کرنے والا ھے۔

کراچی سے رابطہ

میں نے اپنے پروگرام کے بارے میں حسب ذیل تار آج کراچی روانہ کردیا :

HAMDARD KARACHI PAKISTAN ARRIVED DUSHANBE THREE DAYS MOSCOW WHERE WITNESSED OPEN HEART SURGERY DISCUSSED NATIONAL COMMISSION UNESCO NOW PARTICIPATING AINIS JUBILEE UNDER UNESCO RESOLUTION PROCEEDING SAMARKAND BOKHARA FINALLY MOSCOW DISCUSSIONS NICOLAI BLOKHIN WORLD CANCER AUTHORITY SAID

رات ساڑھے بارہ بجے سونے کے لئے لیٹ سکا۔ لیکن نیند کسی کروٹ نہ آئی۔ اس لئے عادت کے مطابق کچھ مطالعہ شروع کردیا اور تھوڑی دیر بعد سو گیا۔

صبح اٹھا اور نماز فجر ادا کر کے پھر لیٹ گیا۔ یہ عیاشی کے مترادف ہے۔ عرصۂ دراز کے بعد یہ موقع ملا تھا کہ نماز فجر کے بعد پھر سو گیا۔ آخر کار سات بجے اٹھا۔ تیاری کی اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ یہ میز بھی یاد آیا کریگی جہاں بیٹھ کر میں نے اس " روس نامہ " کی ابتدا کی ہے۔ اب تک تقریباً ستر صفحات پر مشتمل اپنے نوٹ تیار کرچکا ہوں۔ یہ سلسلہ برابر چلتا رہیگا۔ صفحات بڑھتے رہیں گے۔ اس طرح شاید یہ دو سو صفحات کی ایک دلچسپ کتاب تیار ہوجائیگی۔ آج صبح خیال آیا کہ اس کتاب کو تاجیکستان اکیڈمی آف سائنسز کے صدر عالی قدر جناب اکیڈیمیشین پروفیسر محمد عاصموف کے نام نامی پر منسوب کرونگا۔ ان سے اجازت بھی لگے ھاتھوں لے لونگا۔ بس ذرا غور

کرنا ہوگا کہ بالآخر کتاب کا انداز کیا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میری اس کتاب میں کوئی ایسی بات بھی قلم سے نکل جائے کہ جو عاصموف صاحب کے لئے موزوں و مناسب نہ ہو، اور وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہوجائیں۔ اس کا صحیح فیصلہ کتاب ختم کرنے کے بعد ہی ہوسکیگا۔

سائنٹی فک سیشن

کانفرنس ہال ٹھیک دس بجے پہنچ گیا۔ سائنٹی فک سیشن کا آغاز پروفیسر عاصموف صاحب نے وقت مقررہ پر کردیا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ بعض طلبہ و طالبات جگہ نہ ہونے کی وجہ سے کھڑے تھے۔ اس ہال میں کل تین سو نشستیں ہیں۔ ان میں سے بعض خالی بھی تھیں مگر ایسا نہیں تھا کہ طلبہ ان پر بیٹھ جائیں۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کے بزرگ آئینگے تو ان کے لئے کرسیاں خالی رہنی چاھئیں۔ تاہم ایک گھنٹہ بعد پروفیسر عاصموف نے دختران سعادت مند کو کرسیوں پر بیٹھ جانے کو کہا۔ وہ خالی کرسیوں پر آکر بیٹھ گئیں۔ پھر بھی سب سے آگے آکر کوئی نہیں بیٹھا۔ وہ پیچھے زمین پر جا کر بیٹھ گئے۔ یہ احترام قابل قدر ہے۔ ہم اپنے ہاں طلبہ و طالبات میں ایسے خیال و احترام سے تقریباً محروم ہیں۔

پروفیسر عاصموف صاحب نے آج مجھے اسٹیج پر بلا لیا اور اس طرح پاکستان کی عزت افزائی فرمائی۔ ان کے لئے واقعی بڑا مسئلہ تھا۔ وہ ہندستان کو نظر انداز نہیں کرسکتے تھے۔ پاکستان کو جناب فیض صاحب کی وجہ سے اہمیت دینے پر وہ خوش تھے کہ فیض صاحب لینن پرائز یافتہ ہیں۔ مجھ سے ان کے

شخصی روابط ہیں - انھوں نے اچھے انداز سے توازن پیدا کیا ہے - مثلاً ہندی مندوبین کو انھوں نے مترجم وہی دئے تھے جو اس فرض کی ادائی کے لئے مامور تھے - مجھے انھوں نے اکیڈمی کے استاد پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب دئے جن کا علمی مرتبہ بہرحال بلند ہے - یہ صریحی امتیاز تھا جو احتراماً انھوں نے برتا تھا - بعض مواقع پر ان کو ہندستان کو اولیت دینی ہوتی ہے اور وہ صحیح ہے - میں ذاتی طور پر تو اس قسم کی چیزوں کی کوئی پروا کرتا ہی نہیں ہوں مگر جب مسئلہ پاکستان کا آتا ہے تو میں ضرور محتاط و متاثر ہوتا ہوں - بارے پروفیسر عاصموف صاحب اور ان کے رفقاء ایک صحیح توازن قائم کئے ہوئے تھے اور میں اس سے مطمئن تھا -

جلسہ گاہ سے ہمیں آج ساڑھے بارہ بجے اٹھا دیا گیا - حال آں کہ ابھی اجلاس جاری تھا اور بڑے اہم مقالات پیش ہورہے تھے - آج سائمل ٹےنی اس ٹرانس مشن کا انتظام بہتر ہوگیا تھا - یعنی روسی اور ازبکی زبان کے مقالات کا انگریزی ترجمہ ساتھ ساتھ ہورہا تھا - تاہم مجھے پروفیسر عاصموف صاحب نے سائکلو اسٹائل کئے ہوئے فارسی اور انگریزی ترجمے دیدئے جو میں نے اپنے ریکارڈ میں داخل کرلئے - جب میں جلسہ گاہ سے باہر آیا تو میرے ساتھ محترمہ عصمت چغتائی اور محترمہ سلطانہ جعفری بھی باہر آگئیں - پتہ چلا کہ یہ ہم کو آج خریداریٔ اشیا کے لئے تاجیکستان کے بازاروں میں لے جائینگی - دراصل خریداری میرا شوق نہیں ہے - مگر پروگرام ایسا تھا کہ انکار ممکن نہ تھا -

ایک جنرل اسٹور میں

ہم سب ایک بڑے اسٹور میں لے جائے گئے۔ وہاں زیادہ تر کپڑے کی دکانیں تھیں۔ اب یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ میں خریداری نہ کروں۔ کبھی کبھی ایسے مواقع آتے ہیں کہ جہاں ملک کی لاج رکھنے کے لئے خرچ کرنا ہی ہوتا ہے۔ اب غور کرنے کی بات ہے کہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان جو تیس ڈالر عطا فرماتا ہے، ان سے کیا خریدا جائے اور اگر خریداری کرنے میں بڑی رقم خرچ کردی جائے تو کسی غیر متوقع حادثے کے لئے رقم کہاں سے آئے گی۔ اب اس مہمان خانہ' سرکاری میں کام کرنے والوں کو اگر کوئی انعام (ٹپ) دینا پڑے تو مندوبین کیا کریں۔ میں نے پاکستان ایک اہم تار دیا تھا، اس پر بارہ روبل خرچ ہوگئے۔ ایک روبل تقریباً تیرہ روپے کے برابر ہوتا ہے۔ دوسری کرنسی میں تقریباً پندرہ ڈالر خرچ ہوگئے۔ اب باقی خرچے کہاں سے پورے کئے جائیں۔ بہر نوع انسان ہوں۔ میری بھی کوئی خواہش ہوسکتی ہے۔ اپنے ذوق کی کوئی چیز کھانے کو جی چاہا تو کلیجہ مسوس کر رہ جانا پڑتا ہے۔ کوئی کتاب کسی بک ڈپو میں نظر آگئی تو اسے کس طرح خریدا جائیگا۔

یہ تیس ڈالر آخر کیا ہوتے ہیں۔ اس بار جمیل الدین عالی ہم سفر نہ تھے۔ اگر وہ ہوتے تو آواز وہ لگاتے اور جو سامان میں ہدیتہ" دینے کو لایا تھا اس کو فروخت کر کے گزر بسر کرتا۔ خیر اب میں آپ کو کیوں بتاؤں کہ میں نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لئے ضرورت کے مطابق روبل کہاں سے لئے۔ چھوڑئیے اس قصے کو۔



قیام گاہ عینی ، سمرقند - حکیم محمد سعید دوسرے مندوبین کے ساتھ -



قیام گاہ عینی پر حکیم محمد سعید اپنے تاثرات قلم بند کر رہے ہیں -

احترامات بیگم صدرالدین عینی

میرے نزدیک پروگرام کا ایک بڑا اچھا حصہ یہ بھی تھا کہ تمام غیر ملکی مندوبین مرحوم صدر الدین عینی کی بیوہ سے ملاقات کے لئے لے جائے گئے جنکو پہلے سے مطلع کردیا گیا تھا۔ صدر الدین عینی کی دو بڑی بیٹیاں ہیں۔ یہ بھی اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ موجود تھیں۔ ان کے علاوہ عینی مرحوم کے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں جمع تھیں۔ یہ سب منتظر تھے۔ صرف عینی کے بیٹے کمال صدر الدین عینی غیر حاضر تھے کیونکہ وہ نمائش کی ترتیب اور انتظامات میں مصروف تھے۔ راستے میں ان سے ملاقات ہوگئی۔

جب ہم باغ عینی پر پہنچے تھے تو محترمہ کو پہلی بار دیکھا۔ احتراماً میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ ایک تصویر میری اور ان کی ان کے سب بچوں کے ساتھ کھنچ جائے۔ انھیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ تصویر کھنچ گئی۔ اس کے بعد جو ضیافت ہوئی، اس میں بھی میں ان سے قریب تر رہا۔ ان کی کرسی بالکل میرے سامنے تھی۔ اس وقت میں نے ان کو کھانا کھاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ اچھی طرح کام نہیں کرسکتے تھے، ان میں رعشہ تھا۔ جب وہ کچھ پیتیں، تب ہاتھ زیادہ کانپتے اور ان کے ساتھ دونوں ہونٹ بھی کانپنے لگتے۔ یہ سب کچھ ان کی عمر کا تقاضا تھا۔ میں نے ذرا سی دیر کے لئے دل میں سوچا کہ اس محترم خاتون کو ہیڈ ٹیبل پر ہونا چاہئے تھا۔ یہ فروگزاشت اچھی نہیں تھی۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوا جبکہ میں دیکھ چکا تھا کہ کانفرنس ہال میں اور کنسرٹ ہال

میں ان کو بڑی خصوصیت کے ساتھ باکس میں اعلا مقام دیا جاتا رہا تھا ۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں ان کے زیادہ قریب جا بیٹھا ۔ محترم عاصموف صاحب نے میرا تعارف ان سے کرایا ۔ پھر اس موقع پر بھی ایک اچھی تصویر فوٹوگرافر نے اتار لی ۔ اگر اس کی ایک کاپی مل گئی تو میں پاکستان لے جا کر اپنے آرٹسٹ سے اسے رنگین کراؤنگا اور ایک پرنٹ یادگار کے طور پر ان کو بھی بھیجونگا ۔

نمائش (میوزیم)

صدر الدین عینی کے عام استعمال کا سامان جس میں قلم ، پنسل ، قلمدان ، گھڑی نیز مکتوبات ، مطبوعات اور تصاویر بھی شامل ھیں ، ایک میوزیم عینی کی شکل میں جمع کردیا گیا ھے ۔ اس نمائش کے نگراں ان کے صاحبزادے کمال الدین عینی ھیں ۔ ھم جب اس جگہ پہنچے تو ھر چیز کی وضاحت کے لئے خود کمال وھاں موجود تھے ۔ پروفیسر عاصموف نے رائے دی کہ ایک یادگار تصویر یہاں بھی کھنچنی چاھئے ، جسے بعد میں میوزیم میں لگا دیا جائے ۔ چنانچہ اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ۔ میں نے میوزیم کے حسن ترتیب کی داد دی ۔ اس وقت کی ھر بات چیت کو محفوظ رکھنے کے لئے مائکروفون اور ٹیپ ریکارڈر کا اھتمام کیا گیا تھا ، چنانچہ میرے الفاظ کی صدا بندی ھوگئی ۔ میں نے زبان فارسی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ۔ جب وزیٹر بک میں رائے لکھنے کا سوال آیا تو میں نے اپنی رائے ایسی اردو میں قلمبند کی جسے فارسی داں بھی آسانی سے پڑھ کر سمجھ سکتے تھے ۔



نمائش گاہ عینی جہاں ان کے خطوط، تصانیف اور تاریخی نوادر جمع کر دئیے گئے ہیں۔



نمائش گاہ عینی ۔ مطبوعات صدر الدین عینی پر پروفیسر عبداللہ جان غفاروف اور حکیم محمد سعید تبادلِ خیال فرما رہے ہیں۔

میں نے یہ رائے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،، سے شروع کی تھی۔ یہ ہر لحاظ سے مناسب بلکہ ضروری تھا۔

جلسۂ افتتاحیہ اقبال ہندی

میوزیم عینی سے فارغ ہوکر ہم سب کانفرنس ہال میں چلے گئے۔ عاصموف صاحب نے صبح کی طرح مجھے اسٹیج پر جگہ دی۔ وہ میرے احترام میں کوئی کمی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ جلسۂ اختتامیہ میں جو مقالات پڑھے گئے، ان میں سے ایک میں علامہ اقبال کو اقبال ہندی کہا گیا۔ میں نے عاصموف صاحب سے کہا کہ اقبال تو شاعر پاکستان ہے۔ انہوں نے برجستہ اقبال کا ایک شعر پڑھ دیا۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز۔ تا خدابخشد ترا سوز و گداز

انہوں نے یہ شعر اس لئے پڑھا کہ سب جانتے ہیں کہ اقبال کو مولانا رومی سے خاص لگاؤ تھا اور وہ انہیں اپنا مرشد کامل سمجھتے تھے۔ میں نے موضوع کی مناسبت سے اقبال کا ایک اردو شعر پڑھ دیا جو رومی کی شان میں ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی، عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

میں نے کہا، زیادہ مناسب یہ ہوتا کہ انہیں شاعر ہند و پاک کہا جاتا۔ انہوں نے فوراً کھڑے ہوکر میرے اس نکتے کی روشنی میں حقیقت کی وضاحت کردی۔ مقالہ نگار نے فوراً اس بات کو قبول کرلیا اور علی الاعلان وعدہ کیا کہ میں اپنے مقالے میں یہ تبدیلی کرلونگا۔

جلسہ ختم ہونے سے پہلے عاصموف صاحب نے فی البدیہہ

تقریر کی جس میں تمام مندوبین کا ، خصوصا غیر ملکی مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔ جن شرکاء کے مقالات شریک نہ ہوسکے تھے یا اس موقع پر پڑھے نہ جاسکے تھے، ان کے لئے معذرت چاھی۔ البتہ یہ یقین دلایا کہ وہ سب بہت جلد طبع کردئے جائیں گے۔ میں نے آخر میں پروفیسر عاصموف صاحب کی خدمت میں اپنی جانب سے اور سب کی جانب سے ھدیۂ تبریک و تشکر پیش کیا۔

مقالات کا سلسلہ تو ختم ہوگیا لیکن ایک آئٹم باقی تھا۔ زندگیٔ عینی پر ایک فلم اس موقع پر تمام مندوبین کو دکھایا گیا۔ یہ فلم تاریخی نوعیت کا تھا۔ اس میں وہ تمام اشخاص نظر آئے جو عینی کے رفیق اور شریک کار رہے تھے۔ بہت سے ایسے جوان لوگ نظر آئے جو اب معمر ہوچکے تھے۔ کچھ ایسے بوڑھے بھی دکھائی دئے جو اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ میں نے خاص طور سے بابا جان غفوروف صاحب کو پہچان لیا جو بارھا عینی کے ساتھ نظر آئے۔ ان کی جوانی بڑی پر بہار تھی جس کی جھلک ان کے بڑھاپے میں بھی نمایاں تھی۔

مقالات کا معیار

اس کانفرنس میں تاجیکی ، روسی ، آذربائیجانی اور ازبکستانی علماء نے جو مقالات پیش کئے ، ان کا معیار قطعی طور پر بڑا بلند تھا۔ اور بعض مقالات سن کر تو حیرت ہوتی تھی کہ یہ لوگ کس درجہ محنت کرتے ھیں۔ ان کے برعکس بعض غیر ملکی مندوبین نے یا تو مقالے پیش کئے ھی نہیں یا سطحی قسم کے تھے۔ خود میرا مقالہ بھی مقابلۃً زیادہ معیاری نہیں تھا۔ تاھم بعض مقالات نے یہ تاثر دیا کہ عینی کا علمی مقام درحقیقت بہت



نمائش گاہ عینی ، دو شنبہ ، تاجیکستان ۔ حکیم محمد سعید
اپنے تاثرات ریکارڈ کر رہے ہیں ۔



مندوبین کنگوس عالمی صدر الدین عینی کا ایک گروپ ۔
دائیں طرف حکیم محمد سعید ہیں ۔

بلند تھا ۔ اکثر مقالہ نگاروں نے ان کا موازنہ سنٹرل ایشیا کے ارباب علم و ادب سے کیا ۔ مثلاً فردوسی، عمر خیام ، سعدی ، حافظ ، بیدل ، رودکی ، ترسون زادہ اور اقبال وغیرہ سے کیا ۔ مگر بعض نے یورپی شعراء اور ادباء کو بھی سامنے رکھا ۔ مثلاً ھومر سے ڈی بلزاک تک ، سب سے موازنہ کیا گیا ۔ میں نے تمام مقالات کو بڑے غور سے سنا اور اب یہ بھی مناسب ھوگیا کہ اردو داں شعراء اور ادباء کے لئے عینی پر ایک ایسی کتاب پیش کی جائے ۔ میں کوشش کرونگا کہ اس کام کو خصوصیت کے ساتھ کر ڈالوں ۔ اس کام میں چند دوستوں کے تعاون کی ضرورت پیش آئیگی ۔ شاید یہ میسر آجائیگی ۔

خاندان عینی کے ساتھ ایک شب

دوسرے دن کمال الدین عینی اور ان کی اھلیہ نے خاندان عینی کی جانب سے ایک الوداعی عشائیہ مرتب کیا ۔ اس میں تمام ملکی اور غیر ملکی مندوبین مدعو کئیے گئے ۔ شرکاء کی تعداد تین سو سے اوپر ھی تھی اور کھانا عین مین وھی تھا کہ جو کانفرنس کی افتتاحی تقریب کے دن تھا ۔ بہت قیمتی کھانا اور بہت پر خلوص ۔ کمال اور اھلیہ نے اور ان کے دونوں بچوں نے خود کھانا نہیں کھایا ۔ وہ ھر ھر میز پر ھر ھر شخص کے پاس جارھے تھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ھے ۔ شراب و کباب کی انواع تھیں اور اقسام ۔ دل کھول کر ملی تھی ، دل کھول کر ھی پی جارھی تھی ۔ اس کے بعد رقص و سرود کا بھی انتظام تھا ۔ موسیقی مغربی اور مشرقی دونوں ۔ جاز بھی اور دو تارا بھی ۔ ایک خاتون نے ” سوھنی دھرتی ، اللہ رکھے قدم قدم

آباد ،، سے محفل کا آغاز کیا ۔ میرے قریب جو لوگ تھے ، میں نے ان کو بتایا کہ یہ پاکستانی گانا ہے ، مسعود انور کا لکھا ہوا ہے اور رونا لیلیٰ نے اس کو دوام بخشا ہے ۔ رونا لیلیٰ اب بنگلہ دیشی ہوگئی ہے ۔ وہاں اس کی بہن مبتلائے سرطان ہوکر اللہ کو پیاری ہوگئی ہے ۔ رونا لیلیٰ نے اپنے کمال فن سے بنگلہ دیش میں ایک مرکز سرطان قائم کرنے کا تہیہ کرلیا ہے ۔

جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں بھی گانے ہوئے اور تاجیکی ، ازبکی زبانوں میں بھی ، پھر رقص کا بھی پورا انتظام تھا ۔ جام صحت بار بار پیش ہورہے تھے ۔ اس وقت استاد عاصموف صاحب خوش طبعی کے موڈ میں تھے ۔ کمال عینی نے ان کو میزبان صدر محفل بنایا تھا اور اس کا اعلان کیا تھا ۔ میں نے اپنے جام شراب میں شراب کے بجائے شاہ عنبر بھرلیا تھا ۔ فیض صاحب نے اس جام آب سے اپنا جام شراب ٹکرانے سے انکار کردیا ۔ مجھے اس موقع پر یہ معلوم ہوا کہ یہ ثقافت کے خلاف ہے کہ پانی کو شراب سے ہم آہنگ کیا جائے ۔ بارے مس مارگریٹا پاؤ لونا نے میرا جام سفال " آب انگور ،، سے بھر دیا ۔ اس میں دخت زر کی جھلک میں نے دیکھی ۔ دوسری طرف محترمہ عصمت چغتائی نے شیمپین سے میرا دوسرا جام لبالب بھر دیا ۔ میں نے تیسرا جام شاہ عنبر سے بھر لیا ۔ جام صحت پیش ہوتے تو میں کبھی شیمپین سے اور کبھی دوسری شراب سے جواب دیتا اور آب شاہ عنبر اتنا پی گیا کہ کھانا کھانے کی گنجائش نہ رہی ۔

آٹھ بجے سے گیارہ بجے شب تک یہ محفل گرم رہی ۔ محترمہ عصمت چغتائی اب خاصی بے حال تھیں ۔ ان کو آرام کی





(بائیں طرف) حکیم محمد سعید خانم صدرالدین عینی کے ساتھ ۔ (دائیں طرف) افراد خاندان عینی کے ساتھ بعض مندوبین ۔

ضرورت تھی - انھوں نے کہا :

''ذرا خالد لطیف سے کہہ دیجئے گا ، میں نے خط ان کے گھر کے پتے پر لکھا تھا ، مگر وہ واپس آ گیا ہے،، -

میں نے خالد کو یہ پیغام دینے کا وعدہ کرلیا اور وہ لڑکھڑاتی اٹھیں اور چلی گئیں -

فیض صاحب نے فرمایا ، لوگ مجھے باغی کہتے ہیں - آپ پہلے پاکستان جارہے ہیں - ذرا بتا دیجئے گا کہ یہاں سونی دھرتی ہوئی اور کلام فیض گایا گیا - میں نے کہا کہ میں نے اپنی یاد داشت میں یہ لکھ لیا ہے - فیض صاحب نے پوچھا ، آپ کب جارہے ہیں ؟ میں نے جواب دیا ، آپ ہی نے تو کہا تھا -

ایک فرصت گناہ ملی ، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

رات بارہ بجے ہوٹل پہنچا اور پڑتے ہی سوگیا - آج مطالعہ نہ کرسکا - البتہ صبح اٹھتے ہی اپنی ڈائری لکھنی شروع کردی تاکہ ضروری باتیں حافظے کی لوح سے مٹ نہ جائیں - بعد میں لکھنے کی صورت پیدا کی جائے تو خواہ مخواہ اپنے ذہن پر زیادہ زور ڈالنا پڑتا ہے - ''کار امروز بفردا مگزار،، کا نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے -

انتظامات میں خلل

بخارا جانے کا انتظام مکمل نہیں ہوسکا - سمرقند تو پہلے سے اصل پروگرام میں شامل تھا - مگر جب یہ طے ہوا کہ ماسکو میں جلسۂ عینی نہیں ہوگا تو یہ طے ہوا کہ کم سے کم

غیر ملکی وفود کو بخارا کی سیر کرادینی چاہئے ۔ اگر بخارا میں حسب منشا انتظام ہو جاتا تو اس وقت ہماری روانگی سمر قند کے لئے ہوتی ۔ چونکہ انتظامات میں خلل پڑگیا ، اسلئے بخارا کا پروگرام ختم سمجھنا چاہئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ ختم ہوگیا ۔

گزشتہ رات پروفیسر عاصموف صاحب نے فرمایا تھا : " سمرقند غالباً ایک دن بعد روانگی عمل میں آئیگی اور یہ کہ کل ہم چند آدمی استراحت کے لئے دو شنبہ سے باہر چلیں گے "۔ چنانچہ صبح دس بجے ہم سب تیار ہوگئے ۔ عاصموف صاحب بھی آگئے ۔ پانچ موٹریں روانہ ہوئیں ۔ میرے ساتھ افغانستان کے ڈاکٹر مصطفیٰ رسولی تھے ۔ ان سے خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی ۔ وہ فارسی ، اردو ، انگریزی ، روسی اور دوسری کئی زبانیں جانتے ہیں ۔ رسولی صاحب کے والد پشاور میں کاروبار کرتے ہیں ۔ قصہ خوانی بازار میں افغان ہاؤس انہی کا بنایا ہوا ہے ۔ اس سفر میں فیض احمد فیض ، علی سردار جعفری اور ان کی بیگم ، محترمہ عصمت چغتائی شریک تھیں ۔ کہنا چاہئے کہ ہندستان ، پاکستان اور افغانستان کے وفود تھے ۔ باقی نہیں تھے ۔

دو شنبہ کے حسن و جمال کا اندازہ نوریک جا کر ہی ہوا تھا جسے پہلے ہی قلم بند کرچکا ہوں ۔ اب دوسرے رخ پر ہم دوشنبہ سے باہر نکلے ۔ موسم خوشگوار تھا ۔ ابر چھایا رہا ۔ موٹریں بڑی مناسب رفتار سے رواں تھیں ۔ ایک طرف سرسبز و بلند پہاڑیاں تھیں ، خود رو پھولوں کی کثرت سے ہر طرف رنگینیاں پھیلی پڑی تھیں ۔ گل و ریحان کی خوشبوؤں سے فضا معطر تھی ۔ دوسری

جانب دریائے دوشنبہ بڑی روانی سے اور شور کے ساتھ بہہ رہا تھا ۔ صاف و شفاف پانی تصویر لے رہا تھا ۔ برف پوش پہاڑوں سے برف پگھل پگھل کر دریائے دو شنبہ کو روانی مزید عطا کررہا تھا ۔ صاف سنسان سڑکوں پر ٹریفک خال خال تھا ۔

غوطہ لگانے کی خواہش

ایک مقام ایسا آیا کہ عاصموف صاحب نے اپنی موٹر روک لی ۔ فوراً سب موٹریں رک گئیں ۔ وہاں دریائے دوشنبہ کا پھیلاؤ زیادہ تھا ۔ پہاڑوں پر گری ہوئی برف کے باعث سرد ہوائیں چل رہی تھیں ۔ بڑا دل چاہا کہ اس پانی میں ایک غوطہ تو لگا ہی لوں ۔ نہ جانے کیوں یہ خواہش بڑی شدید تھی ۔ میں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا ۔ اپنے مترجم پروفیسر عبداللہ جان صاحب سے تو میں نے کہہ ہی دیا کہ میرا اس پانی میں غسل کرنے کو بڑا دل چاہ رہا ہے ۔ انہوں نے منع کر دیا کہ پانی سخت سرد ہے ۔ تکلیف ہوجائیگی ۔ ان کو کیا معلوم کہ اس قسم کی پیش رفت کا عادی ہوں ۔ کڑاکے کی سردی میں بھی ٹھنڈے پانی ہی سے نہاتا ہوں اور یہ عادت فطرت کا جزو بن گئی ہے ۔ مجھے نزلہ تک نہیں ہوتا ۔ ایک بار مہاوٹوں کے زمانے میں کوہ مری کے ہوٹل میں سرد پانی سے نہایا تو ہلکی سی جھر جھری آئی تھی ۔ ایک لمحے بعد کوئی اثر نہیں تھا ۔

استراحت گاہ نویسندگان

کچھ دیر بعد ہماری موٹریں ایک ایسے مقام کی طرف روانہ ہوئیں جہاں اترنا تھا ۔ عبداللہ جان صاحب نے ایک سلسلہ عمارات کے بارے میں بتایا کہ یہ استراحت گاہ نویسندگان ہے ۔ یہ

مقام واقعی بہت پر فضا تھا ۔ شہر سے دور ، بہت دور ، سرسبز پہاڑوں کے دامن میں ، دریائے دوشنبہ کے کنارے ، گل و بلبل کے ماحول میں ذہن کو یکسوئی حاصل ہوسکتی ہے کیونکہ حافظ شیراز کے قول کے مطابق یہاں ''فرصتے و کتابے و گوشۂ چمنے'' صادق آتا ہے ۔ میں نے ٹھنڈا سانس لیا یہ سوچ کر کہ یہاں لکھنے والوں کی کیسی قدر دانی ہے اور ان کی تحریر کو جلا بخشنے کے لئے کیا کیا سامان قدرت نے اور خود انسان نے پیدا کئے ہیں ۔ مجھے نویسندگان تاجیکستان پر بجا طور پر رشک آیا اور اپنے ملک کے حالات پر غور کرتے ہوئے ذہن میں بڑی تیزی اور صفائی کے ساتھ یہ سوال ابھرا کہ آخر ہم کب ایسا ماحول پیدا کرسکینگے ؟ انفرادی طور پر تو بعض لوگوں کے لئے یہ امکان ہوسکتا ہے ، لیکن ادیبوں اور شاعروں کی برادری کے لئے بحیثیت مجموعی تو ملک کے ارباب حل و عقد کا اہتمام ہونا چاہئے ۔ لیکن وہ تو ہمیشہ سیاسی الجھنوں میں پھنسے رہتے ہیں ۔ معاشرے کی بلند سطح پر پہنچ کر عوامی مسائل پر غور کرنا ممکن نہیں ہے ۔

بلا شبہ اہل قلم اور صاحبان علم و فضل ایک معاشرے کے لئے سب سے قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں ۔ وہ ہر موقع و محل پر کام آسکتے ہیں ۔ ان کی تحریر دنیا میں انقلاب برپا کرتی ہے اور انہی کی تحریر انتشار کی کیفیات دور کرکے سکون اور نظم و ضبط پیدا کرتی ہے ۔ وہ ہر محاذ پر تلوار کے بغیر لڑتے ہیں ۔ قلم کی طاقت تلوار سے زیادہ شدید ہوتی ہے ۔ اسلئے میرے دل نے کہا کہ ان کے بڑھنے اور ان کے پنپنے کے پورے سامان ہونے چاہئیں ۔ خود اہل قلم اور صاحبان علم و فضل کو اپنے دل و

دماغ کی پاکیوں اور سچائیوں کے ساتھ ثروت ملک و ملت میں اضافے کا سامان کرنا چاھئے اور سرکار کو بھی دیانت و امانت کے ساتھ احترام علم و عالم کا اھتمام کرنا چاھئے اور فضا کو ان کے لئے بکمال حسن ساز گار بنانا چاھئے ۔ یہ تالی ضرور دونوں ھاتھوں سے بجے گی ۔ اس کے لئے ایک انقلاب فکر درکار ھے ، مگر اس سے قبل ایک نظریۂ حیات کا تعین بکمال یقین و دیانت ھونا چاھئے ۔ جب تک یہ فیصلہ کن مرحلہ نہیں آئیگا ، پاکستان میں علم و عمل اور علم و عالم کے لئے راھیں استوار نہیں ھونگی ۔ یہ ھماری بڑی بدقسمتی ھے کہ ھم آج تک نظریۂ حیات ملی کا تعین نہیں کرسکے ھیں ۔ اس معاملے میں ھم نے بڑی خطرناک کوتاھیاں کی ھیں اور ھم نے بڑی المناک فروگزاشتیں کی ھیں اور آج پوری ملت ان کوتاھیوں کا خمیازہ بھگت رھی ھے اور ان کوتاھیوں کی وجہ سے اپنی منزل سے دور — بہت دور ھے ۔

پاکستان میں اب سے اٹھارہ سال پہلے ادیبوں ، شاعروں ، دانشوروں اور ارباب علم کی قدر و منزلت اور انھیں ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے رائٹرز گلڈ کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن اس کی گھما گھمی قلیل مدت کے لئے رھی ، پھر اس کا وجود برائے نام رہ گیا ۔ خود ارباب قلم نے اپنی اس انجمن میں کرسیاں سنبھالنے اور ان پر برقرار رھنے کے لئے ھر قسم کے ھتھکنڈے استعمال کئے اور اس کے فنڈ سے ریوڑیاں ھر پھر کر اپنوں ھی کو بٹتی رھیں ۔ کوئی پوچھے کہ اس گلڈ نے کیا کارھائے نمایاں انجام دیئے تو ارباب اقتدار اپنی بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے ۔ ایک ماھنامہ نکالا ، وہ بھی نہ چل سکا ۔ ایک بک ڈپو قائم کیا وہ بھی سخت

خسارے کے بعد ختم ہوگیا ۔ اگر ادیب اس ادارے کو خود نہیں چلا سکے تو کیا توقع ہوسکتی ھے کہ وہ کسی اور میدان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکینگے ۔ اس کے برعکس روس میں ادیبوں کی انجمن کسی ملک کی اسمبلی کی طرح باقاعدہ کام کرتی ھے ۔ ملک کے سرکاری اور غیرسرکاری ادارے طباعت و نشریات تک کے لئے اس سے صلاح و مشورہ کرتے ھیں اور جب تک کسی منصوبے پر اس کی تائید و تصدیق نہ ہوجائے، کام آگے نہیں بڑھتا ۔ اس نے اب تک جو ٹھوس کام کئے ھیں ، ان میں کلاسیکی ادب کی اشاعت اور اس کا فروغ شامل ھے ، ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی پوری طرح نوازا جاتا ھے ۔ کاش پاکستان کا رائٹرز گلڈ علاقائی اور شخصی تعصبات کے مذموم دائرے سے نکل کر کوئی مفید کام کرنے کے لائق ہوجائے ۔

روس میں یہ سب کچھ اسلئے ھے کہ وھاں ایک منزل مقصود معین ھے ، ایک نظریۂ حیات ھے ۔ وھاں کے لئے یہی کہا جاتا ھے ، کہ وھاں لادینیت ھے ۔ ضرور ھے مگر اسے استحکام حاصل ھے ۔ ھم پاکستان میں اسلام کا نام لیتے ھیں اور کہتے ھیں کہ یہ ھمارا نظریۂ حیات ھے ۔ الفاظ کی حد تک یہ بات درست ھے ۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ جو لوگ درس اسلام دیتے ھیں اور اسلام کے داعی ھیں ، خود ان کا عمل کیا ھے ؟ کیا یہ حقیقت نہیں ھے کہ یہ اھل اسلام خود متعدد نظریات کے حامل ھیں اور اسلام کے کسی ایک نقطے یا مرکز پر جمع نہیں ھیں ۔ جب ان کا اپنا یہ حال ھے تو عام لوگ کس طرح راہ ترقی پر چل کر منزل مقصود تک پہنچ سکتے ھیں ۔

پاکستان کی عمر اب تیس سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس طویل عرصے میں علمائے اسلام کے اتحاد کا پتہ کوئی بتائے۔ ۱۹۷۱ء کے انتخابات میں ان اهل اسلام کے اتحاد فکر و عمل کی کوئی مثال تو بتادیجئے۔ اب ۱۹۷۸ء میں هم نے ان کے اتحاد کو پارہ پارہ هوتے دیکھا ہے۔ هم اس عدم اتحاد اور فکری بعد سے کن طاقتوں کو آب حیات پلا رہے هیں۔ یہ علماء کہ جو هر بر سر اقتدار حکومت کے درپئے آزار هوتے هیں، خود ان کے ایمان متزلزل هیں اور اگر میں یہ کہوں کہ گزشتہ تیس سال میں ان هی کی کج روی نے تیرگی کو جنم دیا ہے تو یہ بے جا نہ هوگا۔ اور پھر اسی تاریکی نے تو اهل فکر و نظر کو روشنی سے محروم کیا ہے۔ پھر پاکستان میں استراحت گاہ نویسندگان کا تخئیل و تصور کیسے قائم هو اور وہ خود اپنا مقام کہاں تلاش کریں۔

حدیقۂ نباتات

هماری موٹریں باغ بوتانیکی (حدیقۂ نباتات) میں داخل هوگئیں۔ یہ باغ تاجیک اکیڈمی آف سائنسز کے زیر اهتمام ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے۔ اس باغ میں لگے هوئے درختوں کی لکڑیوں، چھالوں، پھولوں اور پھلوں کے نمونے اس میں رکھے گئے هیں۔ اسی جگہ ایک مکان میں نے دیکھا۔ مشہور ہے کہ اس میں شاعر عظیم رودکی کو قیام کا موقع ملا تھا۔ اس کی بہت سی نگارشات نے یہیں جنم لیا تھا۔ اس میوزیم میں ایک کتاب رائے بھی ہے۔ هم سب نے اس میں دستخط کئے۔ جعفری صاحب نے ایک شعر بھی لکھ دیا:

درخت دوستی بنشاں کہ دست دل یار آور
نہال دشمنی بر تن کہ رنج بیشمار آور

اس باغ بوتانیکی میں چشموں سے بہتے ہوئے شیریں پانی کے کئی گلاس میں نے پی لئے۔ جرعہ جرعہ ہر ایک میں سے پیا گیا۔ میں نے یہ پانی پی کر بڑی تازگی محسوس کی۔ ایسا لگتا تھا کہ زندگی میں کئی دنوں کا اضافہ ہوگیا ہے۔ میں اس ماحول سے بھی بڑا متاثر ہوا اور غرق فکر رہا۔ ناش پاتی کے ایک درخت کے نیچے میں کھڑا ہوگیا۔ اس پر سفید پھول بڑی بہار دے رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں ان سفید و زرد پھولوں کے دل سے آب شیریں چوس رہی تھیں۔ اب یہ شہد بنائیں گی جس کے لئے قرآن پاک نے کہا ہے: ”اس میں شفاء ہے“۔ میں نے ان مکھیوں کو، جو چھتے کی صورت میں جمع تھیں، بڑے رشک کے ساتھ دیکھا کہ انکی رسائی اس آب شیریں تک ہے جو پھولوں کی جان ہے اور پھر ان کو اس آب شفاء کو جنم دینے کی سعادت ملتی ہے۔ ان مکھیوں کی مسلسل مشغولیت اور خلوص کار کا اندازہ لگانے کے لئے میں دیر تک کھڑا ان کو دیکھتا اور ان کی بھنبھناہٹ سنتا رہا۔ کاش، میں ان کی زبان بھی سمجھ سکتا کہ وہ بھنبھناہٹ کے الفاظ میں ایک دوسری سے کیا کہ رہی ھیں۔ ان سے سبق ملا کہ جدوجہد اور کاوش مسلسل اور سعی پیہم کے بغیر کوئی شے عالم وجود میں نہیں آسکتی۔ آب شیریں کو شہد کامل بننے تک کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے! ذرا نویسندگان اس پہلو پر غور کریں کہ تعمیر کی خاطر کیسی اور کتنی منزلیں طے کرنی پڑتی ھیں۔

دست قدرت کی دامن کشی

میں عالم محویت میں تھا کہ آگے چل پڑنے کا فیصلہ کرلیا گیا - اس قدر حسین ماحول کو چھوڑنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن پروگرام کا تقاضا مجبور کردیتا ہے - چنانچہ ہم سب کے سب چل پڑے لیکن بہت جلد ایک مقام ایسا آیا کہ دست قدرت نے دامن کھینچ لیا ، ہر ایک کی توجہ دلچسپ مناظر نے جذب کرلی اور دل کھینچ لیا - سب موٹریں رک گئیں اور سب مندوبین اتر پڑے - تصویر کشی کے لئے بھی یہ جگہ اچھی تھی - چنانچہ چمڑے کے تھیلوں میں سے کیمرے نکلے اور ریل کھسکنے لگے -

مگر تصویروں سے زیادہ میری دلچسپی کا سامان وہ پیارے بچے اور وہ پیاری بچیاں تھیں جو ہمیں دیکھ کر اپنی قریب کی درسگاہ سے بے تحاشا باھر نکل کر ہمارے قریب آگئی تھیں - مگر ایسا لگتا تھا کہ ان کو ہم اجنبی لوگوں سے کچھ خوف بھی دامن گیر تھا - وہ بچے قریب آئے لیکن ذرا کھنچے کھنچے رہے - ان کی زبان تاجیکی تھی ، لباس بھی تاجیکی تھا - یہاں تک کہ ان کے چہروں کا نور بھی تاجیکی تھا - ان بچوں اور بچیوں میں حیا بھی تاجیکی انداز کی تھی - میں نے چاھا کہ ان بچوں اور بچیوں کے بستے کھول کر ان کی درسی کتابوں پر نظر ڈالوں مگر ان سب پر ایک قسم کی گھبراھٹ طاری ہوگئی - وہ بچے کسی طرح نہ تو قریب تر آئے اور نہ اپنی کتابیں دکھانے کے لئے تیار ہوئے - یہاں تک کہ ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف بھی ناکام رہ گئے - تاھم پروفیسر عاصموف صاحب نے ہم سب کے بارے میں

چند جملے کہے کہ ہم مہمان ہیں ، تب بچے نرم ہوئے ۔

رسم الخط اور زبان

کتابوں میں رسم الخط بدل چکا ہے ۔ تاجیکی فارسی عام ہے ۔ خالص فارسی رسم الخط اور زبان ختم ہوتی جارہی ہے ۔ اس کا رواج ہر سطح پر ختم ہوچکا ہے ۔ یہ انقلاب عظیم نظام تعلیم بدلنے ہی سے آیا ہے ۔ اس معاملے میں یا پالیسی طے کرنے میں روسی حکومت نے کوئی جبر نہیں کیا ہے ، نہ کوئی حکم جاری کیا ہے ۔ بلکہ نئے فیصلے اور انتخابات کے فیصلے عوام کو فراہم کئے ہیں ۔ اس حقیقت کو پھر بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ روسی حاکم ہیں اور یہ پانچ مسلم ریاستیں ، جو ہر چند کہ اپنے معاملات میں بڑی حد تک آزاد ہیں ، اس حکومت کی محکوم ہیں ۔ البتہ روسی حکومت نے ان کی خودی کو حتی الامکان پامال نہیں کیا ہے ۔ ان کے احترام کو ملحوظ رکھا ہے اور کوئی ایسا موقع فراہم نہیں کیا ہے کہ بغاوت کا خیال بھی کسی کے دل میں آسکے ۔ تاہم اگر اتفاقاً کبھی کوئی بغاوت ہوجائے تو اسے فوراً کچل دیا جاتا ہے ۔ یہ اصول ان ریاستوں ہی کے لئے نہیں ہے ، اگر خاص روس میں ایسی صورت رونما ہو تو یکساں عملی قدم اٹھایا جاتا ہے ۔ مخالف پارٹی کا وجود تک باقی رہنے نہیں پاتا ۔ حاکم کی زبان بہر نوع زبان حاکم ہے ۔ گزشتہ تیس سال میں اس نے ان مسلم ریاستوں میں بھی اپنا رنگ جمالیا اور اپنے لئے مقام پیدا کرلیا ہے ۔ اب صورت یہ ہے کہ روسی زبان سب جگہ زبان اول بن رہی ہے ۔ اب روس کا ہر شخص ، وہ تاجیکی ہو یا ازبکی ، ترکستانی ہو یا تاشقندی ، روسی زبان جانتا ، سمجھتا اور

بولتا ہے۔ اس نے اپنی زبان بھی برقرار رکھی ہے۔ اس طرح کم سے کم پانچوں مسلم ریاستوں کا عمل یہ ہے کہ وہاں کا ہر شخص کم سے کم دو زبانیں جانتا ہے جبکہ روسیوں کو یہ فخر حاصل نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ کوئی خالص روسی شخص علاوہ روسی زبان کے، دوسری زبان نہیں بولتا۔ البتہ یہ ریاستی باشندے روسی زبان بولنے کے لئے مجبور ہیں اور اپنی دوگونہ زبان دانی کی برتری کے باوجود ، دوسرے درجے کے شہری ہیں۔

مسلم ریاستوں میں سے تاجیکستان کے بارے میں میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ ترقی کے مواقع یہاں سب کے لئے یکساں فراہم کئے گئے ہیں۔ وہ روسی ہو یا تاجیکستانی، ترقی کے امکانات سب کے لئے یکساں ہیں۔ شکوک و شبہات کے دروازے بند ہیں۔ آج سے پندرہ سال قبل عرفات کے میدان میں روسی ترکستان کے حاجیوں سے تبادل خیال کا موقع ملا تھا۔ ان میں سے بعض کی زبان سے روسی ظلم و ستم کی داستان سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے لیکن اب وہ دور شاید ختم ہوگیا ہے۔ کسی کو حکومت سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مذہب کے معاملہ میں ، جیسا کہ پہلے ہی لکھا جاچکا ہے، بالکل آزادی ہے۔ ہر سال حج پر جانے والے حاجیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حکومت ان کو سہولت سفر میں کوئی رعایت نہیں دیتی لیکن کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی جاتی۔ ہر شخص کو اجازت ہے کہ اگر وہ دین اسلام کا پیرو ہے تو اس کے نور سے اپنا دل روشن کرلے۔ اس عقیدت میں برابر اضافہ ہورہا ہے اور ایک خالق کل اور نورالسموات والارض

کی تلاش منزل تک پہنچا دے گی ۔

لامذہبیت کی دنیا میں

میں نے اندازہ لگایا اور یہ اندازہ یقیناً صحیح ہے کہ سرکاری طور پر لامذہبیت کی اس دنیا میں مسلمان سچائی اور پوری عقیدت کے ساتھ اسلام کا، عیسائی اپنی نصرانیت کا اور یہودی دین موسیٰ کا پابند اور عامل ہے ۔ حکومت سے کسی کا کوئی سروکار نہیں ہے اور نہ حکومت ان کی کسی رسم کی ادائیگی میں مزاحم ہوتی ہے اور نہ شاید مدد دیتی ہے ۔ روس کا یہ طریق کار بالکل چین کی طرح ہے ۔ وہاں بھی حکومت کو کسی مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ ہر شخص جس خدا یا دیوتا کے سامنے چاہے، جھک سکتا ہے ۔ چین کا مسلمان بھی اسلامی اصول و نظریات پر عمل کرتا ہے ۔ ایک بات دونوں جگہ یکساں ہے ۔ ان برائیوں کی، جن کو ہر قوم نے ہر زمانے میں برا سمجھا ہے، برا ہی سمجھا جاتا ہے اور ان کے استیصال کے لئے آئین میں گنجائش ہے ۔ پولیس احتساب کرتی ہے اور عدالتیں سزائیں دیتی ہیں ۔ انسانی مساوات کا سب سے زیادہ خیال اسلام نے رکھا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ مساوات کے راستے سے ایک قدم پرے نہ ہٹا جائے ۔ ان دونوں ملکوں میں بھی مساوات کا، ذرا سے فرق کے ساتھ، خیال رکھا جاتا ہے ۔ اصول اور طریق کار مختلف ہیں ۔

نئے سوویت آئین میں

سوویت یونین کے نئے آئین میں، جو ۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو منظور کیا گیا، کہا گیا ہے :

"قانون کے نزدیک سوویت یونین کے تمام شہری ، بلا
لحاظ آبائی سکونت ، سماجی یا مالی حیثیت ، نسل
قومیت، جنس، تعلیم ، زبان ، مذہب کے بارے میں روئیے،
پیشے کی قسم اور نوعیت، حالیہ سکونت یا دیگر حیثیت
بالکل برابر ہیں "۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ سوویت ریاست اقتصادی ، سیاسی اور سماجی شعبوں اور ثقافتی زندگی میں مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے برابر حقوق کی ضمانت دیتی ہے - یونین میں ہر شہری کو مناسب حقوق اور آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہے - مثلاً روزگار پانے کا حق ، بیمار یا اپاھج ھوجانے پر وظیفہ پانے کا حق ، عوامی تنظیموں میں شامل ھونے کا حق ، مذھبی عقیدے کی آزادی ، تقریر اور تحریر کی مناسب حد تک آزادی وغیرہ - مسلمان سمیت سارے سوویت عوام ان کا پورا پورا استعمال کرتے ھیں - سماجی ، اقتصادی ، سیاسی اور انفرادی حقوق کے علاوہ نئے آئین میں حقوق کو ، جو پہلے سے موجود تھے ، قانونی حیثیت بھی دے دی ہے - مثلاً ہر شہری کے لئے محنت کے تحفظ کا حق ، رھائشی مکان بنانے کا حق ، ثقافتی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق ، ریاستی نظم و نسق میں حصہ لینے کا حق اور دوسرے بہت سے حقوق بھی شامل ھیں -

مذھب کی آزادی سوویت شہریوں کی جمہوری آزادیوں کا ایک حصہ ہے اور سوویت یونین کے آئین کے اصولوں میں یہ بات شامل ہے - ۱۹۱۸ء میں روسی وفاق کے آئین میں بھی اس اصول پر زور دیا گیا تھا اور سوویت یونین کے ۱۹۳۶ء کے آئین

میں بھی یہ بات شامل تھی۔ ملک کے نئے بنیادی قانون سے بھی یہ بات پوری طرح آشکار ہوتی ہے کہ ریاست کو مذہب کی حقیقی آزادی کے نفاذ کی بڑی فکر ہے۔ چنانچہ دفعہ ۵۲ میں یہی باتیں کہی گئی ہیں۔ اسی آئین میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ سماج میں انسان کی حیثیت کا تعین کرنے کے لئے یہ معلوم کیا جائے کہ اس نے سماج کے مفاد کے لئے کتنی محنت کی ہے اور اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے چونکہ مسلمان بڑے محنتی لوگ ہیں، اس لئے قدرتی طور پر سارے ملک میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ معاشی اور ثقافتی شعبوں میں کام کرنے والے ہزارہا مسلمانوں کو اعزازات اور تمغے دئے گئے ہیں۔

ایک نئے سماج کی تشکیل و تعمیر اور ملک کا نظم و نسق چلانے میں سرگرم حصہ لیتے ہوئے بھی سوویت مسلمانوں کو اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے پورے مواقع حاصل ہیں۔ ان علاقوں کے علاوہ جو روایتی طور پر مسلمانوں کے علاقے ہیں، مثلاً ازبکستان، قزاخستان، تاجیکستان، آذربائیجان، کرغزیہ، ترکمانیہ، تاتاریہ، بشکیریا، کباردینو، اور داغستان وغیرہ، خالص روسی آبادی والے شہروں مثلاً ماسکو، لینن گراد، آلیا نودسک، روستوو، گورکی، آرمینیا اور جارجیا کو جمہوریاؤں اور دوسرے خود مختار علاقوں میں مسجدیں موجود ہیں اور ان میں باقاعدہ نماز ہوتی ہے۔

چار مسلم بورڈوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان کے سربراہ ممتاز عالم و مفتی ہیں۔ یہ بورڈ قران حکیم اور احادیث نبوی صلعم اور مذہبی تقویم شائع کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک بورڈ نے

پچھلے سال چھ مرتبہ قران حکیم طبع کرایا ۔ حضرت امام بخاریؒ کی تصانیف ، الجامع ، الصحیح اور الادب المفرد اور حضرت عثمانؓ کے زیر استعمال قران پاک کی تاریخ کے بارے میں اسمعیل مخدوم سطیؤ کی کتاب شائع کی ۔ قران پاک کا یہ نایاب نسخہ تاشقند کے عجائب گھر میں محفوظ ہے ۔

فارغ البالی

روس میں غریب لوگ آج فارغ البال نظر آتے ھیں ۔ وھاں دولت کی فراوانی ہے ۔ اسلامی دنیا کے بعض دوسرے ممالک بھی اب فارغ البال ھوتے جارہے ھیں ۔ اس کے باوجود یہ دیکھنا چاھئے کہ عرب کی دولت کس کام آرھی ہے ۔ آج بد یہی طور پر دولت کا ایک حصہ عشرت کدہ ھائے مغرب میں صرف ھو رہا ہے اور میکدہ ھائے مشرق میں لٹایا جارھا ہے ۔ ھمارے ھاں پاکستان میں ایک صاف گو حقیقت پسند نے یہ بات کہہ دی کہ ذرا اسرائیل کو دیکھئے کہ اس نے صحرا کوچمنستان بنا کر رکھ دیا ہے ۔ دوسری طرف عربوں کا حال یہ ہے کہ ان کے جو چمن تھے وہ صحرا بن گئے ھیں، تو اس صاف گو حقیقت پسند انسان کو سزا ملی ۔ اور بالآخر اسے ملک بدر ھونا پڑا، مگر کیا جو بات کہی گئی اور جس رائے کا اظہار ھوا ، صداقت سے دور تھی ؟ آخر حقائق سے ھم فرار کیسے اختیار کرسکتے ھیں ؟ آج اھل اسلام کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے ذرائع ، وسائل اور ذخائر کا صحیح استعمال کرنا بھی نہیں جانتے ۔ اس سنگین صورت حال میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے ۔ اگر کوئی انقلاب نہیں آیا تو ان کو زیر نگیں ھونا پڑے گا ۔ اللہ تعالیٰ نے کب کہا ہے کہ

وہ صرف مسلمانوں کا رب ہے ۔ وہ تو رب العالمین ہے ۔ اللہ اس کے ساتھ رہیگا کہ جو عمل کریگا ، تحقیقات کے میدان سر کریگا ۔ زمین و آسمان کے مابین جو راز ھائے کائنات ھیں ان کی عقدہ کشائی کریگا ۔ جو چاند پر کمند پھینکے گا ، اللہ اسی کے ساتھ ہوگا ۔ اللہ ان کے ساتھ کیسے ھوسکتا ہے کہ جو اس کا نام تو زبان سے لیں لیکن ھاتھ میں جام شراب بھی اٹھائے رھیں ۔ تسبیح ان کے ھاتھ میں ھو اور قحبہ خانوں کے چکر لگاتے پھریں ۔ زبان پر کلمہ ھو اور عملی طور پر مشرق و مغرب کے عیش خانے ان کے دم سے آباد ھوں ۔ وہ روزہ رکھیں اور جھوٹ بولیں ۔ دغا بازی بھی کریں ۔ ایسی بے عمل ملت کی موت یقینی ہے ۔ زندہ وھی رھیگا جو عمل کے میدان میں آگے بڑھتا رہے ۔ ان علمائے حق کا وجود بے سود ہے کہ جو عمل میں صفر کا درجہ رکھتے ھیں اور جن کے دست و بازو نفاق کے بیج پھینک رہے ھیں ۔ اھل اسلام اور صاحبان فکر و نظر اور علمائے حقیقت کو اس حقیقت کا ادراک کرنا چاھئے کہ لادینی اور لا مذھبیت کو عرصۂ دراز تک قرار نہیں مل سکتا ۔ دین و مذھب سے دور ھوکر امریکا اور مغرب آج بڑی عجیب ذھنی کشمکش میں مبتلا ھوگئے ھیں ۔ ان کو اب ایک ایسے دین کی تلاش ہے کہ جو دین فطرت ھو اور جو ایک مرکزیت فکر کی دعوت دے ۔ یہ لادینی اور مذھب بیزاری اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مسلمان عمل کی دنیا میں واپس نہیں آئیں گے ۔ مسلمانوں کے عمل سے فرار نے فکرھائے دگر اور نظریۂ ھائے متضاد کو وجود بخشا ہے ۔ اس صورت حال کا بالکل حقیقت پسندانہ ادراک کرنا چاھیے اور جذبات کو دخیل نہیں بنانا چاھیے کہ ایسا

کر کے ہم مقصد کو کبھی نہیں پاسکتے اور نہ منزل کو پہنچ سکتے ہیں ۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف اور ادراک کرنا چاہیے اور پھر ان کے سدباب کا سامان کرنا چاہیے ۔ عالم اسلام میں آج جو شدید بیداری پیدا ہورہی ہے ، اس کا استقبال کرنا چاہیے اور اس وجہ سے اقصائے عالم میں اسلام کے لئے جو جگہ پیدا ہورہی ہے اسے پر کرنے کا سامان کرنا چاہیے ۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے مرکز سے فرار کی راہ اختیار کریں اور قرآن و سنت نبوی سے صرف نظر کریں اور یہ چاہیں کہ جو خلا پیدا ہوا ہے اسے اسلام سے پر کردیں ۔ سب سے پہلے اہل اسلام کو قرآن و سنت کی روشنی میں مقصد و منزل کا تعین کرنا ہوگا اور پھر نور اسلام کی روشنی میں ہر خلا کو تلاش کرکے اسے پر کرنا ہوگا ۔ فکر و عمل کو اس دھارے پر جب تک نہیں ڈالا جائے گا محض دولت ہمارے درد کا مداوا نہیں بن سکے گی اور آج جو دولت ہمارے پاس ہے اگر اس کا آج صحیح استعمال نہ ہوا تو کل ہمیں پچھتانا ہوگا ۔

روس کے زیر نگیں یہ پانچ مسلم ریاستیں اس خطۂ ارض کو نور اسلام سے منور کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں ۔ ان کو اس مدد کی ضرورت ہے کہ ان سے باہر کی اسلامی دنیا اصول دین پر بکمال عامل ہو ۔ ہر انسان تابع فطرت ہے ۔ روس کا انسان اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔ فطرت کی آغوش میں جانے کے لئے وہ ہمہ وقت تیار ہے ، خواہ وہ ماسکو کا ہو ، لینن گراد کا ہو یا دوشنبہ اور تاشقند کا ۔

مقام کیف و انبساط

اس سیر سپاٹے کے بعد ہم ایک مقام ”ورزوب ،، پر آ کر

رکے ، جہاں سب کے لئے دوپہر کے کھانے کا اہتمام ایک ریستوران میں کیا گیا تھا ۔ اس کا ایک طعام خانہ لب جو ہے ۔ واہ وا ! کیا جگہ ہے ۔ دریائے دوشنبہ پورے زور و شور اور حسن کے ساتھ بہ رہا تھا ۔ سامنے برف پوش پہاڑ تھے ۔ موسم کسی قدر سرد تھا مگر کبھی سورج بادلوں میں سے جھانکتا تو دھوپ چھاؤں کا فرق عجیب کیفیت طاری کرتا تھا ۔ میں نے پروفیسر عاصموف صاحب سے کہا :

”آپ کے ذوق لطیف اور حسن انتخاب اور صلاحیت انتظام کی داد دیتا ہوں ۔ آپ نے آج پورے دن اس کیف و انبساط سے دو چار کیا ہے ، جسے عرصۂ دراز تک فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔ خدا آپ کو خوش رکھے ،، ۔

کھانا حسب معمول خوب تھا ۔ شراب و کباب کا لطف تو ان لوگوں سے پوچھنا چاہئے جو اس شغل کو حاصل زندگی بلکہ واحد مقصد حیات سمجھتے ہیں ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے ، میں اس ریستوران کے پس منظر کی موسیقی سے لطف اٹھاتا رہا ۔ دریائے دوشنبہ کی ہر لہر ایک غیر مرئی ساز پر نغمہ الاپ رہی تھی ۔ سوز و گداز سے پر نغمے ہوا میں ابھر رہے تھے ۔ اس کی بل کھاتی ہوئی لہریں اور مسلسل شور چشم تصور کو سہارا دے کر رقص و سرود کی دنیا میں لے جارہا تھا ۔ میں نے دخت رز سے دامن بچا کر اپنے ذوق کے مطابق سیدھا سادا ناشتہ کیا اور پھر آہنی کٹہرے کا سہارا لے کر نیم دراز ہوگیا ۔ میرے کان برابر لہروں کی موسیقی کے لئے وقف تھے اور آنکھیں سرسبز پہاڑوں کا نظارہ کر رہی تھیں ۔ بالآخر چلنے کا وقت آگیا ۔ میں نے دل میں کہا ع

"حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد"

موٹر میں آ کر بیٹھ گیا۔ باقی ساتھی بھی آ گئے۔ ان میں سے بعض بادل ناخواستہ اٹھے تھے۔ شاید وہ دو چار اور جام خالی کرنے کے درپے تھے۔ موٹریں بڑی تیزی سے چلیں اور شام کے تقریباً پونے پانچ بجے ہم سب ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ریسٹ ہاؤس پر جناب ڈاکٹر اکبر جان ہم سب کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ لوگ پہلے پہنچ چکے تھے۔ میں جس موٹر میں تھا، وہ ذرا دیر میں پہنچی۔ اسلئے کہ راستے میں ایک اسٹور سے آقائی غلام مصطفیٰ رسولی صاحب خریداری کے لئے رک گئے تھے۔ میں بھی اتر کر اسٹور میں چلا گیا، میں نے آمنہ اور ماہم کے لئے ایک ایک جوڑا کپڑے کا خرید لیا۔

ریسٹ ہاؤس پر اکبر جان صاحب نے صرف دس منٹ کی مہلت دی کہ میں جلد تیار ہوجاؤں۔ میں نے طوفان کی رفتار سے تیاری کی۔ غسل کیا۔ دو فرض نماز عصر کے ادا کئے اور باہر آگیا۔ دوسرے سب غائب تھے۔ وہ انتظار کئے بغیر چلے گئے تھے۔ وہ مجھے زاہد خشک کہتے تھے۔ میرا ان کا میل بھی کیا تھا۔ بہر نوع اکبر جان صاحب میرے منتظر تھے۔ میرے ہمراہ روانہ ہوئے۔ بارے ہم سوا پانچ بجے تھیٹر پہنچ گئے۔ رقص و سرود کا سارا پروگرام عینی سے متعلق تھا۔ مجموعی طور پر اسے بہت ہی اچھا کہا جاسکتا تھا مگر میری دل چسپی کا اس میں سامان نہیں تھا۔ غالب کا ایک مصرع میرے ذہن کا ترجمان تھا۔ ع

"پر طبیعت ادھر نہیں آتی"

انجمن دوستی کی چیرمین

محترمہ مادام مغفرت کریمووا صاحبہ تاجیکستان کی انجمن دوستی کی چیرمین ھیں۔ ملک میں ان کا علمی مقام بہت بلند ھے۔ آج کے پروگرام میں صرف انڈیا اور پاکستان کے وفود کو ان سے ملاقات کرنی تھی۔ پروفیسر عاصموف صاحب تھیٹر میں آگئے تھے۔ اس سے قبل وہ کسی جگہ ایسے پروگرام میں نہیں دیکھے گئے تھے۔ ان کی متانت و سنجیدگی اور رجحان طبع شاید ایسے ھنگاموں سے فرار پر ان کو آمادہ کرتا رھتا ھے۔ اس وقت وہ شاید اسلئے شریک محفل ھوگئے تھے کہ انہیں ھم مندوبین کو مادام مغفرت کے ھاں لے جانا تھا۔

حیرت ھوتی ھے کہ اس شہر دوشنبہ میں ثقافتی سرگرمیوں کے کتنے زیادہ ھال ھیں اور ان میں پروگرام اس کثرت سے ھوتے ھیں کہ وہ کبھی خالی نہیں رھتے اور ان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں رھتی۔ شاید ماسکو شہر اس اعتبار سے بازی لے جائے۔ یہاں جو پروگرام ھوتے ھیں، ان کے بارے میں سنا ھے کہ مہینوں پہلے ٹکٹ خریدنے پڑتے ھیں ورنہ مایوس ھونا پڑتا ھے۔ طول و عرض کے اعتبار سے دوشنبہ کوئی بڑا مقام نہیں ھے لیکن ثقافتی سرگرمیاں عروج پر رھتی ھیں اور اسی لحاظ سے ثقافتی مراکز بے شمار ھیں۔ اسکے برعکس ایک ھمارے ملک اور خصوصاً شہر کراچی کا حال ھے کہ کوئی بھی کانفرنس ھال قابل ذکر نہیں ھے۔ لے دے کر ایک آرٹس کونسل ھے۔ اس کے بارے میں صورت حال یہ ھے کہ اس کی تعمیر پندرہ برس سے ھورھی ھے اور کسی طرح مکمل ھونے کا نام نہیں لیتی۔ جب دوسرے ممالک کے

ثقافتی طائفے آتے ہیں تو بڑی شرم آتی ہے۔ کوئی ایسی مناسب جگہ نہیں ہے جہاں وہ اپنی ضرورت کے مطابق فن کی نمائش کریں اور قیام بھی کرسکیں۔ کوئی بڑی کانفرنس ہو تو اسٹیٹ بنک کے ایک حصے کو خالی کرایا جاتا ہے یا حبیب بنک پلازا کی ایک منزل مخصوص کرائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی اسمبلی ہال بھی استعمال میں آجاتا ہے۔ ورنہ ہوٹل ہیں جو ہرگز کسی علمی کنگرس کی ضرورت کو پورا نہیں کرتے۔ میں ایک عرصے سے مزار قائداعظم رح سے ملحق زمین پر ایک بین الاقوامی معیار کا مرکز کنگرس بنانے پر زور دیتا رہا ہوں مگر اس میں گزشتہ پندرہ سولہ سال سے رکاوٹیں ڈالی جارہی ہیں۔ اب ایک مشیر صاحب کو میری تجویز اور جدوجہد پسند نہیں ہے۔ وہ اس کا کریڈٹ خود لینا چاہتے ہیں۔ میں کب کہتا ہوں کہ اس افتخار کا سہرا میرے سر باندھو، مگر کام تو کرو۔

مادام مغفرت کریموا کا بڑا نفیس دفتر تھا۔ اس میں کانفرنس ٹیبل پر ہم تین آدمی بیٹھے۔ فیض احمد فیض، میں اور علی سردار جعفری۔ میز پر چار جھنڈے تھے — روس، تاجیکستان انڈیا اور پاکستان — یہ ملاقات باہمی تبادل خیالات کے لئے تھی اور خصوصیت کے ساتھ تھی۔ مادام ہیڈ آف دی ٹیبل سے اٹھ کر میرے پاس آگئیں۔ جناب فیض میرے دائیں جانب تھے۔ وہ ہم سے تبادل خیال کرتی رہیں۔ چائے، بسکٹ اور شراب کا اہتمام تھا۔ جام شراب جب تک شراب سے پر نہ ہو، ٹوسٹ پروپوز کرنا ثقافت و روایت کے خلاف ہوتا ہے۔ میرا جام شراب بھرا تو ضرور گیا لیکن وہ نہ خالی ہوا، نہ چھلکا۔ پھر کوئی بتائے کہ

ٹوسٹ اخوت اور دوستی کے لئے پروپوز ہوا کیسے ؟

محترمہ نے ہم سب کو تحائف عطا کئے اور پھر وہ مزید تحائف کے لئے نیچے چلی گئیں ، جہاں خواتین کو مصروف کر دیا گیا تھا ۔ اوپر کی میٹنگ میں وہ شریک نہ ہوسکیں ۔

میں نے رات ساڑھے نو بجے تک اپنے ساتھ لائے ہوئے ہدایا کو مرتب کیا اور ان کو کاغذ میں باندھا ، سب پر نام لکھ دیا تا کہ یاد رہے اور وقت ضرورت خیال رکھا جاسکے ۔ میں اکیڈمی آف سائنس کے لئے کتابیں بھی لے گیا تھا اور ڈائریاں بھی جو ہمدرد نے مرتب کی اور شائع کی تھیں ۔ مجموعی طور پر ہدایا کے نو پیکٹ تیار ہوئے ۔ کل صبح نو بجے پروفیسر محمد عاصموف صاحب مجھ سے علیحدگی میں تبادل خیال کرنے کے لئے آئیں گے ۔ میں ان کی معرفت یہ ہدایا سب کو بھیج دونگا ۔ ایک ہدیہ خود ان کے لئے بھی تھا ۔ ایک مادام مغفرت کریموا کے لئے تھا ۔ باقی مادام مریم سلگانگ ، ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف ، محترمہ بیوہ بابا جان غفوروف ، بیگم کمال صدرالدین عینی ، ڈاکٹر منیرہ ، مادام مارگریٹا اور ڈاکٹر اکبر جان کے لئے تھے ۔ میرا یہ فیصلہ مناسب تھا کہ ان ہدایا کی تقسیم میں عاصموف صاحب کی اعانت حاصل کی جائے ۔

دس بجے رات کھانا کھانے گیا ۔ بس مرغی نوش جان کرکے واپس آ گیا ۔ حسب معمول مطالعہ کرتا رہا اور پھر سو گیا ۔

دوسرے روز صبح اٹھ کر نماز فجر سے فارغ ہوکر پروگرام کے مطابق اگلے سفر کی تیاری شروع کردی ۔ اب ہمیں اس شہر جانا تھا جسے بخارا کے ساتھ ساتھ ، ایک سانس میں دونوں کا نام

لے کر لسان الغیب حافظ شیرازی نے اپنے محبوب کے سیاہ خال پر بخش دیا تھا اور ذرا بھی خیال نہیں کیا تھا کہ یہ قدم اٹھانے سے پہلے دونوں شہروں کے باشندوں سے صلاح و مشورہ اور اجازت طلب کرلی جاتی، لیکن شاعر ان جمہوری روایات کی کب پابندی کرتے ھیں۔ اس جگہ کے آثار بھی بہت مشہور ھیں۔

میں اپنی تیاری میں مشغول تھا کہ ڈاکٹر اکبر جان تشریف لے آئے تھے۔ وہ وقت مقرر کر گئے تھے۔ بڑی محبت سے میرے پاس بیٹھے۔ ذرا شاعرانہ انداز میں فرمایا :

"آپ نے محسوس کیا، جس دن آپ یہاں آئے تھے، اس دن سورج اپنی پوری ضیا باریوں کے ساتھ روشن تھا، آپ کے خیر مقدم کے لئے اور خوش آمدید کہنے کے لئے دنیا کھل کھلا اٹھی تھی۔ اور آج آپ جارھے ھیں، تو آسمان بھی رو رہا ھے۔ یہ معمولی بوندا باندی نہیں ھے، بلکہ جدائی کے آنسو بہائے جارھے ھیں۔ آسمان میرے دل کا ھمنوا ھے"۔

شعبۂ اردو کے سربراہ

ڈاکٹر اکبر جان بہت اچھی اردو بولتے ھیں۔ اھل پاکستان کو ان پر فخر کرنا چاھئے۔ وہ اکیڈمی آف سائنسز، تاجیکستان کے زیر اھتمام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے شعبۂ اردو سے تعلق رکھتے ھیں۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں جب میں یہاں بہ سلسلۂ جشن امیر خسرو دھلوی آیا تھا تو اکبر جان میرے مترجم تھے۔ اس درمیانی وقفے میں انھوں نے ڈاکٹریٹ کرلی ھے، گویا پوری طرح سند یافتہ ھوگئے ھیں۔ بالکل پاکستانیوں کی طرح اردو بولتے ھیں۔

گفتگو میں محاورے اور ضرب الامثال تک استعمال کرتے ہیں۔ اس قدر عبور حاصل کئے بغیر تو انہیں ڈاکٹریٹ نہیں مل سکتی تھی۔ یہ دریافت کرنے کا موقع نہیں ملا کہ ان کے تھیسس کا موضوع کیا تھا۔

ڈاکٹر اکبر جان ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ محترم جناب پروفیسر عاصموف صاحب تشریف لے آئے۔ اکبر جان اٹھ کر چلے گئے۔ دراصل میں نے ڈاکٹر اکبر جان کو آج صبح نو بجے آنے کی زحمت دی تھی تاکہ جب پروفیسر عاصموف صاحب سے فارسی میں بات چیت ہو تو ڈاکٹر اکبر جان میری مدد کرسکیں۔ مگر عاصموف صاحب نے ان کو اشارہ کردیا اور تخلیہ ہوگیا۔ عاصموف صاحب صرف تاجیکی، فارسی اور روسی زبانیں جانتے ہیں۔ اردو زبان سے واقف نہیں ہیں۔ بارے مجھے ان سے آدھ گھنٹے سے زیادہ باہمی دلچسپی کے امور پر تبادل خیال کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

تشکر و امتنان کا اظہار دونوں جانب سے تھا۔ وہ میری شرکت جشن صد سالۂ عینی کا شکریہ ادا کرتے رہے اور میں ان کی یاد فرمائی اور انتہا درجے کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ پروفیسر عاصموف صاحب کے علم میں یہ بات تھی کہ میں نے اپنے تاثرات سفر قلم بند کرنے شروع کردئے ہیں، کیونکہ اسی وقت سے ''روس نامہ،، مرتب کرنے کا ارادہ ہوگیا تھا اور اس کے لئے ضروری تھا کہ میں نوٹس لیتا رہوں۔ میں نے ان کو اب تک کے صفحات، جو میں نے گیارہ اپریل سے لکھنے شروع کردئے تھے، دکھائے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے عینی پر کتب

حوالہ آپ کے لئے جمع کردی ہیں ، جو آپ کو ابھی مل جائینگی ۔ نیز وہ تصاویر جو اب تک تیار ہوسکی ہیں، کتابوں کے ساتھ ہونگی ۔ وہ سب آپ کی اپنی کتاب کے لئے مناسب رہینگی ۔ ان کی جانب سے ڈاکٹر عبد اللہ جان صاحب نے اشارہ کردیا تھا کہ ہماری فکر کا محور اکتوبر کا انقلاب ہے ۔

اب سے تین سال پہلے ایران نے جشن ہزار سالۂ ابن سینا منایا تھا ۔ آج پروفیسر عاصموف صاحب نے تبادل خیال زیادہ تر اسی موضوع پر کیا ۔ یہی بات سال گذشتہ اگست میں ایڈنبرا (اسکاٹ لینڈ ۔ یو ۔ کے) میں بھی ان سے ہوئی تھی ۔ غالباً ایران نے پہل کے خیال سے جشن ہزار سالہ قبل از وقت منا لیا تھا ۔ پروفیسر عاصموف روس میں یہ جشن اکتوبر ۱۹۸۰ء میں منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور منصوبے بنا رہے ہیں ۔ ان کی رائے میں صحیح وقت اور تاریخ یہی ہے ۔ انہوں نے بتایا کہ جشن کی ابتدا ماسکو میں ہوگی ۔ اجلاس سائنسی دوشنبہ میں ہونگے اور بخارا میں جلسۂ آخری منعقد ہوگا ۔ انہوں نے مجھسے کہا کہ آپ نے جس طرح البیرونی کا ملک گیر پروگرام بنایا تھا ، ہم اس سے متاثر ہوئے تھے اور آپ ملک میں ہر موقع پر کئی جگہ اجلاس کرتے ہیں تا کہ مقامی علماء اور دانشور آسانی سے شرکت کرسکیں ۔ آنے جانے کی زحمت سے بچ جائیں ۔ میں اپنے دل میں متاسف ہوا کہ کنگرس عالمی تاریخ و فلسفہ سائنسی ۱۹۷۹ء میں ہماری وزارت خارجہ صرف ایک شہر تک محدود کرنے کی ہدایت دے چکی ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ بروقت کسی کے صلاح و مشورے پر وہ اس تقریب کا پروگرام ذرا وسیع پیمانے پر بناتے ہوئے دوسرے اہم

شہروں کو بھی اس میں شریک کرلے ۔ میری رائے ھے کہ یہ کنگرس اسلام آباد تک محدود نہ رہے کم سے کم لاھور اور کراچی ضرور شامل کئے جائیں ۔

پروفیسر عاصموف صاحب چاھتے تھے کہ اس سلسلے میں انھیں میرا تعاون حاصل ھوجائے ۔ مجھے ابن سینا پر جو حوالے مل سکیں، ان کو فراھم کردوں اور کرتا رھوں اور اس جشن کے علمی مقام کو بلند کرنے میں ان کی اعانت کروں ۔ آج صبح کی گفتگو کا ماحصل یہی موضوع تھا ۔ میں نے ان سے وعدہ کرلیا کہ برصغیر کی حد تک میں ان سے تعاون کرونگا ۔ جن اسکالرز کو دعوت شرکت دینی چاھئے، میں ان کے انتخاب میں بھی تعاون اور اشتراک کرونگا ۔ انھیں اس اعتبار سے بڑا اطمینان ھوگیا ۔

ابن سینا

ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا، جنھیں مختصراً صرف ''ابن سینا،، اور لاطینی انداز تحریر و تلفظ کے اعتبار سے تمام مغربی زبانوں میں ''ایوے سینا،، کہا جاتا ھے ، ۹۸۰ء میں پیدا ھوئے اور اٹھاون سال گزارنے کے بعد ۱۰۳۸ء میں فوت ھوئے تھے ۔ ان کے والد امیر بخارا ابن منصور کے عہد میں سرکاری محصول وصول کرنے والے عملے میں شامل تھے ۔ اس وقت کے مسلمانوں کے طور طریق کے مطابق تلاوت قران مجید سے ان کی تعلیم کا آغاز ھوا ۔ نو سال کی عمر میں انھوں نے تمام کلام پاک حفظ کرلیا ۔ پھر عام درسی کتابیں سنبھالیں اور انجام کار ریاضی ، منطق ، اقلیدس اور طب میں کمال حاصل کرلیا ۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سال ھوچکی تھی ۔ اس عمر کے بچے عموماً مکتب کی کسی جماعت میں

زانوئے ادب طے کرتے نظر آتے تھے، لیکن ابن سینا نے اپنے ذوق اور حافظے کی بنیاد پر بے پناہ ترقی کی اور اپنے استادوں تک سے خراج تحسین وصول کرلیا۔ طب سے ان کو خاص لگن تھی۔ چنانچہ ایسے طبی نظریات قائم کئے جو اس سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھے۔ انھوں نے علاج معالجے کے نئے طریقے وضع کئے اور اس فن کی راہ میں پھیلی ہوئی رکاوٹیں بھی دور کیں۔ چنانچہ ان کو بقراط اور جالینوس سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ دراصل انھوں نے ان کے ادھورے کام کو پائے تکمیل تک پہنچایا تھا اور یہی چیز ان کے لئے طرهٔ امتیاز تھی۔

وہ پکے مسلمان بھی تھے۔ احکام الٰہی کی تعمیل کرتے ہوئے وہ مشیت ایزدی پر کامل اعتقاد رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ طبیب کو حصول صحت کا محض ایک ذریعہ سمجھتے اور جسمانی و ذہنی شفا کے لئے خدائے بزرگ و برتر سے دعا مانگنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کے نزدیک صحت کی اصل کنجی صرف خدا کے پاس ہوتی ہے۔

اوائل عمر ہی میں انھوں نے امیر ہمدان کو ایک مہلک بیماری سے نجات دلائی تو اس نے خوش ہوکر اور اعتراف صلاحیت و استعداد کرتے ہوئے انہیں مسند وزارت پر جگہ دی جس کے وہ مستحق بھی تھے۔ لیکن وہ خود زیادہ عرصے اس عہدے پر فائز نہ رہ سکے اور علاحدگی اختیار کرلی کیونکہ ایک فرد سے وابستہ ہوجانے کے باعث وہ خدمت خلق کرنے سے قاصر ہوگئے تھے اور یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ وہ ہر شخص کو تندرست و توانا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ فرمانروائے اصفہان کے ایما

پر ترک وطن کرکے وہاں چلے گئے اور علاج معالجے کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کردیا ۔ ان کا منشأ یہ تھا کہ وہ اپنے تجربات ، مشاہدات اور تاثرات کو قلم بند کردیں تا کہ آنے والی نسلیں ان سے کماحقہ، استفادہ کرسکیں ۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ۔ '' القانون فی الطب ،، جس کی بدولت انہیں دنیا بھر میں شہرت دوام حاصل ہوئی ، اسی زمانے کی یادگار ہے ۔ ان کی یہ تصنیف عرصہٴ دراز تک مغربی دنیا کے طبی مدارس کے نصاب تعلیم میں شامل رہی ہے اور آج تک اس کے اندراجات بطور حوالہ پیش کئے جاتے ہیں ۔ اس کا متن انسانی صحت کے ہر پہلو پر حاوی ہے اور آج بھی ، صدیاں گزر جانے اور ہر منزل پر ترقی کے سنگ میل نصب کردینے کے باوجود ، ان کا ہر نظریہ سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے ۔

انہوں نے طبیعیات ، مابعد الطبیعیات ، فلکیات ، حیاتیات ، اخلاقیات ، حتیٰ کہ موسیقی پر بھی اپنی کتابوں میں سیر حاصل بحث کی ہے ۔ قانون طب کے بعد ان کی دوسری تصانیف میں الشفأ ، النجات ، اور الاشارات کافی مشہور ہیں ۔ ان کے تراجم دوسری زبانوں میں ہوئے ہیں لیکن قانون طب سے مقابلہ کسی عنوان ممکن نہیں ہے ، کیونکہ اس کے ترجمے مہذب دنیا کی ہر مقبول عام زبان میں ہوچکے ہیں اور بے شمار ایڈیشن ہوئے ہیں ۔

حکومت پاکستان تعریف کی مستحق ہے کہ اس نے آج سے بیس سال پہلے ہی طب مشرق کی برتری کو محسوس کرتے ہوئے اس کے اصولوں اور طریق علاج کی سائنسی تحقیقات کو منظم کرنے کے لئے عملی قدم اٹھایا تھا ۔ اس درمیانی مدت میں کچھ

رخنے پڑتے رہے اور تکمیل مقاصد نہ ہوسکی تاہم یہ نیک کام سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ہوتا رہا اور آج فخر کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ابنائے وطن کی ایک بڑی اکثریت اس طریق علاج کو پسند کرتی اور حصول صحت کے لئے اس پر بھروسا کرتی ہے۔

ابن سینا کی ہزار سالہ تقریب میں حکومت پاکستان اور طبی اداروں نے، جن میں "ہمدرد،، کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے، بھرپور حصہ لیا تھا اور خوشی کی بات ہے کہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے ایما پر کراچی کی ایک بڑی سڑک کا نام "شاہراہ ابن سینا،، تجویز کیا گیا تو عوام نے اسے تسلیم کرلیا اور بلدیہ کو اسے عملی جامہ پہنانا پڑا۔ دو سال بعد روس میں ابن سینا کا ہزار سالہ جشن ولادت منایا جائیگا تو مجھے یقین ہے کہ حکومت پاکستان اس میں حسب توفیق حصہ لیگی اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن بھی اس ضمن میں دامے، درمے، قدمے کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ یہ مسئلہ چونکہ عالمگیر نوعیت کا ہے، اس لئے پروفیسر عاصموف صاحب کی اعانت بھی حسب وعدہ کی جائیگی۔

میں اپنے وطن میں رہتے ہوئے صبح کا ناشتہ نہیں کرتا، لہذا یہاں دوشنبہ میں اس عادت کے خلاف کس طرح عمل کرتا لیکن آج عاصموف صاحب نے اصرار کیا کہ روانگی کے وقت خالی پیٹ جانا مناسب نہیں ہے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ جب فیض صاحب ناشتے کے لئے جائیں گے تو میں ان کے ساتھ چلا جاؤنگا۔

اس کے بعد میں نے تمام ھدایا کو جو میں نے شب گزشتہ

تیار کرلئے تھے ، ان کے حوالے کردئیے اور انھوں نے فوراً ھی ڈاکٹر عبداللہ جان اور ڈاکٹر اکبر جان کے ذریعے سے تقسیم کرادئیے - باقی وہ اپنے ساتھ لے گئے تاکہ بعد میں بھجوا دیں - مجھے ھدایا ان کے سپرد کردینے کے بعد بڑا اطمینان نصیب ھوا کہ اس طرح ان کو درجۂ قبولیت حاصل ھوا -

سمرقند کا پروگرام

گزشتہ رات بتایا گیا تھا کہ دوشنبہ سے ھوائی جہاز سمرقند کے لئے گیارہ بجے روانہ ھوگا اور اسی اعتبار سے میں نے تیاری کی تھی - مگر اب ڈاکٹر اکبر جان صاحب نے بتایا کہ جہاز ساڑھے بارہ بجے پرواز کریگا - مجھے یہ بات اس لئے پسند نہیں آئی کہ میرے بارے میں سب لوگ جانتے ھیں کہ میں وقت کا بڑا احترام کرتا ھوں اور کنگرس کے منتظمین سے مکمل تعاون کرتا ھوں - دوسروں کے لئے یہ صحیح ھے کہ ان کو آمادۂ سفر کرنے کے لئے اس قسم کی حرکت کی جائے - بارے میں نے بھائی جان محترم اور استاذی محترم مولانا سجاد حسین کو دھلی کے پتے پر نیز ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب کو لاھور کے پتے پر خطوط لکھ دئے اور ڈاکٹر اکبر جان صاحب کو پوسٹ کرنے کے لئے دیدئیے -

دوشنبہ کے ھوائی میدان پر اطاق امیران (VIP) میں چہل پہل ھوگئی - ھم مجموعی طور پر پندرہ سولہ مندوبین تھے کہ جو اس وقت ایک ساتھ سفر کر رھے تھے - اتنے میں پروفیسر عاصموف صاحب بھی آگئے - اور خانوادۂ عینی بھی ھمیں خدا حافظ کہنے کو موجود تھے - بس بیوۂ عینی نہ تھیں - ان سے ھم کل جاکر مل ھی آئے تھے -

مندوبین کے تاثرات

ٹیلے وژن کے لوگ ہماری روانگی کے وقت کی عکاسی کے لئے تیار تھے۔ درحقیقت یہ جشن کے بارے میں تاثرات ریکارڈ کرنے کا موقع بھی تھا اور بہت صحیح وقت تھا ۔ اگر سب مندو بین بیک وقت روانہ ہورہے ہوں تو ایسا ہی کرنا چاہیے ۔ انہوں نے مجھ سے بھی تاجیکی زبان (فارسی) میں انٹرویو کے لئے درخواست کی اور میں نے اطمینان سے جو انٹرویو دیا ، وہ تقریباً یہ تھا :

" ابن خلدون که فلسفی و ماهر تعلیم بود در شرق اوسط در مقدمۂ اوگفته اند که معاشره که احترام علم و عالم دارد سر بلندی و سر فرازیٔ آں معاشره یقینی ست۔ ایں قول خلدون برائے همه عالم است و برائے همه وقت و همه دور صحیح تر است ۔ می دانم که بعد از انقلاب اکتوبر در روس و همه جماهیر سوروی احترام علم و عالم قرار داد ۔ ایں جشن صد سالۂ عینی به مناسبت صدرالدین عینی مظاهر هائے ان احترام است ۔

علماء از همه عالم و ملل ایں جا در دوشنبه جمع شده اند به عنوان ایں احترام و اکرام علم و عالم ایں اجتماع بزرگ است و پر مقصد است ۔ من خوش بختم که در ایں کنگرس علمی شرکت می کنم و خیلے ممنون هستم ، بسیار متشکرم که تاجیکستان اکیدمی سائنسی بمن را دعوت شرکت داد ۔

بقول عینی :

دوستیٔ خلق جہاں پیش گرفتیم

از ماست برآں کس کہ چنیں رنگ بگیرد

ہوائی میدان پر پروفیسر عاصموف صاحب ، مادام مریم سلگانگ اور میرے مابین ایک اور تبادل خیال ہوا - پروفیسر عاصموف صاحب نے کہا : ''آپ نے مقالے کے جو حصے حذف کئے ہیں ، ان کو ہم حذف کر کے ہی شائع کرینگے ''- میں نے کہا کہ یہ حذف وقت کی کمی کی وجہ سے تھا - ورنہ مقالہ تو پورا ہی اختیار کرنا چاہئے - میں نے ان کی بات سمجھ لی - میں نے اپنے مقالے میں امیر بخارا کو کلیتہً مورد الزام بنانے سے گریز کیا تھا - درحقیقت یہ فکر انقلاب اکتوبر کی روح کے منافی تھا اور پروفیسر عاصموف صاحب اس کی تبدیلی کے خواہاں معلوم ہوتے تھے - میں نے ان کی بات سمجھ لی اور میں نے ان سے کہا کہ میں غور کر کے اس میں مناسب تبدیلی کردونگا اور اپنا مقالہ فارسی زبان میں تیار کر کے دونگا - وہ اس کا انتظار کریں -

میں نے ان کو مشورہ دیا تھا کہ عینی کی زندگی پر جو تصویر (فلم) تیار ہوئی ہے وہ اور کنگرس کے لئے جو فلم بنی ہے، اس کی جھلکیاں پاکستان کے لئے تیار کر کے دی جاسکتی ہیں - میں نے ان کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ یہ تمام سامان وولکاف (Vol Kov) صاحب کو کہ جو روس کے قونصل جنرل ہیں، بھجوائیں تاکہ وہ پاکستان کی وزارت تعلیم و ثقافت کے حوالے کریں اور پھر پاکستان میں جشن عینی پر ان فلمز کو دکھایا جاسکے - انہوں نے بتایا کہ وہ یہ کام کر رہے ہیں اور جلد اس پر عمل

کریں گے۔

ساڑھے بارہ بجے ہم ٹرائیڈنٹ ہوائی جہاز میں سوار ہوگئے۔ پون بجے جہاز دوشنبہ سے اڑا اور سمرقند کی جانب روانہ ہوگیا۔ موسم ابر آلود تھا۔ تقاطر بھی جاری تھا۔ مگر عاصموف صاحب اور ان کے رفقاء ہوائی میدان کے باہر کھڑے رہے اور خدا حافظ کہتے رہے۔

پینتالیس منٹ کے بعد ہم سمرقند کے ہوائی میدان پر اتر گئے۔ یہاں خوب بارش ہورہی تھی۔ جہاز میں سے اترنا بھی مشکل تھا۔ یہ بات اچھی نہ ہوئی۔ میرے مترجم ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب شریک سفر تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے اس وقت رخصت ہونگے کہ جب میں سمرقند سے دوبارہ ماسکو جاؤنگا۔ ان کی ذمہ داری اس وقت ختم ہوجائیگی۔ پروفیسر عاصموف صاحب نے میرا بڑا خیال رکھا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ عبداللہ جان صاحب کو زحمت دی جاتی۔ ماسکو سے آئے ہوئے تین مترجم تھے جو ہمہ وقت ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ میں کسی ایک گروپ میں شامل ہوسکتا تھا مگر انہوں نے ایک علاحدہ مترجم کو میرے ساتھ رکھا۔ یہ انتہائی مہمان نوازی تھی۔ اور روایات حسنہ کی امین۔

ایک بس ہوائی جہاز کے قریب آئی اور ہم سب اس میں سوار ہوگئے۔ پھر اسی بس میں ہم ہوٹل تک پہنچ گئے۔

''ہوٹل سمرقند،، (روسی میں)	Tocmu Hua, a
کمرہ نمبر 722	"Cauapka Hg"

بارش کسی طرح تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ہم نے اپنی گھڑیاں ایک گھنٹے پیچھے کرلیں۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ دوشنبہ اور یہاں کے وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے۔ کھانا دن کا کھایا گیا۔ تقریباً چار بج گئے۔ اب دن کو میری شیرخواری نے شہرت اختیار کرلی تھی۔ میرے بارے میں عموماً یہ جملہ کسی نہ کسی کی زبان پر آجاتا تھا: ''بھئی حکیم صاحب آ گئے ہیں۔ ان کے لئے دودھ لے آؤ''۔

طے پایا کہ ہمت کی جائے اور نہیں تو کم سے کم بس میں بیٹھ کر شہر میں گھوم لیا جائے۔ چنانچہ سب تیار ہوگئے۔ میں نے نئے کپڑے کہ جو صبح پہنے تھے، اتار دئے اور پرانے کپڑے نکال کر زیب تن کرلئے۔ آخر ان کو خراب تو ہونا ہی ہے۔

سمرقند کی تاریخی حیثیت

سمرقند، جو دریائے زرافشاں کے کنارے واقع ہے، دنیا میں موجود قدیم ترین شہروں میں سے ایک اور وسطی ایشیا کا قدیم ترین شہر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دنیا کے اور بہت سے شہروں کی طرح طوائف الملوکی کا شکار رہا ہے۔ قدیم یونانی نوشتوں میں اس کا ذکر ''ماراکندا'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس سے قبل اس مقام پر ایک چھوٹا سا قصبہ ''افروسیاب'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ تین چار ہزار سال قبل مسیح کی بات ہے۔ اس وقت کے آثار قدیمہ اب بھی موجودہ شہر کے جانب شمال دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس وقت وہ سوگدایانہ کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا اور مشرق قریب و چین کے مابین قدیم تجارتی شاہراہ پر

واقع تھا ۔

۳۲۹ قبل مسیح میں اسکندر اعظم نے اس علاقے کو فتح کرلیا اور اس طرح مغربی دنیا اور چین و روس کی قدیم ثقافتوں کا مقام اتصال بن گیا ۔ آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں عرب کے مسلمانوں نے اس پر قبضہ جما لیا اور اس طرح تمدن عرب کا ایک اہم مرکز بن کر اموی اور عباسی سلطنتوں کا جزو بن گیا ۔ یہاں کے فن تعمیر میں اموی خلیفہٴ ولید بن عبدالملک نے خاص دلچسپی لی اور جو کام ان سے ادھورے رہ گئے ، انھیں عمر بن عبدالعزیز نے پورا کردیا ۔ انھوں نے والئی سمرقند کو یہ بھی حکم دیا کہ تمام اہم سڑکوں کے ساتھ ساتھ مسافر خانے بنوائیں ، مسافروں کو کھانا مہیا کریں اور جو بیمار ہوں ، ان کی دیکھ بھال کریں ۔ رفاہ عامہ کا یہ انداز عرصہٴ دراز تک چلتا رہا ۔

اسی دوران میں یعنی ۷۵۱ء میں چین کی سرحد سے باہر کاغذ کا پہلا کارخانہ قائم ہوا کیونکہ اس صنعت کے وسائل سمرقند اور اس کے آس پاس موجود تھے ۔ اسی شہر میں حضرت امام بخاری کا مقبرہ موجود ہے جو مسلمانوں کی عظیم زیارت گھوں میں شمار ہوتا ہے ۔ ان کا وصال ۸۷۰ء میں ہوا تھا ۔ امام بخاری کا پورا نام ابو عبداللہ محمد بن اسمعیل تھا ۔ انھوں نے سولہ سال ھی کی عمر میں عرب کی سیاحت کی اور علم الحدیث کی تعلیم پائی ۔ بعد میں مصر کے اسلامی مدارس میں تکمیل علم کرتے رہے ۔ جب بخارا واپس آئے تو چھ لاکھ احادیث اپنے ساتھ لائے ۔ ان میں سے صرف سات ھزار دوسو پچھتر احادیث ان کے نزدیک معتبر تھیں ۔ انھی کو انھوں نے ''صحیح'' کے نام سے جمع کردیا جسے

اب ''صحیح بخاری،، کے نام سے شائع کیا جاتا ہے۔ آپ نے قران مجید کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ اسی عہد کے ایک اور سمرقندی عالم عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی تھے۔ ان کی سب سے زیادہ مشہور علمی کتاب ''مسند،، ہے۔ ان کا انتقال ۸۶۸ء میں ہوا۔

خراسان کے سامانی خاندان کے زیر نگین، جس کا دور ۸۷۴ء سے ۹۹۹ء تک رہا، سمرقند کی شان و شوکت برابر بڑھتی رہی۔ اسی طرح سلجوقیوں اور خوارزم شاہی فرمانرواؤں کے عہد میں اس کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی۔ جب سلطان سنجر سلجوقی خراسان کا فرمانروا تھا تو اس کے حکم سے بہرام شاہ غزنوی سمرقند کا حاکم مقرر ہوا تھا لیکن اس نے بے وفائی کی اور شورش برپا کر کے سمرقند اور آس پاس کے علاقوں کو بلا شرکت غیرے ہتھیا لینا اور خود مختار بن جانا چاہا۔ لیکن سلطان سنجر نے فوج کشی کر کے شہر کا محاصرہ کرلیا اور فتح پا کر وہاں کی حکومت احمد کے بیٹے نصر کے سپرد کردی۔ احمد بن سلیمان ماورا النہر کے علاقے کا فرمانروا تھا۔ اس موقع پر بھی خاصی تباہی ہوئی تھی۔ مشہور شاعر انوری نے ''اشک ہائے خراسان،، کے عنوان سے ایک مرثیہ لکھا جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں:

بر سمرقند اگر بگذری اے باد سحر
نامۂ اہل خراسان بر در سلطان بر
نامۂ مطلع او رنج تن و آفت جان
نامۂ مقطع او درد دل و سوز جگر

ستم بلائے ستم یہ تھا کہ ۱۲۲۰ء میں چنگیز خاں کا حملہ ہوا جس نے شہر کو یکسر تباہ و برباد کردیا۔ یہ تباہی تو قسمت

میں لکھی تھی۔ البتہ شیبانی خاں کے جانشین عبیداللہ نے اپنے قبیلے کے لوگ جمع کرنے شروع کئے اور ایک بڑا لشکر تیار کرلیا۔ لیکن اس دوران میں شاہ اسمعیل اور بابر میں اتحاد ہوگیا تھا کیونکہ ازبکوں کی شکست کے بعد جو قیدی لائے گئے، ان میں ظہیر الدین بابر کی ہمشیرہ بھی شامل تھی، جسے اسمعیل نے بڑے احترام کے ساتھ واپس کردیا تھا۔ یہ گویا شاہ اسمعیل اور بابر کے اتحاد کا پہلا قدم تھا۔ لیکن شیبانی نے جلد وفات پالی۔ بابر نے اس کی موت سے فائدہ اٹھا کر ماوراالنہر پر حملہ کیا اور باقی ماندہ ازبک خاندانوں کو شکست دیدی اور سارا علاقہ اپنے مخالفوں سے پاک کردیا۔ پھر وہ سمرقند میں داخل ہوا جہاں سے اسے شیبانی خاں نے نکالا تھا۔

اس زمانے کے مشہور جغرافیہ داں یاقوت بن عبداللہ رومی نے، جو مشرقی روم میں پیدا ہوا لیکن دراصل یونانی النسل تھا، اور اپنا بیشتر وقت وسط ایشیا کی سیاحت میں گزار چکا تھا، سمرقند و بخارا کی تباہی کا حال سنا اور بہ چشم خود مشاہدہ کیا، تو موصل چلا گیا۔ اور تصنیف و تالیف میں مصروف ہوگیا۔ سمرقند کی تباہی کا حال اس نے ''معجم البلدان،، میں تحریر کیا ہے جسے مستند مانا جاتا ہے۔ ۱۲۲۸ء میں اس کا انتقال ہوا تھا۔

تباہی سے قبل اس شہر کی حفاظت کے لئے کئی ہزار سپاہی متعین تھے۔ انہوں نے کچھ عرصے تو مدافعت کی تھی لیکن مقابلہ بڑا سخت تھا، کیونکہ چنگیز خاں کے فوجی تعداد میں زیادہ اور فن حرب سے بخوبی واقف تھے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ تمام امراء اور اہل لشکر قتل کردئیے گئے اور شہر پر

پوری طرح تسلط حاصل کرلیا گیا تھا۔ چنگیز خاں کے حملے اور مقامات پر بھی عارضی طور پر کامیاب رہے تھے۔

اس کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں تیمور لنگ نے ایک بار پھر اس سر زمین کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور اسے اپنی سلطنت کا صدر مقام بنا کر سابقہ شان و شوکت عطا کردی۔ لیکن اس کے جانشینوں کے عہد میں اس کی رونق کو گھن لگ گیا۔ پندرھویں صدی میں پھر نقشہ بدلنا شروع ہوا اور ایک عرصے تک ازبک خاندان کے فرمانروا سریر آرائے سلطنت رہے۔ اس دوران میں وہ امارت بخارا کا ایک حصہ بن گیا۔

۱۵۱۰ء میں شاہ اسمعیل نے خراسان کی طرف پیش قدمی کی جہاں ازبک خاندان کا ایک نام لیوا شیبانی خاں سردار مملکت تھا اور چنگیز خان کے قریبی عزیزوں میں سے تھا۔ جب شاہ اسمعیل نے اطاعت قبول کرنے کا فرمان بھیجا تو اس نے نہایت ذلت آمیز جواب دیا۔ اس طرح آپس میں لڑائی چھڑ گئی۔ اس جنگ میں سترہ ہزار ایرانیوں نے اٹھائیس ہزار ازبکوں کو شکست فاش دی۔ جب شیبانی خاں کا سر کاٹ کر اسمعیل کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اس کی کھوپری پر سونے کا خول چڑھا کر شراب پینے کا پیالہ بنا دیا جائے۔ اس نے بلخ اور ہرات کو بھی مسخر کرلیا۔

پھر ۱۸۶۸ء میں جب بخارا کے امیر شاہان روس کے باجگزار ہوگئے تو سمرقند کے نام لیوا بھی بدل گئے۔ ۱۹۲۵ء میں اسے ازبک سوویت سوشلسٹ ری پبلک کا صدر مقام بنادیا گیا۔ لیکن پانچ ھی سال بعد تاشقند نے اس کی جگہ لے لی۔ اب سمرقند کا

پرانا علاقہ پورے شہر کا مشرقی حصہ ہے اور ریگستان کے نام سے موسوم ہونے والی مربع سرزمین کے وسط میں واقع ہے۔ یہاں کے بعض تاریخی مقبرے اور شاندار مسجدیں اب بھی زیارت گاہ عالم ہیں۔ ان میں خود تیمور لنگ کا مقبرہ اور اس کی شریک حیات بی بی خانم کے نام سے تعمیر ہونے والی مسجد قابل ذکر عمارات میں شامل ہیں۔ تیمور لنگ کے پوتے آلغ بیگ کی بنائی ہوئی رصدگاہ اب بھی ماہرین فلکیات کو آسمانوں اور ان کی سطح پر جگمگانے والے ستاروں کی سیر کراتی ہے۔ اپنے عہد عروج میں سمرقند نرم ریشم اور اس کے متضاد سخت فولاد کی صنعتوں کے لئے مشہور تھا۔ یہ خصوصیت اب بھی بڑی حد تک برقرار ہے۔ روئی اور گیہوں کی کاشت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ ازبکستان کی سرکاری یونیورسٹی کے علاوہ یہاں طب اور زراعت کے درسی ادارے بھی قائم ہیں۔ اس کا رقبہ تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار مربع میل ہے اور موجودہ آبادی بیس لاکھ سے زیادہ ہے۔

ہم سب بس میں بیٹھے شہر کی سیر کرتے رہے۔ ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہی۔ جب بس آلغ بیگ کی آبزرویٹری (رصدگاہ) پر پہنچی تو اترکر عمارت میں گئے تاکہ اس کا عجائب گھر (میوزیم) دیکھ لیں۔ بہت خوب چیز ہے۔ حقیقتاً اسے دیکھے بغیر وہاں کی بہت سی چیزوں کو سمجھنا دشوار تھا۔ میں ستمبر ۱۹۷۸ء میں استنبول گیا تھا۔ وہاں "آبزرویٹریز ان اسلام" اجلاس کا موضوع تھا۔ وہاں جتنے مقالے پڑھے گئے، ان میں آلغ بیگ کی رصدگاہ کا ضرور ذکر کیا گیا۔ اب اس ضمن میں میری معلومات بڑی پختہ ہوگئیں۔

رصد گاہیں

رصدگاہوں کی تاریخ کا مطالعہ ایک دلچسپ موضوع ہے۔ بنی نوع انسان نے تاریخ سے قبل بھی اپنے مشاہدات کو واقعات اور عقل کی کسوٹی پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے کائنات کی ہر چیز پر نظر ڈالی۔ ان میں تاروں بھرا آسمان بھی شامل رہا۔ چنانچہ ستارہ شناسی اس کا دلچسپ مشغلہ بن گیا۔ جب زمین کی نیچی سطح پر رہ کر ان کی حقیقت کو سمجھنے میں دشواری ہوئی تو بلند پہاڑوں پر اونچی اونچی رصدگاہیں قائم کیں تاکہ ستاروں، سیاروں اور چاند سورج کی رفتار اور ان کے طلوع و غروب کا صحیح اندازہ ہوسکے اور ان سے کوئی نتیجہ نکالا جاسکے۔

قدیم ترین رصدگاہوں کے آثار بابل و نینوا میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے بعد مصر کا نمبر آتا ہے جہاں عبادت گاہوں، ان کی برجیوں اور میناروں پر سیر افلاک کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تین سو سال قبل مسیح میں بطلیموس اول کی رصدگاہ اسکندریہ کے مقام پر تعمیر ہوئی تھی جس کے کھنڈر اس سر زمین کے قدیم ترین آثار میں شمار ہوتے ہیں۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے اس علم کو سب سے زیادہ عروج دیا اور اس کے ایسے اصول منضبط کئے جو آج تک تسلیم کئے جاتے ہیں۔ بغداد اور دمشق کی رصدگاہیں بے مثال تھیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں الغ بیگ نے اس منزل میں قدم رکھا اور مغربی دنیا کے لئے نظیر قائم کردی۔ چنانچہ یورپ کے علماء نے بھی ۱۴۷۲ء میں پہلی قابل ذکر رصدگاہ نیورمبرگ میں تعمیر کی۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔

۱۵۸۴ء تک رصد گاہوں کی تعداد خاصی زیادہ ہوگئی۔ استارنبرگ کی رصدگاہ، جو شاہی محل کی بلند ترین منزل پر تعمیر ہوئی تھی، عمدہ ساز و سامان سے لیس کی گئی تھی۔ اس وقت جو آلات استعمال کئے گئے ان سے زمین کے ساتھ ستاروں کے زاوئے ناپنا اور ان کی رفتار معین کرنا ممکن ہوگیا تھا۔ ایسے آلات وضع کرنے میں بھی مسلمان پیش پیش رہے۔ ان کا سب سے اہم آلہ، جو اصطرلاب کہلاتا تھا، آج بھی اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان آلات کی تشکیل اور رصدگاہوں کی تعمیر میں جدتیں ہوتی رہیں۔ سرکاری طور پر بھی ہر جگہ اس کی سرپرستی کی گئی۔ چنانچہ ڈنمارک کے ایک فرمانروا نے ۱۶۳۷ء میں جو رصدگاہ کوپن ہیگن میں بنوائی وہ سائنسی اعتبار سے بڑی مکمل کہی جاسکتی ہے۔ پھر پیرس میں ۱۶۶۷ء سے ۱۶۷۱ء تک کی مدت میں کئی رصدگاہیں بن گئیں۔ انگلستان کی شاہی رصدگاہ ۱۶۷۵ء میں بمقام گرین وچ تعمیر ہوئی جو اب تین سو سال بعد بھی کام کررہی ہے۔ دو سال ہوئے اس کا بڑا شاندار جشن منایا گیا تھا۔ دنیا بھر کے سائنسداں شریک ہوئے تھے۔ بعض سائنسدانوں کی انفرادی کوششوں سے بھی چند رصدگاہیں تعمیر ہوئیں۔ ان میں سے سر ولیم ہرشل کی رصدگاہ سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ وہ سب سے بڑا ماہر فلکیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ پھر ٹیلسکوپ کی ایجاد نے بہت سے پردے جو آسمان اور زمین کے درمیان پڑے ہوئے تھے، دور کردئے اور اس طرح بہت سے اسرار و رموز منکشف ہوگئے۔

دوسری طرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس وقت

تین سو سے زیادہ ایسی رصدگاہیں موجود ہیں جن سے کئے جانے والے مشاہدات کی تشہیر روزانہ کی جاتی ہے۔ اس ملک کی ہر ریاست میں یونیورسٹی کی رصدگاہ الگ ہے کیونکہ علم فلکیات کی عملی تعلیم اس کے بغیر ممکن نہیں سمجھی گئی۔ وہاں یہ سلسلہ ۱۸۳۹ء میں شروع ہوا اور ۱۹۴۶ء تک پائے تکمیل کو پہنچ گیا۔ ان تاریخی حقائق کی روشنی میں ہم نے آلغ بیگ کی رصدگاہ اور اس سے متعلق عجائب گھر کو بہ نظر عمیق دیکھا اور حسن انتظام کی تعریف کی۔ میں نے آلغ بیگ کے بارے میں بھی مطالعہ کیا۔

آلغ بیگ

امیر تیمور کے چار بیٹے تھے: غیاث الدین جہانگیر، عمر شیخ، جلال الدین میران شاہ اور شاہ رخ۔ آخرالذکر کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے آلغ بیگ اور علاء الدولہ کے سوا باقی سب باپ کی زندگی میں اور کم عمری میں وفات پاگئے تھے۔ آلغ بیگ، جس کا سن پیدائش ۱۳۹۴ء تھا، اپنے باپ ہی کے عہد میں ترکستان کا حکمران بنا دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی توجہ امور سلطنت کی طرف برائے نام اور زیادہ تر ترویج علوم کی جانب مبذول رہی۔ اسی ضمن میں اس نے اپنی رصدگاہ ۱۴۲۱ء میں تعمیر کرائی تھی جو "زیج جدید سلطانی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ بطلیموس کے بعد یہ پہلا ستارہ شناس تھا جس نے اجرام فلکی کی ایک مکمل فہرست تیار کی تھی اور جس نے مصر کے بطلیموس کی فہرست کو ناقص اور نامکمل ثابت کر دیا۔ اصل فارسی سے اس کا ترجمہ دس سال بعد عربی زبان میں ہوا اور پھر

سترھویں صدی عیسوی میں اس کا لاطینی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ انگلستان سے شائع ھوا۔

اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے اُلغ بیگ دور اور نزدیک کافی مشہور ھوا لیکن بہ حیثیت حکمراں بد نصیب تھا۔ خاندانی تنازعات بھی اکثر اس کے لئے سوھان روح بنے رھے۔ اس نے اپنے بیٹے عبداللطیف کو ھرات کا حکمراں مقرر کر دیا تھا۔ کچھ ھی عرصے بعد اس نے اپنے ایک دوست عباس کو آلۂ کار بنا کر باپ کو ۸۵۳ھ مطابق ۱۴۴۹ء میں قتل کرا دیا۔ چنانچہ اس کی تاریخ وفات ایک شاعر نے ''عباس کشت،، (۸۵۳ء) سے نکالی تھی۔ اس کا تار حیات بیٹے کے ھاتھوں ٹوٹ گیا لیکن رصدگاہ کے آلات جو اس نے نصب کرائے تھے، ستارہ شناسی اور فلک پیمائی میں عرصۂ دراز تک مدد دیتے رھے۔ اور رصدگاہ کا میوزیم تو آج بھی علمائے فلک کے لئے دلچسپی کا مرکز ھے۔

معلوم ھوا کہ روسی ماھر آثاریات روتکن کی قبر اسی میوزیم میں ھے۔ اس نے سطح زمین پر نظر آنے والے بعض آثار دیکھکر اُلغ بیگ کی رصدگاہ کا پتہ چلایا اور زمین کھود کر اور ملبہ صاف کرکے اسے برآمد کرلیا۔ اب حکومت روس نے اس رصدگاہ کو بحال کرکے برآمد ھونی والی دوسری اشیاء پر مشتمل میوزیم قائم کردیا ھے۔ میں کوشش کررھا ھوں کہ اس رصدگاہ اور میوزیم کا ایک عمدہ البم حاصل ھوجائے جسکی تصاویر اپنی کتاب میں شامل کرسکوں۔

مدرسۂ اُلغ بیگ

جس علاقے میں یہ مدرسہ واقع ھے، اس کا نام ریگستان

ھے۔ اس مدرسے پر جب ہم آئے تو بارش تھم چکی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ اس عظیم و سنگین عمارت کے نقش و نگار ذرا دھل گئے ھیں۔ کہا جاتا ھے کہ زار روس کے دور میں اس عمارت اور تمام دوسری ایسی عمارتوں سے دانستہ بے توجہی برتی گئی تھی اور اب سوویت حکومت نے ان تاریخی آثار قدیمہ کے تحفظ کا سامان کیا ھے۔ گزشتہ بیس سال سے ان عمارات کو ان کی پرانی حالت پر لانے کا کام ھورھا ھے۔ آدھے سے زیادہ کام ھوچکا ھے۔ ھر عمارت پر تعمیر کا کام جاری ھے۔ اگر ان عمارات کو بحال کردیا گیا تو یہ زبردست اھمیت کے تاریخی آثار شمار ھونگے۔ اس باب میں سوویت حکومت کی دلچسپی کے مختلف وجوہ ھوسکتے ھیں اور ھر آدمی اپنے نقطہ فکر سے توجیہہ کرسکتا ھے۔ لیکن میری رائے یہ ھے کہ سوویت حکومت ان تاریخی آثار کو، جن کا قطعی طور پر مسلمانوں سے تعلق ھے، مٹانے کے حق میں نہیں ھے۔ میں اس کو تاریخ سے دلچسپی کہہ سکتا ھوں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ھے کہ چوں کہ حکومت روس کو مسلمانوں سے کہ جو تمام دنیا میں پھیلے ھوئے ھیں، روابط قائم کرنے ھیں، اس لئے روس میں ایسے آثار کا تحفظ اس کی سیاسی ضرورت کو پورا کرتا ھے۔ دلیل یہ دی جاسکتی ھے کہ ایک وقت یہ تھا کہ برطانوی سامراج نے ایران میں اپنا مرکز قائم کیا تھا اور ایران سے ان مسلم ریاستوں میں پروپیگنڈے کا لٹریچر آیا کرتا تھا کہ جو روسی انقلاب اکتوبر کی نفی کے مترادف ھوتا تھا۔ یہی وجہ ھے کہ حکومت روس نے ان مسلم ریاستوں کا رسم الخط بدل دینے کا فیصلہ کیا تاکہ فارسی زبان کو کہ جو ایران کی سرکاری زبان

تھی ، لکھی اور پڑھی نہ جاسکے ۔ لیکن یہ دور اب ختم ہوچکا ہے اور روس کو ساری دنیا کے مسلمانوں سے روابط قائم کرنے ہیں ۔ لہذا اب تاجیکی زبان کا تحفظ اور رسم الخط فارسی کا احیاء ہوا چاہتا ہے ۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ روس میں یہ مسلم ریاستیں ہی ہیں کہ جو تاریخی آثار کی حامل ہیں اور دنیا بھر سے سیلانیوں کو لانے کے لئے ایسے آثار کا وجود ٹورزم کے لئے لازمی ہے ؛ جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ رائے اپنے انداز پر ہوسکتی ہے مگر میری ذاتی رائے یہی ہے کہ حکومت روس بنیادی طور پر تاریخی تحفظات کی حامی ہے اور یہ کام اسی بنا پر ہورہا ہے ۔ آخر آلغ بیگ کی رصدگاہ زیر خاک تھی ۔ سوویت حکومت کے دور میں اس کی کھدائی کرکے نکالا گیا اور اس کو بحال کردیا گیا ۔ اس کی زبردست تاریخی اہمیت ہے ۔ رصدگاہ کا خیال یہاں سے آگے بڑھا ہے ۔ عمر خیام بھی تو یہاں ہی آکر درس لے گیا تھا اور پھر اس نے محیرالعقول کام انجام دئے تھے ۔

مدرسۂ آلغ بیگ کی وسعت و اہمیت بہت ہے ۔ یہاں لائٹ اینڈ ساؤنڈ پروگرام کا بھی اہتمام ہے ۔ اگر بارش نہ ہوتی تو یہ پروگرام ہم شاید آج دیکھتے اور سنتے ۔ لیکن بارش نے اسے ختم کردیا ۔

فاختائیں

سمرقند میں فاختائیں بکثرت ہیں ۔ ان کا سائز اور رنگ وہی ہے کہ جو ہمارے ہاں دھلی میں ہوا کرتا تھا ۔ ہمارے پاکستان میں تو فاختائیں شاید نہیں ہوتیں، کم سے کم سندھ میں تو نہیں ہوتیں ۔ سمرقند میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ۔ آج

صبح میں بیدار ھوا تو سب سے پہلی آواز جو کان میں آئی ، وہ فاختہ کی تھی ۔ گو گزشتہ تیس سال سے میں نے یہ آواز نہیں سنی ھے ، تاھم دھلی میں تو یہ آواز سنتا ھی تھا اور کان اس سے مانوس ھیں، اس لئے پہچاننے میں دقت نہیں ھوئی ۔ ان دنوں یہ تنکے جمع کررھی ھیں ۔ اپنی آبادی میں اضافہ کرنے کے لئے انھیں گھر بنانے کی ضرورت ھے ۔ اگرچہ کبوتر سے ان کا نسلی رشتہ ھے لیکن کبوتر کی طرح ان کو پالنے کا دستور نہیں ھے ۔ کبوتر اڑانا ایک دلچسپ مشغلہ ھے لیکن فاختہ اڑانا محاورے میں اور ھی معنی و مفہوم دیتا ھے ۔

آثار قدیمہ کا پروگرام

صبح دس بجے سے دو بجے تک کا پروگرام آثار قدیمہ دیکھنے کا تھا ۔ سب سے پہلے ھم سب مسجد خواجہ احرار گئے ۔ اس سے ملحق مدرسۂ نادر دیوان بیگ بھی ھے ۔ بہت بڑی جگہ ھے ۔ اندر مسجد میں ایک بزرگ اوراد و وظائف میں مشغول تھے ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ رسولی صاحب معلوم کرنے گئے ۔ خیال تھا کہ وہ تلاوت کلام پاک کر رھے ھونگے ۔ مگر ایسا نہ تھا ۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس مسجد میں قران مجید کا کوئی نسخہ ھے؟ انھوں نے نہیں میں جواب دیا ۔ پھر پوچھا گیا : کیا آپ کے گھر پر ھے؟ جواب ھاں میں تھا ۔ کہا جاتا ھے کہ ایسے عقیدت مندوں کو پڑھنے کے لئے قران مجید میسر نہیں ھیں ۔ یہ لوگ بڑے خوش ھوتے ھیں کہ جب کوئی ان کو خاموشی کے ساتھ ھدیۂ قران کرتا ھے ۔ مگر ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب نے مجھے یہ بتایا کہ اب خود حکومت روس قاھرہ میں قران پاک

چھپواتی اور وہاں سے منگوا کر تقسیم کرتی ھے۔ مجھے اندازہ نہیں ھے کہ انعام اللہ خاں صاحب کو یہ اطلاع کہاں سے ملی ھے یا ان کا ذریعہٗ معلومات اس ضمن میں کیا ھے۔ بہر نوع سمرقند کی اس مسجد میں قران پاک کا کوئی نسخہ موجود نہیں تھا۔

جمعہ کی وجہ سے اس مسجد میں نماز جمعہ کی ادائی کے انتظامات ھو رہے تھے۔ صفیں جو بچھ رہی تھیں، وہ عام کپڑے کی تھیں کہ جو جگہ جگہ سے پھٹا ھوا اور تار تار تھا۔ اندر کے حصے میں قالین بھی تھے۔ اندازہ ھوا کہ یہ ایک ھزار سے کم نمازیوں کا انتظام نہیں تھا۔ میں نے دو رکعت نفل تو اس مسجد خواجہ احرار میں ادا کرلئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ھوا کہ اس مسجد میں لاؤڈ اسپیکر کا انتظام بھی نہیں تھا۔ یہ واضح تھا کہ اس مسجد سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ نجی طور پر ان مساجد کا انتظام جو لوگ کرتے ھیں، ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ وہ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام کرسکیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سرکاری طور پر اسکی اجازت نہ ملی ھو۔

مسجدوں اور مقبروں کے ضمن میں بہت سی قدیم عمارتیں قابل ذکر اور لائق دید ھیں۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر بوسیدہ ھو کر کھنڈر کی صورت اختیار کرچکی ھیں۔ پھر بھی ان کی آرائش و زیبائش اور طرز تعمیر سے اندازہ ھوتا ھے کہ کسی زمانے میں وہ بڑی ھی عالی شان اور دیدہ زیب ھونگی۔ چنانچہ ''کھنڈرات بتا رہے ھیں عمارت عظیم تھی،، والا مصرع ان میں سے اکثر پر بالکل چسپاں ھوسکتا تھا۔ ھر عمارت کی دیواروں پر، سقف و بام پر اور کہیں کہیں فرش پر روغنی مٹی کے ٹائل باقی رہ گئے ھیں۔ اور بعض جگہ

ٹائل کے بجائے اسی انداز میں نیلے اور سنہرے رنگ میں نقاشی کی گئی ہے اور چونے پر سنبت کاری جیسا انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔

ان میں سے شاہ زندہ کا مقبرہ خاصی اچھی حالت میں ہے، حالانکہ وہ آج سے نو سو سال قبل تعمیر ہوا تھا۔ بی بی خانم کی مسجد اور گر امیر کا مقبرہ بھی قدیم عمارات کے ضمن میں شمار ہوتے ہیں۔ بعض دیواریں بالکل منہدم ہوچکی ہیں۔ تاہم مقامی اور وفاقی حکومتیں ان کو نئی زندگی دینے کے منصوبے بنا چکی ہیں اور تیزی سے ان پر کام ہورہا ہے۔ مزار تیمور لنگ بھی اسی ضمن میں قابل ذکر ہے۔ سمرقند بلکہ تاجیکستان کے باشندے اسے مقبرۂ تیمور نہیں، صرف "امیر تیمور" کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ فرمانروا مر کر بھی ایک شاندار عمارت کی شکل میں زندہ ہے۔ وہ اپنے امیر کا بڑا احترام کرتے ہیں اور لفظ "لنگ" اس کے نام کے ساتھ کبھی استعمال نہیں کرتے۔

تیمور ۱۳۳۶ء میں ماوراالنہر کے شہر کیش میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے باپ کا نام ترغائی اور دادا کا نام الغائی تھا۔ مورخین اس کا سلسلۂ نسب قراچار خاں سے ملاتے ہیں جو چغتائی کا وزیر تھا۔ تیمور کو روز اول سے شکار کا شوق تھا اور جوانی میں ایک جنگ جو سپاہی ہونے کی وجہ سے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ طبیعت کا یہ رجحان مرتے دم تک قائم رہا۔ اس کے محاربات کا ذکر بڑا طویل ہے۔ مختصراً یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ چنگیز خان، ہلاکو اور تیمور میں سے کس نے سب سے زیادہ انسانی جانیں ضائع کیں۔ ان میں سے صرف تیمور مسلمان تھا

لیکن اس کی خوں ریزیوں کی داستان مسلمانوں کے لئے کلنک کا ٹیکہ تھا ۔ اس نے ایک ھی حملے میں کئی کئی ہزار انسان ته تیغ کردئے ۔ اور ایک بار تو اس کی ستم رانی انتہا کو پہنچ گئی کہ جب اس نے تیس ہزار انسانوں کو ہلاک کرکے ان کے سر کٹوائے اور انہیں کسی طرح جوڑ کر ایک مینار تعمیر کیا جو قدرتی طور پر زیادہ عرصے برقرار تو نہ رہ سکا لیکن انسانیت کے ماتھے پر ہمیشہ کے لئے ایک بدنما داغ لگا گیا ۔

اکثر مورخین تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ھیں کہ چنگیز کی ہلاکت پسندی اس کے لئے باعث مسرت ہوتی تھی اور وہ لاشوں کے ڈھیر پر جشن منایا کرتا تھا ۔ تیمور اس کا ھم مشرب نہیں تھا ۔ لیکن انسانی کھوپڑیوں کا تعمیر کرنا اس کی اذیت پسند طبیعت کا مظہر نہیں تو کیا ھے ۔ صرف ایک بات اس کی بریت میں کہی جاسکتی ھے ۔ وہ یہ کہ اس کے اکثر حوارین دغا باز تھے، وہ چھپے رستم ثابت ہوتے تھے اور وہ جھلا کر ان سے بدلہ لینے کا فیصلہ کرتا اور جب اپنی اس مہم پر قدم بڑھاتا تو ظالم و مظلوم میں کوئی امتیاز نہیں کرتا تھا ۔ ممکن ھے کہ اس کے کردار کی کوئی نیکی نکتہ نواز رب العزت کو پسند آگئی ہو جو اس کا نام آج تک احترام سے لیا جاتا ھے ۔ اور مغل خاندان کے اکثر افراد اپنے نام کے ساتھ "تیموری،، کا لاحقہ اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ھیں ۔ واللہ عالم بالصواب ۔ میں نے بہر حال مزار تیمور پر فاتحہ پڑھیں اور اس کی مغفرت کے لئے دعائیں کیں ۔

امام بخاری کے مزار مبارک پر

تمام مساجد اور مقابر کی زیارت کے بعد اب ہماری منزل

حضرت امام بخاری کے مزار مبارک پر حاضری دینا اور فاتحہ پڑھنا تھا۔ اسلام کے ان جلیل القدر محدث کے بارے میں اپنے خیالات پہلے ہی ظاہر کرچکا ہوں۔ ان کے روضے پر فاتحہ پڑھ کر دل و دماغ کو جو سکون حاصل ہوا ، وہ دائرۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے۔ وہاں اور بھی بہت سے عقیدت مند زانوئے ادب طے کئے اوراد و وظائف میں مصروف تھے۔ اگر نماز جمعہ کا وقت زیادہ قریب نہ ہوتا تو شاید میں بھی زیادہ وقت گزار کر مزید تسکین حاصل کرتا۔ اس وقت جناب فیض احمد فیض صاحب اور جناب علی سردار جعفری صاحب شریک سعادت نہیں تھے۔ ان دونوں کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ خرابیٔ مزاج نے ان کو آرام کرنے پر مجبور کردیا تھا اور پھر ان کو آج ہی شام ماسکو جانا تھا۔ یہ سفر بڑا کٹھن تھا۔ دونوں بیگمات یعنی بیگم سلطانہ جعفری اور محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ البتہ ساتھ تھیں مگر ذرا کنارہ کش تھیں۔ ہر انسان کا نقطۂ نظر مختلف ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ غیر ملکی مندوبین اور ہمارے ساتھ متعین کئے ہوئے مترجمین بھی ساتھ تھے۔ غیر ملکیوں میں چیکوسلوا کیہ ، پولینڈ ، افغانستان اور برلن کے نمائندے نمایاں تھے۔ مس مارگریٹا پاؤلانا ، مس تانیا اور ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف بھی موجود تھے جن کا ذکر بارہا آچکا ہے۔

سمرقند شہر سے حضرت امام بخاری کے مزار تک بذریعہ بس کوئی پون گھنٹے کا راستہ ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو پون بجا تھا۔ اسی سے ملحق مسجد تھی۔ وہاں سب سے پہلے امام مسجد و متولی مولانا عثمان جان صاحب محترم سے ملاقات ہوئی اور

تعارف کرایا گیا۔ غالباً ان کو ہماری آمد کی اطلاع پہلے سے ہوچکی تھی۔ انہوں نے ہمارا پرجوش استقبال کیا اور وہی ہمیں مزار اقدس پر لے گئے۔ میں تو صبح سے اس وقت تک مزارات پر فاتحہ ہی پڑھتا رہا تھا۔ جو قبر دیکھتا، فاتحہ پڑھنا شروع کردیتا تھا۔ اس لئے کہ ان میں سے بہت سے مزاروں پر اب فاتحہ کون پڑھتا ہوگا۔ تیمور لنگ اپنے پیر کے قدموں میں آسودہ تھے۔ اگر ان مزارات پر مسلمان ہی فاتحہ خوانی نہیں کرینگے تو اور کون کریگا۔ میں جب بھی فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اٹھاتا، لوگ مجھے تعجب سے دیکھتے تھے اور میں حیرت زدہ رہ جاتا تھا کہ آخر میرے سوا دوسروں کو اپنا مستقبل کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر انسان فانی ہے اور ہر ایک کو کسی نہ کسی قبر میں دفن ہونا ہے۔

کوئی تین سال ہوئے حضرت امام بخاری کا گیارہ سو سالہ جشن ولادت منایا گیا تھا۔ ہندستان اور پاکستان سے علماء شریک ہوئے تھے۔ دوسرے اسلامی ملکوں کے وفود بھی آئے تھے۔ پاکستان سے آنے والے علماء میں قاری زاہر قاسمی صاحب تک شامل تھے۔ اس قسم کی مجالس و محافل اور اجتماعات کا روس میں اہتمام ایک فال نیک سمجھا جاتا ہے، خواہ اس کی غرض و غایت محل نظر ہی کیوں نہ ہو۔ بہ ایں ہمہ اس اہتمام کو سراہنے میں ہر شخص کو فراخ دل ہونا چاہیئے اور وسیع القلب۔

میں پورے احترام سے اور پورے اکرام سے اس مقام پر کھڑا ہوگیا کہ جہاں دنیا کے سب سے بڑے محدث کو زیر زمیں

اتارا گیا تھا اور پھر ان کی روح مبارک کو جنت الفردوس میں مقام اعلا عطا ہوا تھا۔ میں نے تلاوت قرآن پاک کی، فاتحہ خوانی کی، دست دعا دراز کیا اور ان کی خدمت میں اپنے قرآن کا وہ ہدیہ پیش کردیا کہ جس کی میں نے تلاوت کی تھی۔ میں اس روح پرفتوح کی خدمت اقدس میں یہی نذرانہ پیش کرسکتا تھا۔

میں محویت کے عالم میں غرق عقیدت تھا کہ ایک بڑی ناگوار آواز، جو ایک خاتون کی تھی، کانوں میں گونجی:

"چلو، بھئی چلو، ان مسجدوں اور مقبروں نے تو ہمیں بور کردیا ہے"۔

یہ ہندستان سے آئی ہوئی ایک خاتون کی آواز تھی۔ اس آواز نے مجھے جیسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

نماز جمعہ کی جماعت اب تیار تھی۔ امام عثمان جان صاحب کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ اندر چلوں۔ میں چاھتا تھا کہ یہ امتیازی سلوک نہ ہو اور مجھے جہاں بھی جگہ ملے، میں بارگاہ ایزدی میں سر بسجود ہوجاؤں۔ مگر حضرت امام صاحب کا اصرار بڑھ گیا اور میں بسم اللہ کرکے ان کے ساتھ مسجد کے اندر داخل ہوگیا۔

حلقۂ مشائخ میں

اندر منبر کے قریب کوئی دس بارہ بزرگوں کا حلقہ تھا۔ اوراد و وظائف نہایت خشوع و خضوع سے جاری تھے۔ میں اس حلقے میں بٹھا دیا گیا۔ بڑے نورانی چہرے تھے۔ صاف ستھرے لوگ، روئی کے کوٹ۔ بڑی پیاری داڑھیاں، آنکھوں میں نور، دل میں سرور۔ میں نے اس حلقۂ مشائخ میں خود کو زیادہ

اجنبی محسوس نہیں کیا۔

امام صاحب نے منبر پر کھڑے ہوکر میرا تعارف کرایا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں جو ایک مملکت اسلام ہے ، وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر ان کا اصرار ہوا کہ میں حاضرین سے خطاب کروں۔ میں نے عذر کیا مگر یہ عذر نہ سنا گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی اور منبر پر جا کھڑا ہوا اور خطبے کے انداز میں خطاب شروع کیا۔ میری زبان فارسی تھی کیونکہ امام عثمان جان صاحب فارسی بھی جانتے تھے۔ وہ دوسروں کے لئے ازبکی زبان میں ترجمہ کرتے رہے۔ ایک بات میں نے محسوس کی کہ جب میں نے " السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ "، کہا تو جواب کسی نے نہ دیا۔ مگر میری یہ حیرت اس وقت دور ہوگئی کہ جب خود امام صاحب نے خطبۂ مسنونہ شروع کرنے سے قبل " السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ "، کہا اور کسی نے جواب میں " وعلیکم السلام "، نہ کہا۔

میں نے کوئی بارہ تیرہ منٹ خطاب کیا۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ میں نے سامعین پر کیا اثرات چھوڑے۔ البتہ حلقۂ مشائخ نے مجھے اپنے درمیان اب زیادہ محبت اور احترام سے بٹھایا۔ اس سے مجھے اطمینان ہوگیا کہ میری تقریر کا اثر اچھا ہوا ہے۔

ایک بات دوران خطابت میں نے بڑی شدت و حیرت سے دیکھی کہ نمازیوں میں ایک بھی جوان عمر نہیں۔ سب کے سب معمر لوگ تھے۔ ان میں ایک بھی نمازی بے داڑھی کا نہیں تھا۔ صرف میں اور امام عثمان جان بے داڑھی تھے۔ سوال یہ تھا کہ نوجوان ازبکی مسلمان کہاں تھے؟

نماز جنازہ میں شرکت

نماز ختم ہوئی۔ سنتیں ادا کیں۔ امام صاحب نے آخر میں دعا کی۔ ازبکی زبان کسقدر فارسی آمیز تھی۔ غور کیا جائے تو کچھ نہ کچھ سمجھ میں آہی جاتا ہے۔ اس فریضے سے فارغ ہوکر باہر آیا۔ نمازیوں کی اکثریت مجھ سے مصافحہ کرنا چاہتی تھی۔ میں نے حتی الامکان جو بھی آتا رہا، اس سے ہاتھ ملانے کی مسرت حاصل کی اور انہیں بھی مطمئن کردیا۔ امام صاحب نے پتایا کہ جنازہ حاضر ہے۔

باہر آکر میں نے دیکھا کہ چٹائی میں لپٹا ہوا، لکڑیوں پر ٹکا ہوا، پھولوں سے لدا ہوا ایک جنازہ رکھا ہے۔ میں اگلی صف میں تھا۔ میں نے جنازے کے اوپر پھولوں کی ایک ریتھ دیکھی اور اس مرحوم کی تصویر بھی رکھی ہوئی دیکھی۔ امام صاحب نے اولاً ایک چھوٹی سی تقریر کی۔ میں نے اس کا مفہوم یہ سمجھا کہ وہ مرحوم یا مرحومہ کا تعارف تھا۔ اور اس کے لئے دعائے مغفرت کی گئی تھی۔ اس جنازے کے ساتھ سینکڑوں آدمی تھے۔ ان میں درجنوں سے زیادہ جوان بھی تھے کہ جو نماز جمعہ میں شریک نہ تھے۔ میں ان نوجوانوں کو حیرت سے دیکھتا ہا۔ ان کے دل میں ایمان اور خوف اللہی بس جنازے کی حد تک تھا۔

امام صاحب نے نماز جنازہ پڑھانے سے قبل ریتھ اور تصویر ہٹوا دی۔ اور پھر نماز جنازہ پڑھائی۔ اب میں فارغ ہوگیا۔ امام صاحب کا شدید اصرار تھا کہ ان کے ساتھ چائے پانی ہوجائے۔ وہ سب لوگوں کو مدعو کر رہے تھے۔ مگر ہم نے اتفاق رائے سے

ان سے معذرت چاہ لی ، اس لئے کہ تین بجے ہمارا دوسرا پروگرام تھا جس کو ہم خراب نہیں کرسکتے تھے۔

شرکاء میں سے نماز صرف میں نے پڑھی۔ خواتین بور ہوکر بس میں سوار ہوگئی تھیں۔ باقی لوگ شاپنگ کے موڈ میں تھے۔ استاد رسولی صاحب (افغانستان) نے ایک رگ بالآخر خرید ھی لیا۔ ۱۴۰ روبل کم رقم نہیں تھی۔ پاکستانی اعتبار سے کوئی دو ھزار رپے ہوئے۔ مجھے خوشی اس لئے زیادہ ہوئی کہ اس غریب علاقے کے دکاندار کو مدد مل گئی۔ کاش میں دوسرا رگ خرید سکتا جو تقریباً اسی قیمت کا تھا۔ لیکن میرے پاس زر مبادلہ کی قلت تھی ، اسلئے ممکن نہیں تھا۔ دکان کا مالک بڑی حسرت سے اپنے فروخت نہ ہونے والے رگ کو دیکھ رہا تھا۔ میرا دل پگھل گیا۔

نماز جمعہ از اول تا آخر ، نماز جنازہ اور اس کے مراحل ، ان سب کو مسز تانیا نے بغور دیکھا جو بطور مترجم ہمارے ساتھ تھیں۔ میں اپنے ساتھ ڈائری لایا تھا۔ وہی ہمدرد کی ڈائری جس میں " اربعین جامی ،، شامل ھیں — عربی ، انگریزی ، اردو اور فارسی تراجم کے ساتھ — ڈائری کی ایک کاپی میں نے جناب محترم علی سردار جعفری کی خدمت میں پیش کی تھی اور تانیا نے ان سے لے لی تھی۔ میں نے ایک اور پیش کردی تھی۔ یہ مسز تانیا مسجد میں از اول تا آخر موجود رہی تھیں۔ انہوں نے کہا :

" میں نے زندگی میں پہلی بار یہ منظر دیکھا ہے۔ میں از اول تا آخر یہاں رہی ہوں ، مگر یہ مشاہدہ نہ ہوسکا تھا۔ آج

آپ کے ساتھ آنے کی وجہ سے ہوگیا ،،۔

مجھے تانیا سے محبت ہوگئی ، وہ محبت کہ جو مجھے اپنی بیٹی سعدیہ سے ھے۔ میں نے نماز کے بارے میں تانیا کو کچھ بتایا۔ میرے خطبۂ جمعہ کے بارے میں ان کو اشتیاق تھا کہ میں نے کیا باتیں کیں۔ میں نے ان کو مطمئن کردیا۔

ہوٹل سمرقند واپس آئے تو ھمیں صرف آدھے گھنٹے کی تاخیر ہوگئی تھی۔ بارے میں نے اب بھی کچھ نہ کھانے کا فیصلہ کیا۔ سوچا کہ اب رات ھی کو کھاؤنگا۔ چوبیس گھنٹے معدے کو اور جگر کو آرام دینا چاھئے۔

جامعۂ سمرقند

چار بجے شام کو ھم جامعۂ سمرقند گئے۔ مجھے صبح ھی کو بتا دیا گیا تھا کہ مجھے آج طلبا سے خطاب کرنا ھے۔ ذھنی طور پر میں اس کے لئے تیار تھا۔ جامعۂ سمرقند کے دروازے پر اساتذہ کے ساتھ قائم مقام وائس چانسلر جناب شکوروف صاحب نے ھمارا پرجوش استقبال کیا۔ وہ اپنے دفتر لے گئے اور پھر جلد ھی سب کو جامعہ کے میٹنگ ھال میں لے جایا گیا۔ وھاں کوئی ایک ھزار طلبہ نے زبردست تالیوں سے ھمارا استقبال کیا۔ جناب شکوروف صاحب نے مختصر الفاظ میں جامعہ کا تعارف کرایا :

(۱) اس جامعہ کی ایک خصوصیت یہ ھے کہ استاد صدرالدین عینی نے اسمیں تعلیم دی ھے۔

(۲) اس وقت اس جامعہ میں دس ھزار طالب علم ھیں۔

(۳) اساتذہ کی تعداد تقریباً چار سو ہے ۔

(۴) بارہ فیکلٹیاں ہیں ۔

اس کے بعد جناب شیخ الجامعہ نے طلبہ سے ہمارا تعارف کرایا ۔ پہلے فیض احمد فیض صاحب کا اور پھر میرا اور ہمارے بعد دوسروں کا ۔ پھر انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ طلبہ سے کچھ باتیں کریں ۔ جناب فیض صاحب نے مختصر خطاب کر کے اپنی ایک نظم سنائی جس میں ٹیپ کا مصرع ہے "غم نہ کر، غم نہ کر"۔ مس ریٹا نے اس کا ترجمہ روسی زبان میں کردیا جو پہلے سے تیار تھا ۔ میں نے بھی خطاب کیا ۔ میرے خطاب کے چند نکات یہ ہیں :

(۱) زبان یار من فارسی و من فارسی خوب نمی دانم ۔

(۲) اس لئے میری آدھی تقریر فارسی میں ہوگی اور آدھی پاکستان کی قومی زبان اردو میں ۔

(۳) تا مرد سخن نگفتہ باشد ، عیب و ہنرش نہفتہ باشد
سعدی شیرازی نے یہ بڑے پتے کی بات کہی تھی ۔ اس کا بدیہی طور پر منشا یہ ہے کہ آدمی بلا ضرورت بات نہ کرے ۔

(۴) میں خطاب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر آپ کو دیکھ کر میں خود کو خاموش نہ رکھ سکا ۔ آپ سے چند باتیں کررہا ہوں ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا تعلق اپنے وطن پاکستان میں طلبہ سے زیادہ ہے ۔

(۵) میں طلبہ میں صحت کا پرچار کرتا ہوں ۔ اپنے

وطن میں سینکڑوں اسکولوں اور کالجوں میں جا کر طلبہ سے باتیں کرچکا ہوں یا تقریریں کرچکا ہوں۔

(۶) طلبہ سے میں دو باتیں خاص طور پر کہتا ہوں کہ تعمیر و ترقی کے لئے ہر قوم میں دو پہیے ہوتے ہیں :

(الف) صحت

(ب) تعلیم

جس طرح گاڑی دونوں پہیوں کے بغیر نہیں چل سکتی، تعمیر و ترقی بھی ان کے بغیر ممکن نہیں۔

(۷) مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی کہ جامعۂ سمرقند کے طلبہ ان دونوں باتوں کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ مجھے ان ہزار طلبہ میں بیمار کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ اور آپ کی تنظیم دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ آپ تعلیم کو ذوق و شوق کے ساتھ تعمیر وطن کے لئے حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

(۸) شرق اوسط کے مورخ ، فلسفی اور ماہر تعلیم علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں ایک اہم بات یہ بھی لکھی ہے کہ جو معاشرہ علم و عالم کی قدر کرتا ہے ، اس کی ترقی رک ہی نہیں سکتی۔ میں دیکھتا ہوں کہ روس میں علم و عالم کی قدردانی ہے۔ اس لئے یہ ملک ترقی کی راہوں

پر گام زن ہے۔

(۹) استاد صدرالدین عینی کا جشن صد سالہ جس انداز سے منایا گیا ہے، اس سے علم و عالم کی قدر و منزلت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ کے لئے یہ امر باعث فخر ہونا چاہئے کہ آپ کی جامعہ کے ایک استاد کو عالمی قدر دانی حاصل ہوئی ہے۔

(۱۰) استاد صدرالدین عینی کا ایک شعر آپ کو سناتا ہوں:

ما دوستیٔ خلق جہاں پیش گرفتیم
ازماست بران کس کہ چنیں رنگ بگیرد

عینی کا یہ پیغام عالمی اخوت اور عالمی محبت و دوستی کا آئینہ دار ہے۔ ہم دوستی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور اس لئے اپنے اپنے ملکوں سے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ درحقیقت اس دنیا میں بس ایک چیز اہم ہے — عالمی امن اور بھائی چارہ —

(۱۱) چونکہ میرا تعلق پاکستان میں طلبہ سے ہے، اس لئے ان کی جانب سے آپ کو پیغام محبت دیتا ہوں — سمرقند کے عظیم طلبہ و طالبات کے لئے پاکستان کے طلبہ و طالبات کا سلام۔

(۱۲) اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی جانب سے میں اپنے وطن پاکستان کے طلبہ کو پیغام دوستی و محبت پہنچادوں۔

کیا اجازت ہے؟

(۱۳) **پشا سن دوست لک !**

پشا سن دوست لک !

میرا اندازہ یہ ہے کہ میں نے اپنی نیم فارسی ، نیم اردو تقریر سے ان طلبہؑ سمرقند پر اچھے اثرات چھوڑے تھے - کیونکہ بہت سے طلبہ میرے آٹوگراف لینے آئے اور کسی سے نہیں - حتیٰ کہ آخر میں جناب وائس چانسلر شکوروف صاحب نے بھی "سمرقند"، نامی ایک کتاب پر میرے آٹوگراف لئے -

طلبہ نے مجھے ایک گل دستہ بڑی محبت سے پیش کیا - ایک پھول کی شاخ پر لکھا تھا :

OT Y3δUTαgϽK ϕU'αpα tE
III kypc y3bEKCKAπ TPYnnA
21/IV — 78 200

اس کا مطلب یہ ہے :

فیکلٹی ازبک اور تاجیک ڈپارٹمنٹ ، سمرقند یونیورسٹی کی طرف سے تین سال کی جماعت کے طلبہ کی طرف سے

۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء

روسی خبر رساں ایجنسی (شاید تاس) کا نمائندہ آیا تھا - انٹرویو برائے پاکستان لینے کا خواہاں تھا - میں نے ساڑھے چھ بجے کا وقت منظور کرلیا - اور میں ٹھیک ساڑھے چھ بجے آگیا مگر سات بجے تک وہ نہ آیا - میں اس سے زیادہ انتظار نہیں کرسکتا تھا -

میں اور ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف ٹھنڈی سڑک پر ٹہلنے

نکل گئے - یہ سڑک میکسم گورکی سڑک کے متوازی چلتی ہے - جامعہٗ سمرقند گورکی روڈ پر ہے - ٹھنڈی سڑک پر صرف آدمی چلتے ہیں - دونوں طرف ذرا ذرا سے فاصلوں پر درجنوں بنچیں پڑی ہیں - یہ سڑک انقلاب اکتوبر سے قبل ایک یہودی ابراہام نے بنوائی تھی - یہ سڑک استراحت گاہ ہے اور طلبہ جامعہٗ سمرقند اس سے استفادہ کرتے ہیں -

شہید ملت روڈ

ہاں ، مجھے یاد آگیا - کتنا میں نے اصرار کیا تھا کہ کراچی میں شہید ملت روڈ کو اتنا چوڑا نہ بناؤ - موجودہ دو سڑکوں کو ذرا چوڑا کر کے کام نکالو اور درمیان میں دو رویہ درخت لگادو ، بنچیں ڈال دو اور اس جگہ کو کراچی کا پھیپھڑا بنادو - مگر میری کسی نے نہ سنی -

آج یہ ابراہام روڈ دیکھ کر خیال آیا کہ اگر کراچی میں میری بات مان کر ایسی ہی ایک استراحت گاہ بنادی جاتی تو شہید ملت کی روح کو ہمیشہ تسکیں ملتی رہتی -

ٹھنڈی سڑک پر خاصی دیر گھومنے اور کچھ دیر بنچوں پر بیٹھنے کے بعد ہوٹل پہنچا - حسب معمول مختصر سا کھانا کھایا جس میں گوشت سے پرہیز کیا - پھر اپنے کمرے میں آکر مطالعہ میں مصروف ہوگیا - کراچی کے لئے چند ضروری خط اور عملے کے لئے ہدایات بھی لکھ دیں - پھر آرام سے سو گیا - اچھی نیند آگئی -

دوسرے روز صبح پانچ بجے بیدار ہوا - آج نماز فجر ادا کرنے کی بڑی زبردست خواہش پیدا ہوئی - میں ہمیشہ بالکل تیار

ہوکر، غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر ہی نماز ادا کرتا ہوں۔ مگر آج فیصلہ کیا کہ مجھے فوراً وضو کرکے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوجانا چاہئے، اور وقت ملے تو وظیفہ بھی پڑھ لیا جائے۔ لہذا میں بستر سے جلدی اٹھا۔ اب دیکھا تو غسل خانے میں پانی نہیں ہے۔ سوچا، کیا یہاں بھی کے ڈی اے کا سایہ پڑ گیا ہے، اور کیا یہ شہر بھی کراچی کی کوئی بستی بن گیا ہے۔ بڑا دکھ ہوا، سمجھ میں نہ آیا کہ اب کہاں جاؤں۔ زبان دانی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ فارسی سب سمجھ لیتے تھے اور یوں بھی میں نے پانچ چھ دن میں فراٹے سے فارسی بولنے کی مشق کرلی تھی۔ باہر نکلا تو آدم نہ آدم زاد، حتیٰ کہ وہ بڑی بی کہ جو ہماری ساتویں منزل پر اپنے تن و توش کے ساتھ نگرانی کے فرائض انجام دیتی تھیں، محو استراحت تھیں بالکل کراچی کے چوکیداروں کی طرح جو شروع رات میں یا اذان فجر ہونے کے بعد ''جاگتے رہو،، کی آواز لگاتے ہیں اور باقی وقت دوسروں کو سلاتے اور خود بھی سوتے رہتے ہیں۔ میرا دل نہیں چاہا کہ ان کے آرام میں خلل ڈال کر ان سے پانی کے بارے میں استفسار کروں۔ لیکن اس کا اہتمام کیسے کروں؟

بارے چند منٹوں کے بعد یہ مشکل حل ہوگئی۔ شاید موٹر چالو کردی گئی تھی۔ اوپر کی ٹنکی سے نلوں میں پانی آگیا۔ میں نے اس اثنا میں اپنا رخت سفر باندھ لیا۔ ہوٹل کا کمرہ اگر بارہ بجے خالی کردیا جائے تو میزبانوں کو صرف چار گھنٹے کے لئے پچاس فیصد کرایہ دینا ہوگا، ورنہ پورا دن محسوب ہوگا۔ لہذا میں نے بارہ بجے تک کمرہ خالی کردینے کا فیصلہ کرلیا۔

قبلہ اور قبلہ نما

قبلہ کی صحیح سمت کا اندازہ ذرا مشکل تھا ۔ پھر بھی وضو کر کے نماز فجر کے لئے بارگاہ ایزدی میں کھڑا ہوگیا ۔ ایسی صورت میں یہ حکم ہے اور ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ جدھر منہ کرلیا ، اللہ بس ادھر ہی ہے ۔ عبادت کی اصل روح تو استغراق عبودیت ہے ۔ اس سفر میں قبلہ نما اتفاق سے میرے ساتھ نہیں تھا جسے میں سامان سفر میں سب سے زیادہ ضرورت کی چیز سمجھتا رہا ہوں ۔ اس بار بے خیالی میں پن اور یو کلپ کے پیکٹ تک رہ گئے ۔ بڑے ہنگامی حالات کا سفر تھا ۔ لہذا کراچی سے روانگی کے دن صبح سے رات تک ذرا مہلت نہ ملی کہ سامان کو نک سے سک تک درست کرلوں جو ہمیشہ میری عادت رہی ہے ۔ اس رات ڈاکٹر محمد قمر صاحب اور ڈاکٹر جاوید صاحب (ماہرین امراض چشم) میرے گھر مدعو تھے ۔ ڈاکٹر جعفری صاحب بھی تھے ۔ پونے گیارہ بجے یہ حضرات گئے اور گیارہ بجے میں ہوائی میدان کے لئے روانہ ہوگیا تھا ۔

میں ایک گھنٹے تک بڑے اطمینان سے جانماز پر بیٹھا حمد و تسبیح کرتا رہا ۔ عمیق محویت کے باعث نماز کا ایسا لطف آیا کہ بیان سے باہر ہے ۔ فراغت پا کر جب اٹھا تو دل ایسا ہلکا ہوگیا تھا جیسے گلاب کا نو شگفتہ پھول ۔ دماغ تھا تازہ ، صاف اور آلائشوں سے پاک ۔ غسل وغیرہ کرکے میں اپنی میز پر جابیٹھا اور چند نوٹ لکھ لئے تاکہ انھیں اپنی سکریٹری کے نام کراچی بھیج سکوں ۔ ان میں زیادہ تر کام سے متعلق ہدایات تھیں ۔ ان کے علاوہ میں نے اس سفر میں جن لوگوں سے شخصی روابط قائم کئے تھے

یا جو اس جشن صد سالہ صدرالدین عینی کے منتظمین اور میرے میزبان تھے، ان سب کو تشکر و امتنان کے خطوط لکھ دئیے، جن کی تعداد ستائیس تھی۔ بعض انگریزی میں تھے اور بعض فارسی میں اور دو تین اپنی قومی زبان اردو میں۔ یہ کام سب سے اہم تھا، اور اس کے لئے مناسب وقت یہی تھا۔ صبح ہی صبح اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بعد انسانوں کا شکریہ ادا کرنے میں لطف آیا۔ دل کی گہرائیوں سے کلمہ ہائے تشکر و امتنان لکھے گئے۔

خطوط برائے اظہار تشکر

جن اشخاص کو خطوط لکھے گئے، ان میں رئیس جمہوریۂ تاجیکستان اور وزیر اعظم جمہوریۂ تاجیکستان اور صدر اکیڈمی آف سائنسز جناب اکیڈیمیشین محمد عاصموف صاحب سے لے کر دوشنبہ میں شریک دو وفود تک شامل تھے۔ ان نامہ ہائے تشکر کو میں اس روز نامچے کے ساتھ شریک کردونگا جو مرتب کرنے کا ارادہ ہے۔

اس سفر کی تصاویر بھی آج سب جمع ہوگئیں اور ایک ایک کاپی مجھے مل گئی۔ میں نے ان کو بغور دیکھا اور محترم جناب ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب کی بہترین مدد سے جن کے نام یاد نہ آسکے تھے، تصاویر کی پشت پر لکھ لئے۔ اس طرح تصاویر کا یہ البم مکمل ہوگیا۔ اسے سامان سفر میں بڑی احتیاط سے شامل کرلیا۔

غرض میں نے یہ تمام کام آج صبح ہی ختم کرلئے۔ ڈاکٹر عبداللہ جان صاحب نے دس بجے آکر مجھے بتایا کہ آج کا دن آزاد ہے۔ یعنی کوئی کام نہیں ہے، بہت خوب۔ میں نے

پوچھا کہ ایسی صورت میں سمرقند گردی کیسی رہیگی - چنانچہ وہ میرے ساتھ سمرقند کی گلی کوچوں اور بازاروں میں چلنے کے لئے تیار ہوگئے - اس سے مجھے بڑی تقویت ملی - ہمارے وفود کے اب سب اراکین جاچکے تھے - گزشتہ شام کو محترم فیض احمد فیض صاحب اور علی سردار جعفری اور ان کی بیگم اور محترمہ عصمت چغتائی اور ان دونوں کی مترجمین مارگریٹا پاؤلونا اور تانیا جاچکی تھیں - تانیا سے مجھے دل چسپی یہ ہوگئی تھی کہ اس نے نماز جمعہ کے وقت پوری دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور اس فرض کی ادائیگی کو سمجھنے کی کوشش کی تھی - آج ہی صبح تین بجے چیکوسلوواکیہ کے ڈاکٹر بچسکا اور جرمنی کے ڈاکٹر لوزمز وغیرہ بھی ماسکو چلے گئے - اب میں اور ڈاکٹر غلام مصفطیٰ رسولی، محترمہ مریم سلگانگ اور ان کی دو معاون خاتون اور ریڈیو ماسکو کے نمائندے باقی رہ گئے تھے -

کچھ گپ شپ کے بعد ہم سب نے ناشتہ ایک جگہ بیٹھ کر اطمینان سے کیا - خوب باتیں کرنے کا موقع ملا کیونکہ آج کا دن آزاد تھا - میں نے کل روزہ بھی رکھا تھا - رات کا کھانا بڑا اچھا تھا مگر میں نے خوراک سے کم کھایا - اسلئے صبح ناشتے کا موڈ تھا - میں نے روس میں آج پہلی بار انڈے کھائے - تین فرائڈ ایگز - مجھے ڈاکٹر برنارڈ والش (میرے معالج قلب، واشنگٹن) سے ڈر لگتا ھے - انھوں نے ایک ھفتے میں زیادہ سے زیادہ تین انڈے کھانے کی ھدایت کی تھی مگر میں نے تو نو دن میں یہ تین انڈے کھائے - جو مریض اپنے معالج کی ھدایت پر عمل کرتے ھیں ان کو خاطر خواہ فائدہ پہنچتا ھے - میں اپنے مطب کے

تمام مریضوں کو هدایات دیتا هوں که غذا کے معاملے میں حسب ضرورت احتیاط برتا کریں۔

"یوم حشر"

هم کمرے میں بیٹھے ناشته کررهے تھے اور بوندا باندی هورهی تھی۔ میں اس سوچ میں تھا که سمرقند گردی کیسے هوگی۔ اس زمین سمرقند پر که جس کے هر قدم پر ایک ولی مدفون هے ، اگر میں نے تلاوت قران سمرقند گردی کے ساتھ ساتھ نه کی تو بڑی کمی ره جائیگی۔

غنیمت هے ، کچھ دیر میں بارش رک گئی۔ ناشته پہلے هی ختم هوچکا تھا۔ ایسا معلوم هوتا تھا که روس میں دودھ کا جیسے رواج هی نہیں هے۔ دوشنبه میں دو دن دودھ مل گیا تھا۔ آج اس سمرقند میں بڑی عمده دهی کی لسی ملی۔ میں نے ۱۱ اپریل سے اب تک سیروں دهی نوش جان کرلی هوگی۔ بڑی عمده دهی تھی۔ خیال آیا که شاید قدرت کی طرف سے اشاره و انتظام تھا که مجھے دودھ کم و ترک کر کے اب باقی عمر دهی پر توجه کرنی چاهئیے۔

پروفیسر مرادوف صاحب که جو سمرقند میں همارے سفر و قیام کے منتظم اعلا تھے خود اسی علاقے (ازبکستان) کے باشندے هیں اور دخوند ان کا مولد هے که جس پر صدرالدین عینی نے پوری ایک کتاب لکھی تھی۔ مرادوف صاحب لال رنگ کی ایک نستعلیق پٹی لائے اور میری اچکن پر اسے پن سے لگا دیا اور کہا : ''آج حشر هے ، حشر''۔

لینن کے جنم دن پر

''حشر،، تاجیکی اور ازبکی زبانوں کا لفظ ہے۔ اسے ''ورکرز فیسٹیول،، عرف عام میں کہتے ہیں۔ ''سبوت نک،، روسی اصطلاح ہے۔ آج ۲۲ اپریل کو لینن اعظم کا جنم دن ہے۔ آج کے دن تمام روس اور روس کی تمام پندرہ ریاستوں میں لینن کا جنم دن اس انداز سے منایا جاتا ہے کہ آج تمام ورکرز اور تمام کارکن بلا معاوضہ کام کرتے ہیں اور اتنا کام کرتے ہیں جو معمول سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا جو معاوضہ ملتا ہے، وہ ایک فنڈ کی صورت میں جمع کیا جاتا ہے اور اس خطیر رقم کو بھلائی کے کاموں میں صحت و ثقافت، تعلیم اور سائنس پر خرچ کردیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ رسولی، کہ وہ خود پندرہ سال ماسکو ریڈیو سے متعلق رہ چکے تھے اور اب ریڈیو ٹیلے وژن کابل سے متعلق ہیں، بڑی عمدہ روسی زبان جانتے ہیں۔ انھوں نے ''حشر،، کا اس طرح مختصر تعارف کرایا۔ میں نے اس کو بڑی دلچسپی سے سنا۔

پروفیسر مرادوف صاحب نے لال پٹی منسلک کردی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس روز میں بھی روسی ورکر ہوگیا تھا۔ جب ہم سب ہوٹل سے باہر نکلے تو وہاں عورتیں اور مرد ہوٹل کے ماحول کو درست کرنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف کیاریاں بنائی جارہی تھیں اور ان میں پودے لگائے جارہے تھے۔ اس کام میں میں بھی شریک ہوگیا۔ میں نے پھاوڑا سنبھالا اور چکنی مٹی لا لا کر ان لڑکیوں کو دینے لگا کہ جو اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے کیاریوں میں گل و لالہ کا اہتمام کر رہی تھیں۔ میں نے ان

میں تعمیر کا جذبہ بدرجہ اتم پایا۔

جب میں پھاوڑے سے چکنی مٹی اٹھا اٹھا کر کیاریوں میں ڈال رہا تھا اور پیاری بچیاں اپنے نرم و نازک اور خوبصورت ہاتھوں سے مٹی پھیلا رہی تھیں تو ایک صاحب آگے بڑھے اور مجھ سے نستعلیق اردو زبان میں دریافت کیا:

''جناب کا تعلق کس علاقے سے ہے؟''

غالباً وہ کافی دیر سے وہاں کھڑے تھے اور مجھے مصروف دیکھ رہے تھے لیکن میں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ میرا سفید صاف لباس، اچکن اور شرعی پاجامہ دیکھ کر انہوں نے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ میں برصغیر کا باشندہ ہوں لیکن صحیح مقام کا پتہ نہ چل سکا۔ میں نے ان کے سوال کا جواب دینے کی بجائے کہا:

''مجھے معلوم ہے کہ جناب کا تعلق لکھنئو سے ہے۔ اپنے بارے میں آپ کو اس کام سے فارغ ہونے کے بعد بتاؤنگا''۔

میں نے بھی ان کے لباس اور لب و لہجے سے ان کے وطن مالوف کا اندازہ لگایا تھا اور وہ صحیح تھا۔ میں نے ان کے چہرے پر کچھ حیرانی محسوس کی۔ وہ منتظر رہے تا آن کہ سب کیاریاں تیار ہوگئیں۔ تب میں جناب ایس، ایچ، عرفان کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے ان سے کہا:

''آپ کی تعلیم تو لکھنئو میں ہوئی ہے۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ اب آپ فرمائیے کہ کہاں رہتے ہیں؟''

عرفان صاحب نے اعتراف کیا کہ ان کا تعلق واقعی لکھنئو

سے ہے مگر اب پاکستانی ہیں ۔ تاہم عارضی طور پر لندن میں مقیم ہیں ، جرنلسٹ ہیں اور ان دنوں سمرقند و بخارا کی سیاحت پر آئے ہوئے ہیں ۔ اسی ہوٹل ''سمرقند،، میں قیام ہے ۔ میں نے اپنا تعارف کرایا ۔

''جناب میرا نام حکیم محمد سعید ہے ، میں کراچی ۔ ۔ ۔،،

جملہ پورا نہ ہوسکا تھا کہ عرفان صاحب چونک کر بولے :

''ہمدرد ۔ ۔ ہمدرد ۔ ۔ آپ ۔ ۔ ۔،،

ڈاکٹر مصطفیٰ رسولی قریب کھڑے گفتگو سن رہے تھے ۔ وہ لقمہ دیتے ہوئے بولے :

''جی ہاں ، حکیم محمد سعید اور ہمدرد ہم معنی ہیں ۔ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور یہ کسی طرح الگ نہیں ہوسکتے،، ۔

عرفان صاحب مجھسے پوچھنا چاہتے تھے کہ میں نے ان کے بارے میں یہ اندازہ کیسے لگایا کہ وہ لکھنئو کے ہیں ۔ میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا کہ میں نبض دیکھ کر بیماری کا پتہ چلاتا ہوں اور صرف چہرا دیکھ کر انسان کے وطن مالوف کا اندازہ کرتا ہوں ۔ یہ طے پایا کہ پانچ بجے شام ہم پھر ملینگے ۔ انھوں نے مجھے اور میں نے ان کو لندن کا پتہ دیا ۔ وہ مسز پٹیل کے ساتھ امام بخاری چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آ گیا ۔ اور کمرے کی ایک کھڑکی سے دیکھتا رہا کہ بچیاں بدستور انہماک کے ساتھ کیاریاں بنانے میں لگی ہوئی تھیں ۔ انھیں اپنے قومی راھنما لینن سے کتنی محبت تھی ۔ بچیوں کی اس والہانہ عقیدت و محبت کو پسندیدگی کی

نظر سے دیکھتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ لینن کے اس جنم دن کے موقع پر میں اس عظیم انسان کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر نظر ڈالوں ۔ اتفاق سے ہوٹل کے کمرے میں ایک کتاب موجود تھی جو سیاحوں کی دل بستگی اور معلومات کے لئے جان بوجھ کر رکھی جاتی ھے ۔ شروع سے آخر تک اس کا مطالعہ ممکن نہیں تھا ۔ میں نے ورق گردانی کرتے ہوئے کہیں کہیں سرسری نظر ڈالی ۔

ولادیمر لینن سمبرسک (موجودہ اولیا نوف) کے مقام پر ۲۲ اپریل ۱۸۷۰ء کو پیدا ہوئے ۔ ۱۸۸۷ء تک وہ اسکول کے طالب علم رہے ۔ کازان یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں داخلہ لیا لیکن فارغ التحصیل ہونے سے قبل اپنے انقلابی خیالات کے باعث گرفتار کر لئے گئے ۔ ۱۸۸۸ء تک کازان میں جلا وطنی کے دن گزارے ۔ وھاں سے اگلے ھی سال سمارا (موجودہ کوئی بی شیف) منتقل کردیا گیا اور پھر حکومت نے ان کی کم سنی کے پیش نظر معافی دیدی ۔ چنانچہ وہ پیٹرز برگ یونیورسٹی میں داخل ہوگئے ۔ جہاں سے ۱۸۹۱ء میں قانون کی باقاعدہ سند حاصل کرلی اور وکالت شروع کردی ۔ دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ انہوں نے مزدور طبقے کی نجات کے لئے جدو جہد کی خاطر ایک انجمن ورکرز لیگ کے نام سے قائم کردی ۔ جس کا سربراہ انھی کو بنایا گیا ۔ ان کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے حکومت نے پھر دسمبر ۱۸۹۵ء میں گرفتار کرلیا ۔ زار کی سیاسی پولیس نے ان کو تقریباً چودہ ماہ تک حراست اور قید تنہائی میں رکھا ۔ ۱۸۹۷ء میں ایک بار پھر جلا وطن کرکے ۱۹۰۰ء تک کے لئے سائبیریا کے

ایک گاؤں میں بھیج دیا جہاں عموماً سیاسی قیدیوں کو نظر بند
رکھا جاتا تھا۔ اس طرح بے عمل رہنا ان کے لئے ممکن نہیں
تھا۔ آخر وہ فرار ہوکر میونخ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک
اخبار نکالنے کا ارادہ کیا تا کہ اسے پوشیدہ طور پر روس بھیج کر
اپنے پروپیگنڈے کو جاری رکھیں۔ لپزک (جرمنی) کے ایک
چھاپہ خانہ نے اخبار " اسکرا ، (چنگاری) چھاپنے کی ذمہ داری
لے لی۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۱ دسمبر ۱۹۰۰ء کو شائع ہوگیا۔
انہیں اپنے کئی ہم وطن ہم نوا مل گئے۔ لہذا وہ اپنا کام ان کے
سپرد کرکے اپریل ۱۹۰۲ء میں جرمنی سے لندن چلے گئے۔ بیوی
بچوں کی یاد آئی تو ان کو روس سے بلاکر سوئزر لینڈ کے شہر
جنیوا کے گرد و نواح میں آباد کردیا جہاں وہ سب ۱۹۰۳ء سے
۱۹۰۵ء تک رہے۔ وہ اپنے اخبار کے لئے مضامین اور تنقیدی کالم
وہیں سے لکھتے رہے۔ پھر لندن جا کر بگ بین کے ہال میں اپنی
پارٹی کی پہلی کنگرس منعقد کی اور اس کے اغراض و مقاصد اور
آئندہ کے لائحۂ عمل کا تفصیلی خاکہ پیش کیا۔ وسیع تر
پروپیگنڈے کے لئے " اسکرا ،، ناکافی تھا۔ اس لئے ایک ہفتہ وار
" پرولتاری ،، بھی جنیوا سے نکالنا شروع کیا۔ ۱۹۰۸ء میں
دونوں اخبارات کی مجلس ادارت پیرس منتقل ہوگئی۔ ان کی والدہ
اسٹاک ہام پہنچ گئی تھیں۔ انہیں دیکھنے کے لئے ۱۹۱۰ء میں
وہاں چلے گئے۔ لیکن اپنے مشن سے خالی الذہن نہیں ہوئے۔
اسی سال سوشلسٹ پارٹی قائم کی اور اس کی دوسری کنگرس
طلب کرلی۔ اس سے اگلے سال دوبارہ پیرس جا کر اپنی پارٹی کا
ایک اسکول قائم کرلیا تا کہ نوجوانوں کو باقاعدہ اشتراکی نظریات

کی تعلیم و تربیت دی جاسکے۔ ۱۹۱۳ء میں بالشویک کانفرنس کے پہلے اجلاس میں حصہ لیا جو پراگ میں طلب کیا گیا تھا۔ اس اثناء میں خود روس میں ان کے حامی بڑی تعداد میں سامنے آگئے اور ان کے ایما پر انہوں نے پیٹرز برگ سے ''پراودا'' نکالنا شروع کیا۔ وہ روس سے باہر رہ کر ھی اس کی اشاعت کے لئے راھنمائی کرتے رہے۔ اسی اثناء میں پہلی جنگ عظیم چھڑگئی۔ ہر ملک کو اس عالمگیر لڑائی سے خطرہ لاحق تھا۔ چنانچہ ان کے انقلاب انگیز خیالات کے پیش نظر اوسٹریا کی پولیس نے انہیں گرفتار کرلیا۔ وہ محض ایک سیاح کی حیثیت سے وھاں گئے تھے۔ انہوں نے عدالتی کارروائی کی تو انہیں سوئزر لینڈ جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ کچھ عرصے برن اور پھر زیورخ میں رہے اور وھاں سے سامراجی جنگ کی ڈٹ کر مخالفت کرتے رہے یہ کہہ کر کہ یہ لڑائی کسانوں کو بے پناہ مصائب میں مبتلا کررھی ھے۔ آخر یہ جلاوطنی کی زندگی ان کے لئے بار خاطر ھوگئی اور وہ اپریل ۱۹۱۷ء میں پیٹرزگراڈ چلے گئے۔ اب تک ان کے حامیوں کی تعداد بہت زیادہ ھوگئی تھی۔ وہ ایک بکتر بند گاڑی میں بیٹھ کر نکلتے اور مائکروفون کے ذریعہ سے عوام کو اقتدار پر قبضہ کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ھوئے حکومت زار نے ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کردیا تو وہ اسی شہر میں جھیل کے کنارے ایک کسان کی جھونپڑی میں جا چھپے اور اپنا حلیہ اس طرح بدل لیا کہ ایکدم کوئی شناخت نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اس طرح کب تک رھتے۔ آخر فن لینڈ چلے گئے اور ھل سنکی میں رھنے لگے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو وہ انجن میں

کوئلہ جھونکنے والے کا بھیس بدل کر پھر وطن آگئے ۔ ۲۵ اکتوبر کی رات کو اپنے حوارین سے مل کر اورورا نامی جہاز سے ایک گولہ داغ کر اکتوبر کے عظیم اشتراکی انقلاب کا اعلان کردیا ۔ اپنا ہیڈ کوارٹر اسمونی کے انسٹی ٹیوٹ میں قائم کیا جو پہلے سے اشتراکیوں کا اڈا تھا ۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں سوویت حکومت قائم کرلی گئی ۔ جس کا دفتر کریملن میں بنایا گیا ۔ زار روس نے کرائے کے آدمیوں سے ان پر قاتلانہ حملہ کرایا مگر وہ بچ گئے ۔ تاہم بڑے چوکنے رہے کیونکہ ملکی سامراجیوں کے علاوہ غیرملکی مداخلت کار بھی ان کے تعاقب میں رہنے لگے تھے ۔ تاہم اشتراکیوں کا پلہ بھاری رہا اور زار کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا ۔ دسمبر ۱۹۲۲ء میں سوویت اشتراکی جمہوریتوں کی یونین بن گئی ۔ یہ لینن کی سب سے بڑی کامیابی تھی کیونکہ اب کسی طرف سے مخالفت کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا ۔ شدید کام اور ذہنی پریشانیوں نے قدرتی طور پر ان کی صحت پر برا اثر ڈالا ۔ وہ بیمار رہنے لگے ۔ پھر بھی کام کرتے رہے ۔ گورکی ایک صحت بخش مقام ہے ۔ وہاں رہ کر انہوں نے اپنے منشور کا آخری حصہ مکمل کیا اور ۲۱ جنوری ۱۹۲۴ء کو اس جہان سے کوچ کردیا ۔ ماسکو کے ریڈ اسکوئر میں ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا ۔ لیکن دفن کرنے کے بجائے ان کی نعش کو حنوط کرکے محفوظ کردیا گیا جس کی آج تک زیارت کی جاتی ہے ۔

سمرقند یونیورسٹی میں

اس مختصر جائزے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ لینن کس قدر مخلص ، بے لوث اور عملی انسان تھے ۔ شاید وہ اسی سہم

کو سر کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔

میں نے کتاب بند کی اور فوراً دوبارہ تیار ہو کر باہر نکلا۔ ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب میرے منتظر تھے۔ ان کے ساتھ سب سے پہلے سمرقند یونیورسٹی کے علاقے میں گیا۔ میں نے بڑی حیرت اور مسرت کے ساتھ دیکھا کہ تمام طالب علم -- لڑکے اور لڑکیاں ــــ اپنی جامعہ کی صفائی اور تزئین میں مصروف ہیں۔ بچیاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک یونیورسٹی کے چمنستانوں کو سنوار رہی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں پھاوڑے ہیں اور وہ زمین کو گود رہی ہیں۔ لڑکے نئے نئے پودے لا رہے ہیں اور بچیاں یہ پودے لگا رہی ہیں۔

بعض طلبہ گھاس پھونس کاٹ رہے اور صاف کررہے ہیں۔ بہت سے طلبہ اینٹ گارے کا کام کر رہے ہیں اور جہاں جہاں دیواریں شکستہ ہیں، ان کو بنارہے ہیں۔ میں نے بھی ایک اینٹ گارا لگا کر جمادی۔ طلبہ کو مجھ سے دو وجہ سے دلچسپی تھی۔ ایک تو میرا لباس ان کے لئے انوکھا اور دلچسپ تھا۔ بعض بچیوں نے ڈنڈوت کے انداز میں میرا خیر مقدم کیا، یہ سمجھ کر کہ میں بھارت سے آیا ہوا کوئی ہندو ہوں۔ بعض فرق محسوس کرکے سلام کرتی رہیں۔ میں ان سے ہاتھ ملاتا رہا اور وہ ہنس ہنس کر مجھے جواب دیتی رہیں۔ دل چسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں سے بعض طلبہ شاید وہ ہونگے جنہیں میں نے خطاب کیا تھا۔

ایک بار پھر میں نے ان طلبہ کے کردار اور عمل کا مقابلہ پاکستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلبہ سے کیا۔ وہاں تعلیم

کو ایک جزو زندگی سمجھا جاتا ہے اور یہاں صرف دل لگی کا مشغلہ۔ وہاں اساتذہ کی عزت و احترام کا احساس اور یہاں اسکے برعکس جذبہ کار فرما ہے۔ وہاں کا ہر فارغ التحصیل طالب علم اپنے مضمون میں طاق ہوتا ہے اور یہاں ایسے کامیاب طلبہ صرف انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

یہ دورہ ختم کرکے میں پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے دل و دماغ بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ آج ہفتے کی وجہ سے چھٹی کا دن تھا۔ لینن کا یوم پیدائش بھی تھا۔ اس وجہ سے ملک میں تعمیر کی ہر قوت بیدار تھی۔ مزدور بلا معاوضہ معمول سے زیادہ کام کرنے کے لئے کمر بستہ تھے۔ طلبہ یونیورسٹی کو صاف ستھرا بنانے میں منہمک تھے۔ ہوٹل کے ورکرز اور میدانوں کے کسان مستعدی سے اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ میرے ہوٹل کا عملہ بھی آج بے حد چست تھا۔ کل میرے لئے پانی نایاب تھا اور آج ہر منٹ پر سروس ہورہی تھی۔ میں اس عظیم جذبے کی قدر کرتے ہوئے اپنے کمرے کی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوکر غور کرتا رہا کہ آخر روس میں ہر شخص کے دل میں یہ جذبہ کس طرح موجزن ہوا۔ میں آنکھیں بند کرکے سوچ رہا تھا۔ میرے وطن پاکستان کا المیہ کتنا شدید تھا۔ میں جامعۂ سمرقند کے علاوہ جامعۂ دوشنبہ اور جامعۂ ماسکو میں گھوم پھر کر بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ میں نے کسی بھی جگہ یونیورسٹی کی دیواروں پر کوئی پوسٹر کسی کے خلاف نہیں دیکھا اور نہ کسی تحریر سے دیواروں کو بدنما پایا۔ اس کے برعکس جامعۂ کراچی کی کوئی دیوار و در ایسا نہیں ہے کہ جس پر کچھ نہ کچھ لکھا

ہوا نہ ہو۔ کراچی یونیورسٹی کے باغات بنجر علاقے کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور بے آب و گیاہ ہیں۔ اس کے بجائے آئے دن یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ طلبہ کی مختلف یونینوں میں باہمی فساد نہ ہوجائے یا کوئی طالب علم کسی استاد کی بے حرمتی نہ کر بیٹھے۔ یہاں تو پروفیسر صاحبان کجا، وائس چانسلر تک اہانت آمیز رویے سے بچ نہیں سکے۔ خدا کی پناہ۔

ہمدرد میں کام کرنے والوں کا تصور کرکے بھی شرم سی محسوس ہوئی۔ ہمدرد کے ورکر ہر وقت اس بات کے لئے آمادہ رہتے ہیں کہ ہمدرد کو تباہ کردیں۔ چوریاں بھی ہوتی ہیں۔ دواؤں میں شرارت سے ملاوٹ کر کے بھی نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ توڑ پھوڑ، گندگی اور غلاظت میں اضافہ، کام چوری، سینہ زوری، غنڈہ گردی، یہ سب کچھ ان کا معمول ہے اور درحقیقت پاکستان میں آج ہر محنت کش کا یہی دستور ہے۔ ان کے برعکس یہاں ہر ورکر آج لینن کے یوم پیدائش پر کوئی چھٹی نہیں کرتا، کام کرتا ہے، کیونکہ لینن بھی مجسمۂ عمل تھے۔ ہر ورکر دوسروں کا ہاتھ بٹاتا ہے اور تعمیر کی راہوں کو ہموار اور استوار کرتا ہے۔

میں اس زبردست فرق پر حیران تھا۔ ہمدرد کے ورکر اللہ کا نام لیتے اور نبی کا کلمہ پڑھتے ہیں اور ڈیوٹی کے اوقات کار میں سیرت کے جلسے منعقد کرتے ہیں۔ ان کے برعکس روس کے عام باشندے اللہ سے باغی سمجھے جاتے ہیں مگر لینن کے وفادار ہیں۔ ان کی تعلیم کے مطابق تعمیر و ترقی کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ ان کے جذبۂ صادق کو میں نے بہ چشم خود دیکھا اور ان کے ساتھ کام کرکے، ان کا ہاتھ بٹا کر ان کے دل کی دھڑکنوں کو

سنا ہے۔

تین بجے نماز ظہر ادا کر کے میں پھر اپنے ہوٹل سے نکل گیا اور سمرقند کے بازاروں میں چلا گیا۔ گورکی روڈ کے بعض حصے کھودے جارہے تھے اور ایسفالٹ کی کارپٹ ڈالی جارہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ورکرز مقامی زبان داں ہیں اور بعض اپنی ٹوپی سے تاجیکستانی لگتے ہیں۔ میں کھڑا ہوگیا، ان کا کام دیکھتا رہا۔ کس قدر تیزی کے ساتھ وہ مشینوں سے زمین ادھیڑ رہے تھے اور کس عجلت کے ساتھ وہ نیا تار کول آمیز مسالہ بچھا رہے تھے۔ آدھ گھنٹے میں سینکڑوں گز لمبی نئی سڑک بن گئی۔ میں ان کے قریب گیا۔ وہ بھی مجھے آدھ گھنٹے سے وہاں دیکھ رہے تھے۔ میں نے فارسی میں پوچھا کہ اگر آج لینن کا یوم پیدائش ہے تو آپ نے چھٹی کیوں نہیں کی؟

یہ سوال ان کے لئے انوکھا تھا۔ جواب دیا:

''آج بلاشبہ یوم لینن ہے، اس لئے یہ یوم تعمیر و تزئین ہے۔ ہم سب آج تعمیر وطن میں حصہ لے رہے ہیں،،۔

پھر میں نے پوچھا:

''آپ کو آج کتنی اجرت ملیگی۔ چونکہ چھٹی کا دن ہے، اس لئے شاید دوگنی یا تین گنی اجرت ملیگی۔ یہاں کا قاعدہ کیا ہے؟،،

سب نے یک زبان ہوکر جواب دیا:

''اجرت کیسی! ہم تو آج بلا معاوضہ کام کر رہے ہیں۔ ہم اپنے وطن کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہیں۔ ہمارے محبوب رہنما لینن نے اپنی خدمات کا کوئی

معاوضہ قوم سے نہیں لیا تھا ۔ ہمیں بھی کوئی حق نہیں ہے ،،۔

میں اس سے زیادہ ان سے بات نہ کرسکا ۔ بیشتر ازبکی تھے۔ ان کو تاجیکی فارسی سے زیادہ مس نہیں تھا ۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر عبداللہ صاحب کو ساتھ لے لوں ۔ مگر پھر فیصلہ کیا کہ نہیں ۔ مجھے خود ھی اکیلے جائزہ لینا چاھئے ۔

میں سڑک سے ھٹ کر ریشم روڈ پر چلا گیا ۔ یہ وھی سڑک ھے جو تاریخ میں شاھراہ ریشم کہلاتی ھے اور جو کاروانوں کے لئے مخصوص تھی ۔ چین، برصغیر اور مغرب کے مابین اس پر چل کر تجارت ھوتی تھی ۔ اب اس کا نام بدل کر لینن روڈ رکھ دیا گیا ھے ۔ اس سڑک کے دونوں طرف دکانیں ھیں ۔ سب کھلی ھوئی تھیں ۔ کام جاری تھا ۔ میں ایک اسٹور میں گھس گیا ۔ یہ ڈبل روٹی، کیک ، پیسٹری وغیرہ کی دکان تھی ۔ میں نے پوچھا کہ ''آج تو چھٹی کا دن ھے ۔ پھر آپ کاروبار کیوں کرتے ھیں ،،؟

دکان دار نے مسکرا کر جواب دیا :

''آج میرے تمام ورکر کام پر ھیں ۔ وہ بلا معاوضہ کام کر رھے ھیں ۔ میں ان کا معاوضہ حساب لگا کر جمع کرونگا اور حکومت کے خزانے میں داخل کردونگا جو رفاہ عام کے لئے ھے ،،۔

پھر میں نے سوال کیا :

''آپ کو کیسے یقین ھے کہ جو رقم دی جائیگی ، وہ سب کی سب قومی کام پر صرف ھوگی ،،؟

دکاندار نے مجھے غور سے دیکھ کر بے رخی سے جواب دیا :

''یہ سوال روس میں بے معنی سا ھے ۔ یہاں جو کہا جاتا ھے ، وھی کیا جاتا ھے ۔ ھم کو سو فیصد یقین ھوتا ھے کہ روپے کا نا جائز مصرف نہیں ھوگا ،،۔

میں جگہ جگہ گھوم پھر کر پانچ بجے ھوٹل واپس آ گیا اور ھوٹل کے باھر **ایک** بنچ پر آ کر بیٹھ گیا ۔ میری فکر میں تلاطم برپا تھا ۔ میں حیران تھا ۔ معاً میرے ذھن میں اپنے قائد اعظم کا یوم پیدائش آ گیا ۔ ھم تو پاکستان میں اس دن داد عیش دیتے ھیں ۔ ھمارا ورکر تو چاھتا ھے کہ قائد اعظم تو کیا جو بھی بڑا مر گیا ھے ، اس کا یوم وفات اور یوم ولادت ، دونوں پر چھٹیاں سنائیں اور کام ھرگز نہ کریں ۔ اب تو محرم کی بھی تعطیلات دو ھوگئی ھیں ۔ اور اب تو آغا خان کا یوم پیدائش بھی تعطیل میں بدل گیا ھے ۔ دونوں مقامات کے انداز فکر میں کتنا فرق ھے ۔ کیا یہ فرق کمیونزم ، سوشلزم اور اسلام کے مابین پیدا ھوا ھے ، یہ پہلو قابل غور ھے ۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیں اور ھماری بے فکریوں اور بے عملیوں کی ھمیں اب زیادہ سزا نہ دیں ۔ ورنہ ھمارا رھا سہا ایمان متزلزل ھوجائیگا ۔

قبروں پر قرآن خوانی

''سمرقند گردی،، سے واپس آتے ھوئے میں **ایک** پرانے مقبرے میں داخل ھوگیا جو ھوٹل کے عین پیچھے واقع ھے ۔ اندر گیا ۔ آثار بتا رھے تھے کہ کوئی بزرگ دفن ھیں ۔ ان کے آس پاس اور قبریں بھی تھیں ۔ ادھر میں داخل ھو رھا تھا اور ادھر **ایک** خاندان ، جو باپ ، ماں ، بیٹا ، بیٹی ، پوتا یا نواسہ پر

مشتمل تھا ، داخل ہوا ۔ وہاں دو تاجیکی یا ازبکی نوجوان پہلے سے موجود تھے جو قبروں پر لگے ہوئے کتبے پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ یہاں میں نے ایک بزرگ مجاور کو بھی دیکھا ۔

میں نے بھی وہ کتبے پڑھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا ۔ پھر میں نے تمام اہل قبور کے لئے فرداً فرداً قران خوانی کی ۔ میں اس محویت سے بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ تاجیکی باپ مجاور بزرگ کے پاس بیٹھا ہے اور قریب ہی اس کی نوخیز بیٹی اکڑوں بیٹھی ہے ۔ سب مل کر فاتحہ خوانی کر رہے تھے ۔ اس منظر کو میں نے بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھا ۔ اس خاندان کے باقی افراد نے فاتحہ خوانی میں حصہ نہیں لیا ۔ باپ نے مجاور کو کچھ نذرانہ دینا چاہا جسے اس نے خاصے تامل سے قبول کیا ۔ اس ”قبول و ایجاب،، کو دو نوجوان ازبکی حیرت سے دیکھ رہے تھے ۔ میرا دراز دست دعا بھی ان کے لئے ضرور وجۂ حیرت تھا ۔

حلقۂ دام خیال میں

صبح سے شام تک ”سمرقند گردی،، کر کے میں ہوٹل سمرقند کے باہر بچھی ہوئی ایک بنچ پر آکر بیٹھ گیا ۔ موسم خاصا سرد تھا ۔ اندر عافیت تھی مگر میرا مطالعہ ہنوز پورا نہ ہوا تھا ۔ میں اب ان عورتوں اور مردوں کو دیکھ رہا تھا کہ جو اپنے فرائض ادا کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے ۔ میں نے ان کی چال میں نصرت دیکھی اور ان کے چہروں پر فتح مندی کے آثار تھے ۔ ان کی آپس کی گفت گوؤں میں اطمینان تھا ۔ ان کی فتح و نصرت درحقیقت ان کی تعمیر وطن کی جد و جہد کا نشان تھی ۔ آج چھٹی کے دن وہ تعمیر وطن کے جذبے سے سرشار ہو کر

صبح سے شام تک کام کر کے آئے تھے اور ان کو یہ فخر حاصل تھا کہ انھوں نے اپنے فرائض خلوص و خوبی کے ساتھ انجام دئے تھے اور آج کی اپنی تنخواہ اس سرکاری فنڈ میں دی تھی کہ جس پر ان کو یقین کامل تھا کہ وہ تعمیر و ترقی اور فلاح و خیر کے کاموں پر صرف ہوگی۔

درحقیقت یہی وہ یقین ہے کہ جو ان کو تعمیر پر ابھارتا ہے اور ترقی اور جد و جہد کے لئے تیار کرتا ہے اور ایثار کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تعمیر وطن کے لئے حقوق و فرائض کے ساتھ دیانت و امانت کا مقام بہت بلند ہے۔ جس معاشرے میں یہ خوبیاں پیدا ہوجائیں ، اس کی فتح مندی میں شک ہے نہ شبہ۔

میں سوچ میں غرق تھا۔ میرے سامنے صبح سے شام تک کی ہر ہر چیز ابھر کر آرہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہوٹل کے کارکن اپنے ہوٹل کی تعمیر پر لگے ہوئے ہیں۔ عورت اور مرد صفائی میں مصروف ہیں اور بعض نازک ہاتھ ہوٹل کے باہر کیاریوں میں نئے پھول لگا رہے ہیں۔ خود میں نے بھی تو ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ چکنی مٹی تو میں نے اٹھا اٹھا کر ان کو دی تھی۔

پھر میرے سامنے جامعۂ سمرقند کا نقشہ آگیا۔ دس ہزار طلبہ اور طالبات اپنی جامعہ کی صفائی اور درستی میں ہمہ تن مصروف تھے۔ باغات کو سنوار رہے تھے اور نئے پودے لگا رہے تھے۔ جامعہ سمرقند کی آج ہر ہر چیز صاف ستھری تھی۔ پھر میں نے جامعۂ کراچی کا نقشہ اپنی نگاہوں سے دیکھا کہ یہاں کوئی دیوار بے داغ نہیں ہے اور ہر سلوگن ایک وجہ فکر بنا

ھوا ھے۔ کیسے کیسے سلوگن میں نے وھاں دیکھے ھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ سگریٹ ساز کمپنیاں جامعۂ کراچی میں اپنی تشہیر کر رھی ھیں۔ طلبہ ھنگاموں میں مصروف ھیں اور ان کے ھنگاموں کی کہانیاں سر افتخار کو جھکا رھی ھیں۔

میں نے دیکھا کہ سمرقند کی ایک فیکٹری میں آج مزدور دو گنا کام کر رھے ھیں۔ وہ دوگنا کام اس لئے کر رھے ھیں کہ تعمیر وطن کے جذبے نے ان کے دل و دماغ کو مسحور کردیا ھے۔ پھر میرے سامنے اچانک حالات وطن آگئے۔ میں نے دیکھا کہ یہاں ھر مزدور تخریب پر لگا ھوا ھے۔ کام کرنا اس کی عادت نہیں رھی ھے۔ فساد و شر اس کی خصلت ھے۔ اس نے اللہ اور رسول کے احکامات کو یکسر نظر انداز کرکے رکھ دیا ھے۔ کام چوری، سینہ زوری اس کا مزاج ھے۔ شاید پاکستان کی ھر فیکٹری کا حال یہی ھے۔ آج بڑے بڑے ادارے دم توڑ رھے ھیں۔ بڑے بڑے صنعت کار اپنی فیکٹریاں فروخت کر رھے ھیں۔ بڑے بڑے ھنر مند بیکار پڑے ھیں۔ چنانچہ میرا ذھن ملک کی اقتصادی اور معاشی زبوں حالی کی طرف منتقل ھوگیا۔ اس میں اخلاق و کردار کا کس درجہ فقدان ھے۔ پاکستان آج محتاج ھے۔ اس کے ھاتھ میں کاسۂ گدائی ھے۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھا رھا ھے۔ وہ اپنے وسائل و ذرائع سے کام نہیں لے سکتا۔

وہ لوگ جو پانچ سال حکومت کر گئے، ان کا مزاج یہ تھا کہ انھوں نے پاکستان کی صنعتی سر بلندی کو سر نگوں کردیا ھے۔ وہ اس پر فخر کرتے تھے۔ اس حکومت کو یہ اطمینان تھا کہ اس نے حکومت کی صحت کو تباہ کردیا ھے۔ اس صورت حال

کے ذمہ دار وہ خود بھی ہیں اور بیرونی طاقتیں بھی، جو پسند نہیں کرتیں کہ پاکستان خوش حال ہو۔ میرے نزدیک جب تک اس صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ نہ لیا جائیگا اور یہاں جزا و سزا کو پوری طاقت سے نافذ نہیں کیا جائیگا، نہ پیداوار بڑھیگی اور نہ ہماری اقتصادی بد حالی خوش حالی میں بدلیگی۔

ایک گھنٹہ ہوٹل کے باہر بنچ پر تنہا بیٹھا حالات پر غور کرتا رہا۔ سینکڑوں مردوں اور عورتوں کا سامنے سے گزر ہوا۔ بچیوں کے لباس اب اسکرٹ میں بدل رہے تھے۔ بعض بچیاں کچھ شرما رہی تھیں۔ ان کے حیدر آبادی پاجاموں کے پائنچے کم ہو رہے تھےاور پنڈلیاں کھلنے لگی تھیں۔ شاید اب سے پانچ چھ سال بعد سب پاجامےختم کردیں اور اسکرٹ ان کی جگہ لے لیں۔ بچوں میں ٹائی کا استعمال ابھی عام نہیں ہوا ہے۔ پرانی عورتوں نے بھی اپنی وضع قطع کو قائم رکھا ہے۔ لمبی قمیضیں، حیدر آبادی پاجامے، سر پر تاجیکی ٹوپی اور اس پر رومال رنگین۔ بعض مرد روئی کا کوٹ اب بھی پہنے ہوئے تھے۔ کوئی جوان اس میں نظر نہیں آیا۔

ایک بچہ شرارت کرتا گزر رہا تھا۔ بارش کا پانی جو جگہ جگہ جمع ہوگیا تھا، وہ اس پر پیر مار مار کر ”چھپ چھپ،، سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ میں اس سے اس طرح دل چسپی لے رہا تھا جس طرح دور کھڑی ماں اس کی پیاری حرکت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب نے میری محویت کو توڑ دیا۔

”استاد ! آئیے، ذرا سا کھانا کھالیں “۔

میں نے کہا :

”صبح جو ناشتہ کیا ھے ، وہ کل تک کے لئے کافی ھے۔
اگر ضرورت ہوئی تو ھوائی جہاز میں کھانا اچھا رھیگا“۔

ماسکو کیلئے سفر واپسی

میں تو اپنے کمرے میں سامان صبح ھی تیار کرچکا تھا۔ سب کے ساتھ میرا سامان بھی باھر آ گیا ۔ دو موٹروں میں ھمارا باقی قافلہ ھوائی میدان کی طرف روانہ ھوا ۔ وھاں سارے انتظامات وی آئی پی (VIP) انداز سے ھوئے ۔ جہاز ۷ بج کر ۲۰ منٹ کے بجائے ۷ بج کر ۴۵ منٹ پر روانہ ھوگیا ۔ اب پھر ھماری منزل ماسکو تھی ۔

ھوائی میدان پر ڈاکٹر عبداللہ جان غفاروف صاحب اور ڈاکٹر پروفیسر مرادوف صاحب کو میں نے خدا حافظ کہا ۔ میں ان کے خلوص کار اور اظہار محبت سے بے حد متاثر ھوا تھا ۔ ان سے جدائی بڑی شاق گزری ۔ وہ بھی دل گرفتہ تھے۔ میں نے جہاز میں بیٹھتے وقت کہا :

”میری شیر خواری نہ بھولئے گا “۔

عبداللہ جان کھلکھلا کر ھنس پڑے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

ھوائی جہاز میں داخل ھوکر میں نے سوچا کہ ۵ گھنٹے اور ۲۵ منٹ کی پرواز ھے ۔ لاؤ، مثانہ خالی کرلوں تا کہ درمیان میں اٹھنا نہ پڑے۔ جہاز کے غسل خانے میں روشنی نہ تھی ۔

میں نے اندازے سے پیشاب کرلیا ۔ جھکنے پر میری جیب سے میری عینک پھسلی اور گٹر میں جا گری اور پھر ایک ''تڑاخ،، کی آواز آئی ۔ میں نے سمجھ لیا کہ گٹر کے پنکھے نے اسے پاش پاش کردیا ہے ۔ عینک کا نقصان زندگی میں پہلا حادثہ تھا ۔ ۱۹۳۳ء سے میں عینک پہن رہا ہوں ۔ میں نے اپنی عینک آج تک نہیں توڑی ۔ جب نمبر بدلتا ہے تو میں صاف بے داغ شیشے اسی عینک ساز کو ہدیہ کردیتا ہوں ۔

ہوائی جہاز کے چار پنکھے تھے ۔ جب وہ ایک ساتھ چلے تو کانوں میں شور ہوگیا ۔ اس شور میں لکھنا تو کیا ہوسکتا تھا ، میں نے مسعود مفتی کی کتاب ''ریزے،، نکال لی اور ماسکو تک پہنچتے پہنچتے اسے ختم کردیا ۔ مشرقی پاکستان کے حادثے کی بڑی حیرت انگیز افسانوی داستان قلم بند کی گئی ہے ۔

جہاز میں کھانا ملا ۔ تفصیل قابل غور ہے ۔

ایک بوٹی ، زیادہ سے زیادہ تین تولے وزن کی ۔ ایک مچھلی کا ٹکڑا ، زیادہ سے زیادہ دو تولے وزن کا ۔ ڈبل روٹی کا آدھا سلائس ۔ ایک نان خطائی ۔ چاول ابلے ہوئے ، بڑی مشکل سے دو تولے ۔

اندرون ملک پروازوں میں روسی ہوائی جہاز پر یہ کھانا ملتا ہے ۔ اس سادگی پر قربان جائیے ۔ تعمیر اذہان اور تعمیر وطن کے انداز یہی ہوسکتے ہیں ۔ فضول خرچیاں تعمیر کی راہ میں سم قاتل ہوتی ہیں ۔ ہم اسی زہر سے پاکستان میں مر رہے ہیں ۔ میں نے گوشت سے پرہیز کیا ۔ ڈبل روٹی کا آدھا سلائس اور نان خطائی اور چاول صاف کردئیے ۔

رات ماسکو وقت کے مطابق ۱۱ بج کر ۳۰ منٹ پر ہم ۵ گھنٹہ ۳۰ منٹ اڑنے کے بعد اترے۔ سامان آتے آتے کافی دیر ہوئی۔ پھر ہوائی میدان شہر سے ٦٦ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہوٹل پیکنگ پہنچے تو رات کے پونے دو بجے تھے۔ مادام مریم سلگانگ نے ہمارے قیام کا انتظام کیا اور ہمیں کمروں میں بٹھا کر وہ روانہ ہوگئیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ رسولی اور میں قریب قریب کے کمروں میں ٹھیرائے گئے۔ میرا کمرہ نمبر ٦٢٠ تھا۔

مختلف حالات پر غور کرتے رہنے سے نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ لہذا کافی دیر کچھ لکھتا، کچھ پڑھتا رہا۔ صبح کوئی تین بجے سوگیا اور پانچ بجے بیدار ہوگیا۔ یہ ہمیشہ سے میرا معمول رہا ہے کہ خواہ کتنی ہی دیر میں سوؤں، صبح کو مقررہ وقت پر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ نماز فجر ادا کی، وظیفہ پڑھا اور پھر تیار ہوکر میز پر بیٹھ گیا۔ جو کچھ رات کو لکھا تھا، اس پر نظر ثانی کی گئی۔ طبیعت پر کچھ بوجھ سا تھا، کیونکہ ہوائی جہاز کے سفر میں ماحول اچھا نہ تھا۔ روشنی ناکافی تھی۔ ہیڈ لائٹ شاید خراب ہوگئی تھی، جل نہیں رہی تھی۔ چار پنکھے والے انجنوں کا شور تھا۔ اسی لئے جہاز میں اپنی عادت کے مطابق کچھ لکھ نہیں سکا تھا۔ بہر نوع اس کمی کو پورا کرلیا گیا تھا۔

رات ہوائی جہاز میں روسی اخباری ایجنسی کے ایک نمائندے نے انٹرویو کی درخواست کی تھی۔ میں اچھے موڈ میں تھا، حالانکہ عینک کے حادثے کا دل پر اثر تھا، تاہم میں نے ایک اچھا انٹرویو دیدیا۔ نامہ نگار صاحب اپنے ڈھب پر لانے کے

لئے کافی کوشاں رہے مگر میں نے علم و ثقافت ، ادب اور سائنس کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھا ۔ اب دیکھئے کہ یہ بزرگ کیا رپورٹنگ کرتے ھیں ۔ شاید غیر محتاط نہ ھونگے اور جو باتیں کہی ھیں ، وھی لکھیں گے ۔

نو بجے صبح محترمہ بیگم سفیر پاکستان ، روح افزا بیگم صاحبہ کا ٹیلے فون آیا ۔ ویسے صبح ھی پیغام مل گیا تھا کہ آج ایک بجے ان کے ھاں لنچ ہے ۔ میں نے محترمہ کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ ضرور آؤنگا ۔ انھوں نے بتایا کہ جناب فیض احمد فیض صاحب کو بھی دعوت دیدی گئی ہے ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایک بجے موٹر بھجوائیں گی ۔ میں نے کہا کہ آپ کا گھر تو میرے پیکنگ ھوٹل سے صرف چار منٹ کے پیدل فاصلے پر ہے ، میں خود ھی آجاؤنگا ، مگر موٹر کے لئے ان کا اصرار رھا ۔

پروفیسر گونکوفسکی کے شاگرد رشید ڈاکٹر سرگے ٹیلے فون کرکے ملنے آئے تھے ۔ ۱۹۷۵ء میں یہ ھی میرے مترجم تھے اور بڑے بھولے ۔ ان کا نیا تجربہ تھا ، غلطیاں کرتے تھے اور ڈرتے تھے ۔ مجھے سرگے سے بیٹے کی طرح محبت ھوگئی ۔ سال ڈیڑھ سال بعد سرگے نے مجھے لکھا کہ میں نے ڈاکٹریٹ کرلی ہے ۔ میں نے بڑی پرجوش مبارک باد دی ۔ سرگے میرے لئے سماوار کا بڑا خوب صورت ننھا سا تحفہ لائے تھے ۔ میں نے بہت دیر ان سے باتیں کیں ۔ یہ لڑکا بہت پیارا ہے ، میں اس سے باتیں کررھا تھا کہ اتنے میں محترمہ مارگریٹا پاؤلانا بھی آگئیں ۔ میں نے سرگے کا تعارف کرایا ۔ ”یہ میرا بیٹا ہے“ ۔ وہ بہت ھنسیں ۔ واقعی سرگے کو میں بیٹے کی طرح چاھتا ھوں ۔

ریٹا سے پتہ چلا کہ جناب فیض صاحب بھی اسی ہوٹل کی ساتویں منزل پر مقیم ھیں ۔ اطمینان ھوا ۔ میں نے اس سفر کی تصاویر ریٹا اور سرگے کو دکھائیں ۔ ان میں سے دو تصاویر انھوں نے مجھ سے لے لیں ۔ میں نے بہ خوشی ان کو دیدیں ۔ میں نے اپنے لکھے ھوئے صفحات تاثرات روس پر صفحات کے نمبر ڈالے تو پتہ چلا کہ اب تک ۱۳۸ صفحات لکھے جاچکے ھیں ۔ مجھے خود تعجب ھوا کہ اتنے صفحات کیسے لکھ لئے گئے ۔

سوا بارہ بجے ڈاکٹر سرگے چلے گئے ۔ میں نے پروفیسر گونکوفسکی کو احترامات ان کی معرفت بھجوائے ۔ وہ اس وقت ماسکو میں نہیں ھیں ۔ میں نے ان کو یہ پیغام بھی دلوا دیا ھے کہ میں ، سعدیہ اور مسز ڈسلوا کے ساتھ ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء کو ماسکو دو دن کے لئے آؤنگا اور ۱۸ اگست کو کسی وقت صوفیہ (بلغاریہ) چلا جاؤنگا ۔

روس میں سفیر پاکستان محترم جناب سجاد حیدر صاحب بڑے مخلص انسان ھیں ۔ میں اور جناب فیض احمد فیض صاحب ان کی فرستادہ مرسیڈیز میں سفارت خانے پہنچے تو انھوں نے پرجوش خیر مقدم کیا ۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں ان سے ملاقات ھوئی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ میں اور جمیل الدین عالی صاحب بے یار و مددگار ماسکو کے ھوائی میدان سے سفارت خانے پہنچے ۔ تفصیل تو لکھ چکا ھوں ۔ قند مکرر کے طور پر ان واقعات کی یاد تازہ کی جارھی ھے ۔ اس وقت رمضان کا مہینہ تھا اور دن تھا ھفتہ کا ۔ اسلئے تعطیل تھی ۔ ھمارے میزبانوں کو ھماری آمد کی کوئی اطلاع نہ تھی اور نہ وزارت تعلیم ھی نے سفارت خانے

کو کوئی اطلاع دی تھی۔ ھم دونوں کے پاس تیس تیس ڈالر تھے۔ اب کیا کریں اور کہاں ٹھیریں ۔ اس وقت جناب سجاد حیدر صاحب نے سارے انتظامات کردئے تھے ۔ ان کا یہ احسان اب تک یاد ھے اور ھمیشه یاد رھیگا ۔ آج ان کے ھاں آیا تو ان کے خلوص کی پچھلی یادیں تازہ ھوگئیں ۔ محترمه بیگم صاحبه اور ان کی بچی رانی بھی تھیں۔ ھم نے بڑی دلچسپ باتیں کیں اور بڑا مزیدار کھانا کھایا ۔

پاکستان کی سیاست بہر حال زیر غور آیا ھی کرتی ھے ۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ اپنی رائے ظاھر کی ۔ خلاصه یه ھے :

(۱) جنرل ضیاء الحق صاحب مخلص ھیں اور وہ طاقت میں رہ کر حالات کو واقعی درست کرنا چاھتے ھیں ۔

(۲) جنرل صاحب ایک قومی حکومت کی تشکیل بہر حال چاھتے ھیں اور میرا اندازہ یه ھے کہ وہ ۵ مئی ۱۹۷۸ء تک ایک قومی حکومت کی تشکیل کا کام مکمل کرلینگے ۔

(۳) قومی حکومت میں ، میری رائے ھے که بیگم نسیم ولی خان شرکت کرینگی ۔ (میں نے ان کو صحت کا محکمه دیدیا ھے) نواب زادہ نصراللہ خان کی پارٹی ، کیا پدی ، کیا پدی کا شوربه ۔ مفتی محمود صاحب کو ، مجھے یقین ھے که مولانا کوثر نیازی صاحب رام کرلیں گے اور ان کی یه شرط نرم ھوجائیگی که حکومت میں پیپلز پارٹی کے ساتھ وہ

کام نہیں کرینگے - جماعت اور نورانی میاں موقع
کی تلاش میں هیں - گو پروفیسر غفور صاحب کی
راہ میں فاروقی صاحب آئیں گے - خاکساروں
کی پروا جنرل صاحب نہیں کرینگے اور هوسکتا
هے کہ قومی حکومت میں جو پارٹی بھی شرکت
سے گریز کرے، اسے نظر انداز کردیا جائے -

(۴) میری حتمی رائے یہ هے کہ آج انتخابات کے لئے
حالات هرگز سازگار نہیں هیں اور ان حالات میں
انتخابات کرانا غلط هوگا - اس لئے مجھے جنرل
صاحب سے اتفاق رائے هے - مگر میں قومی
حکومت کے حق میں نہیں هوں - میری رائے میں
جنرل ضیاء الحق کو اسلامی شوریٰ قائم کرنی
چاهئے -

(۵) میری رائے میں فوج میں اندرونی خلفشار سے بچنے
کے لئے ایک قومی حکومت کی تشکیل میں بڑی
عجلت سے کام لیا جائے گا ورنہ تبدیلیٔ قیادت
عسکری کے خطرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

چار بجے انجمن مصنفین روس کی جانب سے موٹر آگئی -
مترجم مارگریٹا بھی آگئیں - میں ان کے ساتھ ماسکو میں روسی
تعمیر و ترقی کی مستقل نمائش دیکھنے گیا - حکومت روس نے
انقلاب اکتوبر کے بعد جس جس میدان میں کام کیا هے اور تعمیری
جد و جہد کی هے، یہ نمائش اس کی مظہر هے - یہ اس درجہ بڑی
نمائش گاہ مستقل هے کہ اس کو مکمل طور پر دیکھنے کے لئے مہینہ

بھر درکار ہوگا۔ میں نے سرسری طور پر ایک ہال خلاء سے متعلق دیکھا۔ اس میں صرف نظر ڈالنے میں دو گھنٹے لگے۔ افسوس ہے کہ طب و صحت کا ہال زیر ترتیب تھا۔ اس نمائش گاہ میں درجنوں عظیم ہال ہیں، زراعت، صنعت، آب رسانی، خلاء نوردی، الیکٹرونکس، روسی پرندوں کی نمائش، سرکس، تھیئٹر، تیرنے کے تالاب۔ غرض ہر وہ کام کہ جو پندرہ ریاستوں میں ہو رہا ہے، اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ میں نے اس نمائش کو بڑی حیرت کے ساتھ دیکھا اور داد دی کہ اقوام و ملل، کہ جو اپنی تعمیر و ترقی کو مقصد بناتی ہیں، ان کے جشن ایسے ہی ہوتے ہیں۔

آج دو گھنٹے ماسکو کے بازاروں میں موٹر میں گھوما۔ سڑکوں کے نام اپنے قومی رہنماؤں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ بڑے بڑے میدان کسی نہ کسی شخصیت کے نام معنون ہیں، خواہ وہ سیاسی ہو یا ادبی۔ شعراء کے نام پر بہت سے اسکوئر ہیں۔ میٹرو (ٹیوب) اسٹیشن بھی اکثریت کے ساتھ ادباء اور شعراء کے ناموں پر ہیں۔

میں نے آج پیکنگ ہوٹل کے ریستوراں میں دعوت دی۔ محترمہ مریم سلگانگ، جناب سبھاش صاحب (متعلقہ ماسکو ریڈیو) اور مارگریٹا مدعو تھیں۔ انجمن مصنفین نے تیس روبل میری خوراک خرچ کے لئے مارگریٹا کو دئے تھے۔ دس دن میں بس پانچ روبل ہی خرچ ہوئے۔ ریٹا نے ۲۵ روبل میرے حوالے کر کے ۳۰ روبل کی رسید پر میرے دستخط کرائے۔ میں نے واپس کرنے چاہے مگر فیض صاحب کا بھی مشورہ یہی تھا کہ واپس کرنے

مناسب نہیں - بارے یہ روبل اور مزید میرے ڈالر زیادہ سامان کا کرایہ دینے میں کام آ گئے - غالباً ذرا سے زیادہ سامان کے ستر ڈالر لینا کوئی اچھی بات نہیں تھی - یہ رقم نہ ہوتی تو شاید فاضل سامان وہیں رہ جاتا اور پھر سفیر پاکستان کی وساطت سے اس کی وصولی ممکن ہوتی - غنیمت ہے کہ یہ ناگوار صورت پیدا نہیں ہوئی اور میں سامان ساتھ لے کر کراچی پہنچ گیا -

---

اشاریہ

آ

ا

پ

ٹ

ج

چ

ح

خ

د

ڈ

ذ

ر

ز

ژ

س

ش

ص

ض

ط

غ

گ

ل

م

ن

و

همدرد اکیڈمی، پاکستان